# نقدِ ملفوظات

تصوّف اسلامی اور ہندستانی صوفیائے کرام کے
حالات و ملفوظات پر چند تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ

پروفیسر نثار احمد فاروقی

صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۷

۱۹۸۹ء

# نقدِ ملفوظات

# نقدِ ملفوظات

تصوف اسلامی اور برِ صغیر کے صوفیاے کرام کے
حالات و ملفوظات پر تنقیدی و تحقیقی مضامین

پروفیسر نثار احمد فاروقی

شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل : ۱۹۸۹ء

تعداد : چھ سو

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی، اس کے لیے کمیٹی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ملنے کے پتے :

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- انجمن ترقی اردو (ھند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- اورینٹل سوسائٹی، پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳ نئی دہلی 110025
- دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ ۱۸
- قیمت : -/۶۵ روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

# فہرس


- حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی تاریخ کی روشنی میں
- حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ
- فوائد السالکین — ایک تنقیدی جائزہ
- حضرت نظام الدین اولیاءؒ — سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ملفوظات میں
- احسن الاقوال — حضرت باباصاحبؒ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالات کا ایک اہم ماخذ
- دُرَرِ نظامی — حضرت بابافریدؒ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے حالات کا ایک ماخذ
- حضرت امیر خسروؒ
- حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ
- مطالعہ تصوف کے ہندستانی فارسی مآخذ — قبل از عہد مغول
- تصوف اسلامی اور جدید ذہن
- تصوف اسلامی — نظریہ اور تطبیق
- حضرت گیسو درازؒ کا نظریۂ توحید
- ہماری ثقافت اور صوفیہ

# انتساب

اپنے نہایت شفیق استاد، سرپرست اور مربّی

عمِّ محترم حضرت مولانا مفتی **نسیم احمد فریدی فاروقی**

قدّس اللہ سرّہٗ العزیز کے نام

جن کے بے پایاں احسانات کا شمار بھی نہیں ہو سکتا

●

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر

# حرفِ ابتداء

اس برِّصغیر میں تصوّف کی روایت عملی اور نظری دونوں پہلوؤں سے بہت شاندار اور جاندار رہی ہے صوفیہ کے اثرات اس سرزمین کے چپّے چپّے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بزرگ آج بھی دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ہمیں زندگی میں عقیدے اور عقیدت دونوں کی ضرورت ہے لیکن ان کو اگر عقل سلیم اور عمل صالح کا سہارا نہ ملے تو یہ حجاب بھی بن جاتے ہیں۔ صوفیہ کے ساتھ ہماری عقیدت نے یہی کیا ہے کہ خانقاہوں کو درگاہوں میں تبدیل کر دیا، نگاہیں صرف آمدنی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں اور ان بزرگوں کے سوانح حیات، ملفوظات، اصلاحی و تبلیغی خدمات کی طرف مطلق التفات نہ رہا بعض درگاہوں میں نذر و نیاز کے نام پر لاکھوں روپیہ کا چڑھاوا آتا ہے، لنگر پر بے دریغ خرچ ہوتا ہے، رسومِ ظاہری کے ادا کرنے کا سخت اہتمام و التزام کیا جاتا ہے، مگر ان عقیدت مندوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ان بزرگوں کی وہ کتابیں جن کے بین السطور میں ان کی نورانی شخصیت جھلک رہی ہے اور جن لفظوں کے پردے میں ان کی اپنی آواز سنی جا سکتی ہے ان کے محفوظ کرنے، مطالعہ کرنے اور انھیں عام کرنے کا بھی کچھ اہتمام کریں، تو یہ ان سے عقیدت کا سچا اظہار ہوگا۔ اکثر بزرگوں کے حالات و ملفوظات کے نہایت قیمتی مجموعے ضائع اور ناپید ہو گئے، کچھ کتب خانوں کی الماریوں میں بند پڑے ہیں جن سے کوئی اہلِ علم کبھی کبھار استفادہ کر لیتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ حالات و سیرتِ صوفیہ میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت فوق العادۃ واقعات اور کشف و کرامات کو

دی جاتی ہے حالانکہ ان بزرگوں کی مبارک زندگی کو اگر تاریخ کی روشنی میں اور عقل سلیم کی رہنمائی میں پڑھا جائے تو ان کی سیرت و کردار کے نقوش روشن تر نظر آئیں گے ۔

پچھلے ۱۵۔ ۲۰ برس سے میری حقیر کوشش یہی رہی ہے کہ اسلامی تصوف کو تمام تعصبات سے بلند ہو کر پڑھا جائے اور اولیاء اللہ کی سیرت و سوانح و ملفوظات کا معروضی مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ان کی شخصیت اور زیادہ اجلی ہو کر ہماری نگاہوں کے سامنے آسکے۔

زیر نظر مجموعے میں ایسے ہی چند مضامین پیش کیے گئے ہیں، اسی سلسلے کی دوسری جلد جس میں بعض دوسرے اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان شاء اللہ اس کے بعد آئے گی۔

اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے روشن فکر ڈائرکٹر سراج منیر صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

نثار احمد فاروقی

شعبۂ عربی
دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۸۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء

# پیش لفظ

تصوّف چمن اسلامی میں شجرِ حیات ہے۔ اسی لیے اسلامی تمدن کے جو مظاہر بھی تاریخ کے خاکے میں ظاہر ہوتے ہیں ان کا رشتہ کسی نہ کسی طور تصوّف سے استوار ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تاریخ کے ہر مرحلے پر ایک ایسی معرفت نظر آتی ہے جو اربابِ حال پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر اس کے انعکاس سے مظاہر تہذیب کی ہیئت اور ان کی معنویت میں ایک نیا زاویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخ کی عمومی جہت ہے جہاں معارف تہذیب تسلسل میں ظاہر نہیں ہوتے۔ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" اسی لیے تہذیب کے وہ سارے مطالعے جو معرفت کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے کیے جاتے ہیں وہ تہذیب کی کلیت کو سمجھنے میں عموماً ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا کی ہر روایتی تہذیب میں عموماً اور اپنی تہذیبی جامعیت کے اعتبار سے اسلام میں بالخصوص تصوّف کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ اسلام کے مطالعے میں اس مرکزی مقام کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

اسلام نے اپنی دنیائیں مختلف انداز میں تعمیر کی ہیں کہیں تبلیغ کے ذریعے کہیں اہل تجارت کے روابط سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعے اور کہیں عسکری فتوحات کے اعتبار سے ـــــ برصغیر ہند و پاک میں اسلام نے اپنی جو دنیا تخلیق کی اس میں کم و بیش یہ سارے عوامل استعمال ہوئے، اسی لیے اس تہذیبی منطقہ میں ایک ایسی جامعیت پیدا ہوئی ہے جس میں ہر اسلوب اور ہر انداز الگ الگ پہچانا جاتا ہے۔ یہ مختلف لکیروں کا وہ معمورہ ہے جس سے ہند اسلامی تہذیب کی تصویر وجود میں آئی ہے۔ اسی لیے اس تہذیبی منطقہ کا

مطالعہ ان مرکزی حوالوں سے کیا جاسکتا ہے جن کی جڑیں تصوف اسلامی کی سرزمین میں پیوست ہیں۔

آج کی دُنیا میں روایتی تمدن کے سانچے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں جس سے ایک دوہری مشکل پیدا ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو روایتی تمدن کی وضعوں کو سمجھنا مشکل ہوتا جارہا ہے دوسری طرف وہ اسرار جو ان تمدنی اوضاع کے پیچھے حجاب اندر حجاب پوشیدہ تھے ان کے ظاہر ہونے کی ضرورت شدید تر ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں تصوف پر تحریری مواد کثرت سے دستیاب ہونے لگا ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو کونیاتی اسباب سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تہذیب اور اسلامی تصوف کا آغاز ایک وقت میں ہی ہوتا ہے اور ظاہر و باطن کی ان دونوں دُنیاؤں کی تخلیق میں سلسلہ چشتیہ کا بنیادی حصہ ہے۔ سلسلہ چشتیہ صرف سیر و سلوک کا ایک طریقہ اور ایک روحانی نسبت ہی نہیں بلکہ انسانی شعور کی ایک خاص کیفیت، ایک تمدنی مزاج اور ایک تخلیقی طرز احساس کا نام ہے۔ اسی لیے وہ دنیائیں جو اس سلسلے کی خانقاہوں کے گرد تعمیر ہوئیں ان میں ایک خاص انداز کی جامعیت اور ان کے تخلیقی مزاج میں ایک نایاب گداز پایا جاتا ہے۔ وہ کیفیت قلب جس سے یہ دُنیا وجود میں آئی ہے پوری اسلامی تہذیب میں یکتا اور منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطالعہ پوری اسلامی تہذیب کو سمجھنے اور اس کی کیفیت قلب کو جاننے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ چشتی صوفیہ کے نزدیک تصوف بنیادی طور پر ایک حال ہے اسی لیے اس پر کتابیں کم لکھی گئی ہیں اور اس کے تہذیبی Contribution کے تناسب سے تحریری مواد بہت کم دستیاب ہے۔ جو چند بنیادی مصادر دستیاب بھی ہیں وہ بھی ایک خاص انداز کے مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں اس لیے کہ معروضی شعبہ ہائے علم کے برخلاف ان کی اصطلاحات کی دنیا ایسی واقع ہوئی ہے جسے کسی Outsider کے لیے کلی طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا سے معقول تعارف کے بغیر اس پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے ہمیشہ غلطی کی ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ہمارے ان محققین میں شامل ہیں جنھیں برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تہذیب کے تاریخی، تمدنی، تخلیقی اور عرفانی پہلوؤں پر قابل رشک دسترس حاصل ہے۔ یوں تو ان کا کام تاریخ اور ادب کے میدانوں تک پھیلتا ہے لیکن ان کی کتابوں کی زیادہ تر تعداد اور ان کے علم کا غایت ارتکاز برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے اپنے تمام موضوعات پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد ان کی نگاہ میں ہے اور یہ بات ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ ہماری علمی دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے اپنے موضوع کے لیے اتنے نئے مصادر دریافت کیے ہوں۔ اس اعتبار سے ان کا کام ہمارے لیے ان تہذیبی دنیاؤں کے در وا کرتا ہے جو تحریری مواد کی کمی کی وجہ سے اب تک ہماری نگاہوں پر مقفل تھیں۔

تحقیق کے بارے میں عام طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ یہ ایک خشک اسلوب بیان کی متقاضی ہے۔ اردو، بلکہ دوسری زبانوں میں بھی تحقیقی کتابوں اور مضامین کے مطالعے سے اس رائے کی تصویب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تربیت میں چونکہ ادب اور تاریخ کے شعبے شامل ہیں اور وہ تخلیقی نثر لکھنے پر قادر ہیں اس اعتبار سے ان کے تحقیقی مضامین میں بھی وہی چاشنی ملتی ہے اور وہی لطف بیان نظر آتا ہے جس کا تقاضا اعلیٰ ترین تخلیقی اوصاف کی حامل تحریروں سے کیا جاسکتا ہے۔ دیگر شعبہ ہائے علم میں تو اس صلاحیت کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے لیکن جب معاملہ اس تاریخ و تمدن کا جو تصوف کی دنیا سے قریبی طور پر وابستہ ہے تو پھر اس کے لیے ایک ایسے اسلوب کی ضرورت پڑتی ہے جو اس پوری فضا اور اس کی کیفیت کو قاری تک بتمام و کمال پہنچا دے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تحریر میں یہ وصف خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

نقد ملفوظات ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو گذشتہ کئی برسوں میں مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو جلسوں اور سیمیناروں میں پڑھے گئے اور وہ بھی جو تحقیقی جرائد کے لیے لکھے گئے۔ ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جن کا تعلق تصوف کے نظری پہلوؤں اور ذہن جدید سے ان کے تعلق سے ہے، ان مضامین کو دیکھ کر

احساس ہوتا ہے کہ رموز تصوف پر ان کی نگاہ کتنی گہری ہے اور آج کے انسان کی کیفیت قلب کے لیے اس کی اہمیت کو وہ کتنی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین تحقیقی، تاریخی اور فکری اعتبار ایک خاصے کی چیز ہے کہ جس کا مطالعہ ہمیں ایک ایسی دنیا سے متعارف کراتا ہے جو اب ہماری روح سے بہت فاصلے پر ہے لیکن اس کے وجود کی ضرورت ہمارے لیے پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہ اور اس جیسی دوسری تحریریں ہمارے تہذیبی باطن کا وہ تعارف ہیں جن کے بغیر ہم نہ ماضی کو سمجھ سکتے ہیں نہ ہی اپنے وجود کی اعلیٰ سطحوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

سراج منیر

۲۱ مارچ ۱۹۸۹ء
ادارہ ثقافت اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ
لاہور

# حضرت خواجہ معین الدّین سجزی اجمیریؒ

## (تاریخ کی روشنی میں)

ہندستان میں تصوّف کے دو خانوادوں نے سب سے پہلے نفوذ کیا۔ سُہروردی سلسلہ مغربی علاقوں میں خاصا مقبول ہو چکا تھا اور اُس کے مبلّغین شمالی ہندستان کی طرف بھی بڑھتے آرہے تھے، لیکن چشتیہ سلسلے کا فروغ حضرت خواجہ مُعین الدّین سجزی علیہ الرّحمۃ کے قُدوم میمنت لُزوم کے ساتھ ہوا، اور آپ نے مغربی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ہندستان کے قلب میں اپنے مشن کی تبلیغ کی اور اجمیر کو ہمیشہ کے لیے روحانیوں کا قبلہ وکعبہ بنادیا۔ سُہروردی سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سُہروردی سے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے بھی فیض حاصل کیا تھا اور اُن کی بلند پایہ تصنیف عوارف المعارف تو کہنا چاہیے اہلِ تصوّف کی رہنما کتاب تھی اور یہ اُن چند کتابوں میں سے ایک ہے جن میں ایک تو قرآن و سنّت کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تصوّف محض عجمی اور غیر اسلامی چیز نہیں ہے بلکہ یہ دین کی روح کا نام ہے، دوسرے اس کے تمام نظری مباحث پر پوری وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ علمائے ظاہر نے اہلِ تصوّف کے خلاف جو محاذ تیار کیا تھا اُسے عوارف اور کشف المحجوب جیسی کتابوں نے بیتِ عنکبوت سے زیادہ کمزور بنا دیا اور لے دے کر صرف ایک سماع کا مسئلہ ایسا رہ گیا تھا جس پر وہ "محضر" تیار کر سکتے تھے۔ سُہروردی بزرگوں نے تصوّف کے نظری مباحث پر خوب خوب لکھا اور یہ سلسلہ بعد میں کئی صدیوں تک جاری رہا۔ لیکن چشتیہ سلسلے کی مقبولیت کے دو بڑے اسباب تھے: ایک تو یہ کہ

چشتی بزرگوں نے حاکمانِ وقت سے اپنے روابط نہیں رکھے بلکہ عوام کے پس ماندہ طبقوں سے گہرا تعلق قائم کیا۔ سلاطینِ تغلق کے زمانے تک سہروردی سلسلے کے بزرگوں کو قصرِ سلطانی میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ وہ نہ صرف حاجت مندوں کی عرضیاں لے کر بادشاہ کو پیش کرتے تھے بلکہ حضرت رکن الدین ملتانی ؒ نے اپنا رسوخ استعمال کر کے محمد تغلق کے ہاتھوں مُلتان کو قتلِ عام سے بچا لیا تھا۔ مگر چشتیہ سلسلے کے بزرگ اس کے برعکس اِن پریشان حال درماندہ اور حاجت مندوں کے لیے دعا اور تعویذ ہی پر قناعت کرتے تھے۔ اس کی نوبت تقریباً نہیں آتی تھی کہ وہ کسی کے لیے بادشاہِ وقت سے سفارش بھی کریں۔ اس طرح ابتدا میں اِس خانوادے کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف سے احتراز کیا، چناں چہ اگر حضرت نظام الدین نے یہ فرمایا کہ:

"ہمارے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔"

تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوّف کے نظریاتی مباحث پر ایسی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جیسی مرصاد العباد، قوت القلوب، کشف المحجوب، التعرّف، عوارف المعارف یا آداب المریدین وغیرہ ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوّف کو سراسر "حال" سمجھا اور اس میں "قال" کو دخل نہیں دیا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تصوّف تمام تر عمل ہے، اُس کا فلسفے کی طرح شرح و بیان میں آنا مشکل ہے اور جو کچھ قیدِ الفاظ میں آئے گا وہ "تصوّف" نہیں ہوگا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا دوہا اسی مضمون کا ہے:

رَحِیمَن بات آگَم کی کَہَن سُنَن .کی نا ہین
جانَت ہیں سو کَہَت نہیں، کَہَت سو جانَت نا ہین

اور حضراتِ چشتیہ کے اس نظریے کو شیخ سعدی شیرازی نے اس طرح بیان کیا ہے:

اے مرغِ سحر عشق زِ پروانہ بیاموز — کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد
این مدّعیان در طلبش بے خبر انند — آن را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لیے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے تصوّف کی نظری صورت کو چھوڑ کر اُس کی عملی شکل پر اپنی توجّہ مرکوز رکھی اور اُنھیں اپنا پیغام عام کرنے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی

اُس کا راز بھی یہی تھا۔

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک دن ایک نوجوان اپنے ساتھ اپنے ایک ہندو دوست کو لے کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں آیا اور اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "این برادر من است"۔

حضرت نے اُس نوجوان سے پوچھا کہ "تمھارے اِس بھائی کو کچھ اسلام کی طرف بھی رغبت ہے یا نہیں؟"

اُس نے کہا کہ میں اسے مخدوم کی خدمت میں لے کر اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی نگاہ کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور فرمایا:

"این قوم را چندان بگفتہ کسے دل نگردد، امّا اگر صحبتِ صالح بیابد امّید باشد کہ ببرکتِ صحبتِ اُو مسلمان شود"۔

(اس قوم پر کسی کے کہنے سننے سے اثر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی صالح کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے تو امّید ہوتی ہے کہ اُس کی برکت سے مسلمان ہو جائے۔)

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۴ رمضان ۷۱۰ھ کی مجلس کے بیان میں ضمناً آ گیا ہے لیکن یہ چشتی صوفیہ کے مشن کو سمجھنے کے لیے بے حد اہم اور قابلِ غور نکتہ ہے۔ خود حضرت کا یہ سوال کرنا کہ "این برادر تو ہیچ میل بہ مسلمانی دارد؟" دعوتِ حق سے گہرے قلبی تعلّق کو ظاہر کرتا ہے اور جب اُس لڑکے نے دعا کی درخواست کی تو آپ کا "چشم پُر آب" ہو جانا قرآن کے اس فرمان کی نہایت گہری اور اصلی عملی ترجمانی ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (پارہ ۳، آیۃ ۱۰۴)

اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کی روح کو اِن بزرگوں نے کیسا سمجھا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ"۔ دین خیر خواہی کا نام ہے، اور یہی وہ سچّی خیر خواہی ہے جو حضرت نظام الدینؒ کو اِس موقع پر چشم پُر آب کر دیتی ہے۔ آپ نے تبلیغِ دین کا اصول بھی بتا دیا کہ جس "خیر" کی طرف تم کسی کو بُلا رہے ہو، اُس کا نمونہ

خود بن کر دکھاؤ۔ تب دعوت اِلی الخیر کا حق ادا ہوگا۔ قرونِ وسطیٰ میں علمائے سُو کا کردار کچھ بھی رہا ہو لیکن جو صاحبِ کردار علمائے شرع تھے، انھوں نے بھی خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندستان میں دعوتِ دین کے لیے "تصوّف" کی ضرورت ہے، بحث و مناظرے کی نہیں۔

حضرت خواجہ غریب نواز کے ہم عصر مولانا رضی الدین صغانی صاحبِ مشارق الانوار بہت ممتاز محدّث اور عالم تھے۔ اُن کے ہم عصر علما میں کوئی بھی علمِ حدیث اور فقہ میں اُن کا ہم پایہ نہ تھا۔ وہ ان معدودے چند علما میں سے تھے جنھوں نے اُس زمانے میں بغداد اور حجاز پہنچ کر حدیث کی سماعت کی تھی۔ حضرتِ نظام الدین اولیاؒ نے فوائد الفواد میں اُن کی تعریف میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ اُن کی تالیف مشارق الانوار آج بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور حدیث کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ علّامہ صغانی کی ایک اور تالیف مِصباح الدُّجیٰ بھی تھی۔ چناں چہ جب مولانا ناگور پہنچے ہیں تو اُنھوں نے ایک محفل میں، اور ایک ہی نشست میں پوری مِصباح الدجیٰ کی قراءت کی تھی اور سماعت کرنے والوں کا بڑا بھاری مجمع تھا جس میں قاضی حمید الدین ناگوری اور قاضی کمال الدین جیسے فضلا بھی استفادے کے لیے موجود تھے۔ مولانا صغانی خوب بڑی سی پگڑی باندھتے تھے جس کی چھور آگے کی طرف لٹکی ہوتی تھی، بہت لمبی چوڑی آستینوں کا کُرتا ہوتا تھا۔ یہ اُس زمانے کے علما کی ہیئت تھی۔ یہیں ناگور کے ایک صاحب نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ میں آپ سے کچھ "علمِ تصوّف" سیکھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے کہا کہ یہاں تو مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، لوگ حدیث کی سماعت کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اتنا وقت نہیں بچتا کہ تمھیں علمِ تصوّف سکھاؤں، البتّہ اگر تمھیں ایسی ہی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو، جب ہم غیر مسلموں کے علاقے میں پہنچیں گے جہاں علمِ حدیث اور فقہ کے طلب گاروں کا اتنا ہجوم نہیں ہوگا تو میں تمھیں اطمینان سے علمِ تصوّف سکھاؤں گا۔ چناں چہ مولانا اور یہ تصوّف کے طالب علم نکلے اور ناگور سے جالور کی طرف راہی ہوئے۔ گجرات کی سرحد کے شروع ہوتے ہی مولانا نے اپنا لمبی آستینوں والا کرتا اور بڑی پگڑی لپیٹ کر ایک بقچے میں رکھی اور کوتاہ آستینوں کا درویشوں والا لباس زیب تن کیا، سر پر کلاہ

پاؤں میں جوتے کی جگہ کھڑاویں آگئیں، ایک مٹّی کا آب خورہ پانی پینے کے لیے لے لیا اور نماز و نوافل پڑھتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کرنے لگے۔ جب اس طرح کئی دن گذر گئے تو اُس طالبِ علمِ تصوّف نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے کچھ علمِ تصوّف سکھائیں گے اور اس امید پر میں گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ لگ گیا ہوں مگر آج اتنے دن ہو گئے، آپ نے ایک بات بھی نہیں سکھائی۔ مولانا فرمانے لگے کہ میاں علمِ تصوّف "قال" نہیں ہے "حال" ہے۔ جیسے میں عبادت کر رہا ہوں اور عام لوگوں سے برتاؤ کر رہا ہوں بس ویسے ہی تم بھی کیے جاؤ یہی علمِ تصوّف کہلاتا ہے۔[۱]

مولانا صغانی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالِم اور محدّث ہوئے ہیں۔ اُس دور کے جیّد علماء اُن کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے لیکن وہ بھی یہ نکتہ اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ یہ معقولی اور منقولی بحثیں، یہ مناظرے اور مکابرے، یہ فلسفہ اور منطق، یہ مسئلے اور تاویلیں، صرف اسلام کے ظاہر کو پیش کر سکتی ہیں، اُس کی روح کو اور بھی خفی اور بے اثر بنا دیتی ہیں۔ اسلام کی اصل تعلیم وہی ہے جسے صوفیا اپنے عمل سے پیش کر رہے ہیں اور اسی نے ہندستان میں اسلام کو فروغ دیا اور دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ چناں چہ مولانا صغانی بھی جب غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں جاتے ہیں تو صوفیا کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اور اپنا چوغا تہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اِس مقدمے میں دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ سہروردی سلسلے کے بزرگوں نے تصوّف کی نظری سطح پر تشریح و تفسیر کی اور اُس کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر کتابیں تصنیف کیں جن سے دوسرے سلسلے والوں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر اپنے خانقاہی نظامِ عمل میں اُنھوں نے دین اور دنیا کے جام و سندان کو ایک توازن کے ساتھ یک جا رکھنا چاہا اور حاکمانِ وقت پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی، اس لیے ان کی خانقاہیں زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہو کر رہ گئیں جب کہ چشتیوں کی خانقاہیں چھوٹے چھوٹے

---

[۱] سرور الصدور و نور البدور (قلمی) نسخہ حبیب گنج علی گڑھ۔

دیہات و قصبات تک میں پہنچ گئیں اور عوام کے دلوں میں اُن کے لیے گھر بن گئے۔ اس دین و دنیا کی آمیزش سے پیدا ہونے والے تضاد کو ابتدا ہی میں محسوس کر کے چشتی صوفیا نے "ترک" کے فلسفے پر زور دیا اور اپنے مریدوں کو اس کی تربیت دینے کے لیے "چہار ترکی" کُلاہ پہنانی شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ :

"مرد عالی ہمّت نشود تا ترکِ دنیا نگیرد"۔

اور اس "ترک" کا پھل یہ تھا کہ جب دہلی کے "شیخ الاسلام" کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کی مقبولیت اور ہر دلِ عزیزی سے حسد ہونے لگا اور اُس کی شکایت پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے یہ فرمایا کہ :

"قطب الدین تم میرے ساتھ اجمیر چلو میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی جانشین کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہنچے"۔

اور حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دہلی کو خیرباد کہہ کر جانے لگے تو آپ کو رخصت کرنے کے لیے ہزارہا مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے گریہ و زاری کرتے ہوئے آپ کے پیچھے پیچھے شہر پناہ سے باہر تک نکل آئے۔ اس ہجوم میں بوڑھا بادشاہ التمش بھی موجود تھا۔ سب کی یہ حالت دیکھ کر حضرت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔

یہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے اور کتب تواریخ میں چشتی حضرات کے عوام سے براہِ راست رابطے کی سب سے قدیم اور بدیہی مثال یہی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بزرگ خانقاہوں میں بیٹھ کر محض انفرادی نجات کے حصول کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ اُنھوں نے اپنے عہد کے سماجی مسائل سے خود کو بہت گہرائی تک وابستہ کر لیا تھا۔ اُنھوں نے ملوک و سلاطین اور سرکار دربار کو کبھی مُنہ نہیں لگایا، نہ کبھی دنیا کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ آئی تو اُسے جمع کر کے نہیں رکھا۔ اس طرح اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ دراصل فقر بھی ایک عظیم دولت ہے۔

وہ غریبوں، مسکینوں، درماندہ حال اور پس ماندہ طبقے کے انسانوں کی نمایندگی

کرتے تھے، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچّی متابعت کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی:

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ احْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔

غریبوں اور مسکینوں سے سچّی محبّت کی مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی اور موت اور حشر و نشر بھی ان کے ساتھ طلب کیا جائے۔ چشتی بزرگوں کی خانقاہوں میں ہمیشہ مفلسوں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ جب ۱۲-۱۳ برس کے ہی تھے اور بدایوں میں علمِ لُغت پڑھ رہے تھے اُس وقت ایک قوّال نے جس کا نام ابوبکر خرّاط تھا، اُن کے استاد کے سامنے بہت سی اُن خانقاہوں اور درویشوں کا تذکرہ کیا جہاں وہ حاضری دے چکا تھا۔ اُس نے حضرت بہاء الدین زکریا مُلتانی علیہ الرحمۃ کی خانقاہ کا تذکرہ کیا تو اُس کے ساتھ اُن کی دولت مندی اور خدم و حشم کا ذِکر ہونا لازمی تھا۔ حضرت نظام الدین نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا مگر حضرت بابا فرید کے فقرِ محض کا حال سُن کر اُنھیں خاص کیفیت کا احساس ہُوا اور انھوں نے اُسی وقت یہ طے کر لیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شیخ کی خانقاہ میں حاضری ضرور دیں گے۔ ان کی یہ طبعی کشش بھی دراصل چشتی فقر کی طرف تھی جس کی ترویج کے لیے آگے چل کر آپ کو اپنی زندگی وقف کرنا تھی۔ بقول خود اُن کے پیر و مرشد حضرت بابا فرید کا یہ حال تھا کہ "دونوں عالم نظر میں ہیچ تھے"۔

ایک بار عصا لے کر چل رہے تھے اُس پر تکیہ کرنے کا خیال آیا تو فوراً ہاتھ سے پھینک دیا اور اُن کے یہ مرید بھی ایسے تھے کہ جب اُنھوں نے کسی سے سُنا کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے بیٹے شیخ رکن الدین کو کوئی خاص وظیفہ تعلیم کیا تھا تو آپ کو بہت دنوں تک یہ فکر رہی کہ کسی طرح وہ وظیفہ معلوم ہو جائے۔ بارے جب شیخ رکن الدین مُلتانیؒ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے وہ وظیفہ حضرت نظام الدین کو بھی بتا دیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک جگہ لفظ "یا مُسَبِّبَ الْاَسْبَاب" بھی آتا ہے۔ بس یہ "اسباب" کا نام دیکھ کر طبیعت نے ابا کیا اور جس دُعا کے حصول کے لیے آپ برسوں منتظر رہے تھے، جب وہ مل گئی تو اسے کبھی ایک بار بھی نہیں پڑھا۔

چشتی سلسلے کے ممتاز بزرگوں میں حضرت بابا فریدؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کچھ حالات اور واقعات ہمیں مل جاتے ہیں جن سے چشتی خانقاہوں کے نظام اور بزرگوں کی تعلیمات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں تاریخ اور تذکرے ہمیں بہت ہی کم معلومات فراہم کرتے ہیں اور بعد کے زمانے میں کچھ روایات کے اضافوں نے اِس تھوڑے سے تاریخی مواد کو بھی مُبہم بنادیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خواجہ صاحب کے حالات میں قدیم ترین کتاب سیَرالاولیا ہے جو حضرت خواجہ اجمیریؒ کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد مرتّب ہوئی ہے۔ اس میں جو معلومات درج ہیں اُن پر کچھ اضافہ شیخ جمالی دہلوی مولّف سیرالعارفین نے کیا ہے جو سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے اور عہدِ ہمایوں بادشاہ میں سیر و سیاحت کرنے بھی نکلے تھے۔ وہ خواجہ بزرگ کے وطنِ اصلی سیستان بھی پہنچے تھے اور اُنھوں نے حضرت خواجہ اور آپ کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ مواد وہاں کی مقامی روایتوں سے بھی فراہم کیا ہوگا لیکن بہ حیثیتِ مورّخ پروفیسر محمد حبیب کا یہ خیال صحیح ہے کہ خواجۂ بزرگ اور شیخ جمالی دہلوی کے عہد میں تقریباً تین صدیاں حائل ہیں اور یہ بات بہت ہی مستبعد اور مشتبہ ہے کہ شیخ جمالی کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی سیستان میں کچھ ایسے معتبر رُواۃ مل سکے ہوں جو خواجۂ بزرگؒ کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کر سکتے ہوں۔

خواجۂ بزرگ کے جو حالات اب ہمیں معلوم ہیں اور متداول تذکروں میں ملتے ہیں اُن میں شیخ جمالی کے سفرِ سیستان وغیرہ کی "رہ آورد" کیا ہے؟ اور اس کا استناد کس درجے کا ہے؟ یہ ایک علاحدہ تحقیق کا موضوع ہے لیکن مجھے سرِ دست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب کی اس رائے میں اختلاف کی گنجایش موجود ہے۔

جہاں تک خواجہ صاحب کے بارے میں تاریخی شہادتوں کا سوال ہے، عہدِ وسطیٰ کے بعض مورّخوں کی رائے میں آپ کا تذکرہ سب سے پہلے طبقاتِ ناصری میں پایا جاتا ہے جو ۶۵۸ھ (۱۲۲۰ء) کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنّف قاضی منہاج سراج ?

۵۸۷ ۱۱۹۳
۵۸۸ ۱۱۹۴
۶۲۱ ۱۲۲۴

جوزجانی ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں پیدا ہوئے تھے اور اجمیر، سوالک، ہانسی، سرسی وغیرہ علاقے رائے پتھورا کی شکست کے بعد ۵۸۸ھ (۱۱۹۴ء) میں فتح ہوئے تھے۔ اِس سے اگلے سال ۵۸۹ھ میں قطب الدین ایبک نے پہلے میرٹھ پھر دہلی کو فتح کیا تھا۔ ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں وہ ایک سفارت لے کر قہستان گئے تھے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد ۶۲۴ھ میں مدرسہ فیروزی اوچھ کے نگراں مُدرّس بنا دیے گئے تھے۔ وہ ۶۲۵ھ میں التتمش کے لشکر کے ساتھ دہلی آ گئے تھے۔ اس لیے اگر خواجۂ بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی تو اُس کا زمانہ ۶۲۵ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان آٹھ سال کا عرصہ ہو سکتا ہے جب وہ لشکرِ شاہی میں شامل ہو کر ہندستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہے تھے۔ مگر اُنھوں نے خواجۂ بزرگ سے اپنی ملاقات کا حال واضح اور راست انداز میں کہیں نہیں لکھا ہے۔ جہاں رائے پتھورا کی شکست کا ذکر ہے، اُس موقعے پر کہتے ہیں:

"ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارفِ جبالِ بلادِ تولک بود، لقبِ اُو معین الدین. او می گفت کہ من دران لشکر با سلطانِ غازی بودم، عدد سوار لشکر اسلام دران وقت صد و بست ہزار برگستواں بود." [۱]

طبقاتِ ناصری کے اس حوالے کا بھی گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ ماننے میں بہت تامّل ہے کہ یہ بیان حضرت خواجۂ بزرگ کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اکثر فاتحین نے اپنے لشکر کے ساتھ چشتی بزرگوں کو برائے حصولِ برکت شریکِ سفر رکھا ہے اور یہ بزرگ زمین یا خزانوں کے لالچ میں نہیں بلکہ تبلیغِ دین اور حمایتِ شرعِ مبین کے جذبے کے ساتھ اِس لشکرکشی میں شامل ہوتے تھے۔ خواجہ بزرگ بھی اُس وقت ہندستان میں تھے اور شہاب الدین غوری اپنی ہر مُہم میں کچھ درویشوں، بزرگوں اور عالموں کو ساتھ لے کر نکلتا تھا۔ چناں چہ علی گڑھ کی مُہم میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے نورالدین مبارک غزنوی اور اُن کے بھانجے حضرت نظام الدین ابوالموید

---

[۱] طبقاتِ ناصری، ص ۱۱۹۔

اُس کے ساتھ تھے اور فتح کے بعد اُس علاقے کی قضا ان کے خاندان کے حوالے کی گئی تھی۔ اجمیر کی مُہم میں خواجہ بزرگ کی روحانیت نے جو مدد کی اُس کا حوالہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات میں بھی آتا ہے لیکن یہاں منہاج سراج نے جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اُسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ خواجۂ بزرگ کی سی عظیم شخصیت کا ایسا سرسری حوالہ نہیں ہوسکتا کہ صرف "از ثقہ شنیدم" کہہ کر گذر جائیں۔

اگر طبقاتِ ناصری کے اس بیان کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو پھر آپ کا قدیم ترین حوالہ حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں ملتا ہے۔ فوائد الفواد میں حضرت خواجہ مُعین الدین حسن سجزی علیہ الرحمۃ کا نام مبارک صرف تین مقامات پر آیا ہے، وہ بھی براہِ راست نہیں ہے بلکہ ضمناً ہے۔

۱۵ محرم ۷۱۰ھ کی مجلس میں یہ تذکرہ تھا کہ سلامتیِ ایمان کی کیا علامت ہے؟ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حاضرین سے فرمایا کہ نگاہ داشتِ ایمان کے لیے نمازِ مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، پھر اُن کی ترکیب بیان فرماکر یہ واقعہ سُنایا کہ:

"میں نے شیخ معین الدین حسن سجزی قدّس اللہ سرّہ العزیز کے پوتے خواجہ احمد کی زبانی سُنا اور یہ خواجہ احمد بہت ہی صالح تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ میرا ایک ساتھی تھا سپاہی۔ وہ ہمیشہ یہ دو نفل حفظِ ایمان کے لیے پڑھا کرتا تھا حتّٰی کہ ایک بار ہم لوگ نا وقت حدودِ اجمیر میں تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ اُس علاقے میں رہزنوں کا بہت اندیشہ تھا اور ڈاکو دُور سے نظر بھی آنے لگے۔ ہم نے جلدی جلدی تین فرض اور دو سنّتیں پڑھیں اور شہر کی طرف آگئے۔ وہ ساتھی باوجود اِس کے کہ رہزن نمودار ہو گئے تھے، یہ نفل پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ پھر جب اُس دوست کے انتقال کا وقت آیا تو میں تفحّص احوال کے لیے اُس کی تُربت پر آیا تو دیکھا کہ جس شان سے اُسے دُنیا سے جانا چاہیے تھا اُسی طرح گیا ہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ خواجہ احمد تو اُس جوان کے انتقال

کا قصّہ سُناکر یہ کہتے تھے کہ اگر مجھے گواہی کے لیے کرسیِ قضا کے سامنے لے جائیں تو میں گواہی دوں گا کہ وہ با ایمان گیا ہے۔" [۱]

دوسرے موقع پر ۲۱ر ذی قعدہ ۷۱۸ھ کی مجلس میں شیخ حمیدالدین سوالی کے بیان میں یہ فرمایا کہ:

"مریدِ شیخ مُعین الدین بود ہم خرقہ شیخ قطب الدین"۔ [۲]

تیسرا حوالہ ۵ر رمضان ۷۲۰ھ کی مجلس میں اس طرح ہے کہ:

"حضرت شیخ معین الدین سجزی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے خواجہ وحیدالدین اَجودھن میں حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں آئے اور اُن سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ مجھے یہ نعمت آپ کے ہی خاندان سے ملی ہے۔ میرے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ کو بیعت کروں مگر اُنھوں نے بہت اصرار اور الحاح کیا کہ مجھے تو آپ سے ہی مرید ہونا ہے تو بابا صاحبؒ نے دستِ بیعت بڑھادیا۔" [۳]

اِن تین حوالوں کے سِوا خواجۂ بزرگ کا نام فوائدالفواد میں اور کہیں نہیں آیا اور ان میں بھی آپ کے دو پوتوں خواجہ احمد اور خواجہ وحیدالدین علیہما الرحمۃ کا تذکرہ ہے، خود خواجہ صاحبؒ کا نہیں۔ اگر منہاج سراج والے حوالے کو خواجۂ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو فوائدالفواد وہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں خواجۂ بزرگ کا اسمِ مبارک پہلی بار ۷۱۰ھ کی مجلس میں ملتا ہے۔ اور اگر فوائدالفواد کے ان حوالوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ حضرت خواجہؒ سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں بلکہ آپ کے پوتوں کے تذکرے میں ضمناً آپ کا نام مبارک آیا ہے تو پھر ہمارے معلوم اور موجود مآخذ میں سیرالاولیا ہی وہ قدیم ترین کتاب رہ جاتی ہے جس میں حضرت خواجۂ بزرگ کا تذکرہ ملتا ہے۔ سیرالاولیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجۂ بزرگ بیس سال تک سفر و حضر

---

[۱] فوائدالفواد: ص ۷۶، ۷۷۔ [۲] ایضاً: ص ۳۴۶۔ [۳] ایضاً: ص ۴۰۵۔

میں اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے ساتھ رہے تھے۔ اِس کتاب سے آپ کا بغداد اور حجاز کا سفر کرنا اور حجِ بیت اللہ سے مشرّف ہونا بھی دریافت ہوتا ہے، حالاں کہ حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ میں سے کسی نے حج نہیں کیا۔ مولّف سیر الاولیا نے حضرت خواجہ بزرگ کی چند کرامتیں بھی لکھی ہیں جن کا دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی اعادہ ہوا ہے لیکن امیر خورد نے سب سے اہم بات یہ لکھی ہے کہ :

”آپ کی کرامات اور علوے درجات کے ثبوت میں اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ خواجۂ بزرگ کے سلسلے سے وابستہ ہونے والے ایسے عظیم المرتبت انسان ہوئے ہیں اور اُنھوں نے بندگانِ خدا کی ایسی دستگیری کی ہے اور اُنھیں دنیا کے مکر و فریب سے بچایا ہے کہ قیام قیامت تک ان کی عظمت کا غلغلہ فلک و ملک کے کانوں میں گونجتا رہے گا اور اُن سے محبّت کرنے والی مخلوق کو اِس محبّت کے طفیل ’مقعد صِدق‘ میں جگہ ملتی رہے گی۔ پھر مولّف کہتا ہے کہ اس آفتابِ اہلِ یقین نے ہندستان کو نورِ اسلام سے ایسا منوّر کردیا ہے کہ آپ کی تعلیم و تبلیغ کی بدولت جو لوگ مسلمان ہوئے اُن کی اولاد میں جب تک سلسلہ ایمان و اسلام کا جاری رہے گا، اِس کا اجر و ثواب آپ کی بارگاہ با جاہ میں پہنچتا رہے گا۔“

سیر الاولیا نے آپ کے کچھ ملفوظات بھی درج کیے ہیں۔ خواجۂ بزرگ نے فرمایا کہ حق کو پہچاننے کی علامت خلق سے کنارہ کشی ہے، اور معرفت میں خاموش رہنا ہے۔ اور فرمایا کہ جب ہم نے عالم ظاہر سے نکل کر نگاہ کی تو عاشق و معشوق و عشق کو ایک ہی پایا یعنی عالمِ توحید میں وحدت ہی وحدت ہے۔

اور فرمایا کہ حاجی اپنے جسم (قالب) سے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں مگر جو عارف ہیں وہ اپنے دِل (قلب) سے عرش اور حجابِ عظمت کے گرد طواف کرتے ہیں اور ربّ کعبہ کی رؤیت کے طالب ہوتے ہیں۔

اور فرمایا کہ شقاوت کی نشانی یہ ہے کہ گناہ کرے اور پھر بھی مقبولیت کی اُمید رکھے۔

فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ فرشتوں کو فرمان دے گا کہ دوزخ کو دہانِ مار سے باہر نکالیں۔ پھر اُسے دہکایا جائے گا، پھر وہ ایک پھونک مارے گا تو سارا میدانِ حشر دھوئیں سے اَٹ جائے گا۔ اُس دن کے عذاب سے جو اپنے تئیں بچانا چاہے اُسے وہ عبادت کرنی چاہیے جس سے بہتر عبادت اللہ کے نزدیک اور کوئی نہ ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عبادت ہے بے کسوں کی فریاد سُننا، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔

اور فرمایا کہ جس میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لو کہ وہ بے شک اللہ کا دوست ہے: ایک دریا کی سی سخاوت، دوسرے آفتاب کی سی شفقت، تیسرے زمین کی سی تواضع۔

سیر الاولیا کی تالیف فیروز تغلق کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے آخر میں جو ایک تاریخ درج ہے جس سے فیروز شاہ تغلق کی تاریخِ وفات ۷۸۹ھ برآمد ہوتی ہے، اُس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ امیر خورد اُس وقت تک زندہ تھے اور اُنھوں نے کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد بھی ۲۵-۳۰ برس تک اِس پر نظرِ ثانی و اضافے کا کام جاری رکھا ہے۔ اس پر نگاہ کیجیے تو سیر الاولیا میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم عصر بیان نہیں ہے اور خواجۂ بزرگ کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد لکھا گیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق حضرت خواجہ مُعین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے حالات و ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ سُرور الصّدور و نُور البُدور ہے جو آج تک نہیں چھپی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دُنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت خواجہ بزرگؒ سے لاکھوں انسانوں کو فیض پہنچا اور آج بھی اسی طرح جاری ہے اور آپ کی حیاتِ ظاہری کے زمانے میں ہزارہا انسان بیعت ارادت کے شرف سے سعادت اندوز ہوئے مگر آپ کے خلفا میں صرف تین نام ہی ملتے ہیں: خلیفۂ اوّل حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ ہیں جن کا انتقال اپنے پیر و مُرشد کی

حیات ہی میں ہوگیا تھا، دوسری خلافت خواجۂ بزرگ اور قطب صاحب دونوں نے مل کر حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کو دی تھی لیکن بابا صاحب کو خلافتِ اولیٰ حضرت قطب صاحب سے پہنچی تھی، اس لیے آپ اُن کے ہی جانشین اور خلیفہ مانے جاتے ہیں۔ تیسری خلافت سلطان التارکین ابواحمد شیخ حمیدالدین بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمۃ کو ملی۔ یہ میدانِ ترک و تجرید کے ایسے یکّہ تاز تھے کہ خود خواجۂ بزرگ نے اِنھیں "سلطان التارکین" لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ نے طویل عمر پائی اور ۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ میں وصال ہوا۔ مزار مبارک ناگور میں مصدرِ فیوض و مرجعِ خلائق ہے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری فرمایا کرتے تھے کہ:

"اوّل مولودے کہ بعد از فتحِ دہلی در خانۂ مسلماناں آمد منم"۔

اور جیسا کہ ہم نے ابتدا میں ذکر کیا کہ دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں ہوئی اور یہی شیخ ناگوری کی ولادت کا سنہ ہے۔ اس حساب سے اُنھوں نے تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی۔ شیخ ناگوری عالم اور صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ اُن کی کتابیں حضرت نظام الدین اولیا کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں اور اُنھوں نے کتابوں کے بعض اقتباسات اپنے قلم مبارک سے نقل کر رکھے تھے جنھیں مؤلف سیرالاولیا نے بھی اخذ کیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اخبارالاخیار میں شیخ ناگوری کی تصانیف کے بعض اقتباسات درج کیے ہیں اور یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ شیخ ناگوری کے پاس دو طناب زمین تھی جس میں اپنے ہاتھ سے تخم ریزی کرتے تھے اور اُس کی پیداوار سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کے فرزند شیخ عزیزالدین تھے جن کے تین بیٹے ہوئے: شیخ وحیدالدین ۶۲۴ھ (۱۲۲۴ء) میں انتقال فرما گئے تھے، دوسرے شیخ نجیب الدین ابراہیم تھے، اُنھوں نے دہلی جاکر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں بھی کچھ وقت گذارا تھا اور اُن سے استفادہ کیا تھا۔ کہتے تھے:

"ایک دن میں شیخ نظام الدینؒ کی خدمت میں گیا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے مولوی صاحب بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے آئے اور شیخ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے: حضرت! آخر قاضی عالم کو یہ قبولیت کہاں سے نصیب ہوئی ہے۔ ہم یہاں سرائے میں پڑے رہتے ہیں، کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ جیسے ہی آتے ہیں، لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اعزاز و اکرام بھی کرتے ہیں۔ آج ہی ایسا ہوا کہ فوراً انھیں آگے آگے لے گئے، خوب نذریں ملیں اور اعزاز و اکرام الگ رہا۔

حضرت نظام الدینؒ خاموشی سے مولوی صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور کچھ نہیں فرمایا۔ پھر وہ مولوی صاحب خود ہی کہنے لگے: میں نے سُنا ہے کہ ناگور میں کوئی پیر تھے، ان کا نام شیخ حمید الدینؒ تھا، یہ قاضی عالم ان کے نظر یافتہ ہیں۔ جب مولوی صاحب نے یہ جملہ کہا تو حضرت نظام الدینؒ نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ صاحب اُنھیں کے پوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اٹھ کر میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔"

شیخ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ فرید الدین چاک پرّان بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے ایک بار صفر ۷۲۹ھ (دسمبر ۱۳۲۸ء) کی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں ۷۷ سال سے وعظ کہہ رہا ہوں اور پہلی بار سات سال کی عمر میں منبر پر قدم رکھا تھا۔ اس حساب سے ۷۲۹ھ میں آپ کی عمر ۸۴ برس کی ہوئی اور ولادت کا سنہ ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) تسلیم کیا جائے گا۔ اُن کے والد شیخ عزیز الدین کا انتقال ۶۶۶ھ اور ۶۷۷ھ کے درمیان کسی وقت ہوا۔

شیخ فرید الدین ناگوری دہلی آتے رہتے تھے اور آخر عمر میں یہیں آکر بس گئے تھے۔ اُن کا انتقال ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وصال سے نو سال کے بعد ہوا۔ آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ۷۲۹ھ اور ۷۳۴ھ کے مابین آپ کی

مجالس اور ملفوظات قلم بند کیے گئے جس میں آپ نے اپنے دادا شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے ملفوظات بھی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا نام "سُرور الصّدور و نور البدور" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنوں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل ۱۳۰۱ھ میں تیار کی گئی اور وہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے ذخیرۂ کُتب میں موجود ہے جو اب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ ۳۵۹ اوراق کا نسخہ ہے اور اُس کا ایک تہائی حصّہ "سُرور الصّدور" پر مشتمل ہے، باقی دو تہائی کتاب میں شیخ حمید الدین صوفی، شیخ عزیز الدین اور شیخ فرید الدین ناگوری علیہم الرحمۃ کے مکتوبات اور رسائل وغیرہ ہیں اور اُن میں بھی بہت کار آمد مواد موجود ہے۔

ان مکتوبات و رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین صوفی پہلی بار صفر ۶۸۱ھ (اپریل ۱۲۸۲ء) میں دہلی آئے تھے اور یہاں سے اُنھوں نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت نظام الدین شیخِ وقت ہیں۔ تم جب بھی مجھے خط لکھو، اپنی اور تمام اعزّا کی جانب سے اُن کی خدمت میں سلام ضرور لکھنا۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔

"در مکتوبات کہ این طرف بفرستند برائے شیخ الوقت شیخ نظام الملّۃ والدین سلام بنویسند و از زبان یاران جملہ بجانب او سلام بنویسند تقصیر نکنند۔ مردِ صاحب درد، در جملۂ دہلی جز اُو را نیافتم اوصلی اللّٰہ بَرَکَاتِ اَنْفَاسِہٖ اِلٰی کَافَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ"

حضرت نظام الدین اولیا اُن سے ملاقات کرنے کے لیے دو بار بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اور ان کا وعظ سننے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا۔ جس حجرے میں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اُسے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ آپ اِس تنگ و تاریک حجرے میں رہ کیسے رہے ہیں؟ پھر غیاث پور جا کر اپنے ایک خادم محمد صوفی کو بھیجا کہ وہ شیخ فرید الدین کا سامان لے آئے اور اُن سے کہے کہ میرے حجرے کے اوپر اتنی جگہ ہے کہ آپ وہاں آرام سے ٹھہر سکتے ہیں۔ شہر میں جہاں کہیں حضرت نظام الدینؒ کو بلایا جاتا تھا، آپ

کہلا بھیجتے تھے کہ شیخ فرید ناگوری بھی میرے ساتھ آئیں گے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ بسیار تقاضائے تذکیر می کند و این ضعیف چو الطاف و کرم او از جملہ گذشتہ است دفع نمی تواند گفت. ان شاء اللہ تعالیٰ باحسن الاحوال میسّر گردد شیخ نظام الدین فرمودہ بود و دو بار برین ضعیف آمدہ بود؟ بغایت تعجّب کرد کہ درین حجرہ چگونہ می باشید؟ بعد ازان بدست حاجی محمّد پیغام کرد کہ این جا موضع است بر بالائے حجرۂ من اگر بیایند کرم کردہ باشند و دعاگوے چون این جا مسجد جمعہ نزدیک بود، بخدمت مولانا شرف الدین موصلی سلمہ اللہ رفتہ می باشد عذر گفت. درین مدّت بخانہ مراجعت خواہد افتاد و زحمت دادہ نمی آید مع ہٰذا ھر کُجا بدعوتے او را بطلبند این ضعیف را بطلبد و آنچہ از کرم طبع ایشان سزد از اکرام دریغ نداشت حق سُبحانہ و تعالیٰ توفیق حق گذاری الطاف ایشان کرامت کناد۔"

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ وعظ کا بہت تقاضا کرتے ہیں اور چونکہ ان کا الطاف و کرم سب سے زیادہ ہے اس لیے یہ ضعیف انکار بھی نہیں کر سکتا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت اچھی طرح میسّر ہو گا۔ شیخ نظام الدین نے فرمایا تھا اور دو بار اس ضعیف کے پاس تشریف بھی لائے تھے۔ بہت تعجب کیا کہ تم اس کوٹھری میں کس طرح رہ رہے ہو؟ پھر حاجی محمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ یہاں میرے حجرے کے اوپر ایک جگہ موجود ہے، اگر آپ یہاں آجائیں تو کرم ہو گا۔ مگر اس دعاگو نے اس لیے معذرت کر لی کہ یہاں سے جامع مسجد قریب ہے اور مولانا شرف الدین موصلی سلمہ اللہ کی خدمت میں بھی جانا ہوتا رہتا ہے۔ اس مدّت میں گھر کو واپسی ہو جائے گی اور زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ علاوہ ازیں جہاں کہیں اُنھیں دعوت میں بُلایا جاتا ہے، اس ضعیف کو بھی بُلا لیتے ہیں اور جو اُن کی طبیعت کے شایانِ شان ہے عزّت اکرام میں دریغ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن کے الطاف و کرم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری بار شیخ فرید صوفی دہلی کب آئے، اس کا علم نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بار دہلی سے واپسی محرم ۶۸۷ھ (فروری ۱۲۸۸ء) میں ہوئی تھی۔ آخری سفر میں زن و فرزند کے ساتھ دوشنبہ ۲۱ رمضان ۷۳۰ھ کو دہلی پہنچے تھے۔ اُس وقت دہلی بالکل اُجڑ چکی تھی۔ سلطان محمد بن تغلق نے ساری آبادی کو یہاں سے دولت آباد منتقل کر دیا تھا مگر ۷۲۹ھ میں مُلتان میں کچھ شورش ہوئی، اُسے دفع کرنے کی نیّت سے محمد تغلق دہلی آیا ہوا تھا۔ اُس نے شیخ فریدالدین صوفی کو بھی دولت آباد جانے کا حکم دیا اور یہ ۷۳۱ھ کے آخر میں وہاں تشریف لے گئے۔ اُس وقت حضرت بُرہان الدین غریبؒ اور امیر حسن علا سجزی دہلویؒ دونوں دولت آباد میں موجود تھے، اس لیے یقین ہے کہ ان بزرگوں سے بھی ملاقات رہی ہوگی۔

مُلتان میں غیاث الدین تغلق کے متبنّٰی ملک ابراہیم کی بغاوت کو دبانے کے لیے محمد بن تغلق کو جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے یہ سبق ضرور مل گیا کہ دولت آباد میں بیٹھ کر شمالی ہندستان پر حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا، اس لیے پھر دہلی واپس جانے کا حکم جاری کر دیا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین ناگوری بھی شعبان ۷۳۲ھ (اپریل ۱۲۳۲ء) میں پھر دہلی واپس تشریف لے آئے۔ دہلی میں بجے منڈل سے مشرق کی جانب اُن کا مکان تھا اور اب اُسی جگہ مزار مبارک ہے۔ انتقال ہفتے کے دن یکم جمادی الاولیٰ ۷۳۴ھ (۸ جنوری ۱۲۳۴ء) کو ہوا تھا۔

سُرورالصّدور میں حضرت شیخ حمیدالدین ناگوری علیہ الرحمۃ کے بارے میں ان کے فرزند شیخ عزیزالدین کی روایات بھی ہیں اور خود شیخ فریدالدین نے بھی اپنے مشاہدات و معلومات درج کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حمیدالدین سوالی نے رجج بھی کیا تھا اور وہ حضرت خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین غریب نواز قدس سرّہ کی خانقاہ میں امامت سے مشرّف تھے۔ خواجۂ بزرگ اُن کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کے لیے آجاتا تھا اور خواجۂ بزرگ اُسے شیخ حمید ناگوری کی طرف بھیج دیتے تھے۔ ایک بار خواجۂ بزرگ اجمیر کے قلعے میں تشریف فرما تھے۔ ایک درویش آئے اور انھوں نے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ایک تارکِ دنیا میں پائی جانی چاہئیں۔ حضرت خواجۂ خواجگان نے فرمایا کہ "شریعت میں تو صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے کرنے کا حکم دیا ہے اُسے

کرے اور جن باتوں سے باز رہنے کو کہا ہے اُن کے پاس نہ پھٹکے۔ ایسے شخص کو اگر کوئی تارکِ دنیا کہے تو بے جا نہ ہوگا مگر طریقت میں نو باتیں اور ہیں، جب تک وہ پوری نہ ہوں کسی کو تارکِ دنیا نہیں کہا جا سکتا۔" پھر آپ نے حضرت شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم اِن درویش کو "ترک" کے بارے میں تفصیل بتا دو اور لکھ کر بھی دے دو تاکہ یہ کسی عالمِ خدا، کو دکھا لیں اور پھر بہت سے مسلمانوں کو نفع پہنچائیں۔"

اب ان درویش کو شیخ ناگوری نے بتایا کہ صوفیاے چشت کے نزدیک "ترک" کیا ہے:

اوّل یہ کہ کسب نہ کرے؛ دوسرے قرض نہ مانگے؛ تیسرے اگر سات روز کا فاقہ ہو تب بھی کسی کے سامنے اپنا راز فاش نہ کرے اور اُس سے مدد طلب نہ کرے؛ چوتھے یہ کہ اگر بہت سا کھانا یا روپیہ یا غلّہ یا کپڑا اُسے مل جائے تو اگلے روز کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھے؛ پانچویں یہ کہ کسی کے حق میں دعاے بد نہ کرے، اگر کوئی بہت ستائے تو بس اتنا کہے کہ یا اللہ اپنے اس بندے کو راہِ راست دکھا دے؛ چھٹے یہ کہ اگر کوئی اچھا کام بن پڑے تو اُسے اپنے پیر کی شفقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالیٰ کی رحمت جانے، ساتویں یہ کہ اگر کوئی بُرا فعل سرزد ہو تو اسے اپنے نفس کی شومی سمجھے، خود کو بُرے اعمال سے بچائے رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تاکہ آیندہ وہ خطا پھر سرزد نہ ہو؛ جب اِس منزل تک پہنچ جائے تو آٹھواں مرحلہ یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے؛ نویں یہ کہ خاموش رہے اور صرف اُسی وقت کلام کرے جب حاجتِ اصلی ہو، چناں چہ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام میں یہی ہے کہ بولنا حرام ہے اور خاموش رہنا بھی حرام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات بولے جس کا مقصد خوشنودیِ حق تعالیٰ کا حصول ہو۔"

اس مختصر تقریر میں جو نو نکات پر مشتمل ہے، شیخ ناگوری نے اپنے پیر و مرشد کی ایما سے سلوک طریقت کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب اِس کی تفسیر ہے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "ترک" پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں "ترکِ دنیا" صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھے اور خدا نے اور اس کے رسول نے جن باتوں کو چھوڑنے کے لیے کہا ہے اُن کے پاس نہ پھٹکے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی بھی اپنے مریدوں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ:

"وصیّت ہمین است کہ آنچہ خدا و رسول خدا منع کردہ است آن نکنی"۔

شیخ ناگوری نے فرمایا کہ کل خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ہمارے لیے کیا لے کر آئے؟ یہ پوچھے گا کہ بتاؤ ہماری خاطر تم نے کیا چیز ترک کی تھی؟

یہ "الدّین یُسرُ" کے مصداق وہ فلسفہ ہے جس کا عام مسلمان کو مُکلف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نو مرحلے اپنے شیخ کی نیابت میں حضرت ناگوری نے بیان فرمائے، وہ دراصل ایک درویش سے خطاب ہے یعنی ان شرائط کی تکمیل کی توقّع اُن خواص سے کی جائے گی جو روح شریعت تک پہنچنے کے آرزومند ہیں۔

طبقۂ علما ہی میں نہیں اس وقت صوفیا میں بھی ایسے بزرگ تھے جنھوں نے دُنیا جمع کر رکھی تھی اور اس کی بدولت اُن پر وہ آفتیں آرہی تھیں جو دولت کے ساتھ آنی چاہئیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالمِ اسلام میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ غنا افضل ہے یا فقر۔ شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں "جدالِ سعدی با مدّعی" کے عنوان سے پورا معرکۂ فقر و غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا اور اس بارے میں وہ دوسرے درویشوں سے مراسلت بھی رکھتے تھے، چناں چہ ناگور میں ایک تاجر تھا، وہ ہر سال تِل لے کر مُلتان کی منڈی میں بیچنے جاتا تھا اور وہاں سے رُوئی لے کر ناگور آتا تھا۔ وہ شیخ حمید سوالی کے خطوط حضرت بہاءالدین زکریا مُلتانی کے نام لے جاتا تھا اور اُن کا جواب لاکر حضرت کو دیا کرتا تھا۔ ان خطوط میں شیخ ناگوریؒ نے حضرت مُلتانی کی دولت مندی پر اعتراضات کیے تھے۔ اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ خدا نے متاعِ دُنیا کو قلیل فرمایا ہے "قُل مَتَاعُ الدُّنیا قَلِیلٌ"۔ اور میرے پاس اس کا اقلِ قلیل ہے۔ اس پر شیخ ناگوری نے پھر کچھ لکھا تو حضرت مُلتانی نے جواب نہیں دیا۔

اِس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ نجم الدین صُغرای نے شیخ جلال تبریزیؒ پر اتّہام لگایا اور التتمش کے دربار میں اُن کے خلاف محضر مقرّر ہوا اور اُنھوں نے شیخ بہاء الدین مُلتانی کو اپنا گواہ بنا کر پیش کیا تو اُس محفل میں صوفی حمید الدین ناگوریؒ بھی موجود تھے اُنھوں نے شیخ مُلتانی سے کہا کہ جہاں کہیں مال ہوتا ہے وہاں مار (سانپ) بھی رہتا ہے، اِس میں کیا حکمت ہے؟ چناں چہ کہاوت بھی ہے کہ "گنج با مار و گُل با خار" ——

مال اور مار میں کچھ صوری مناسبت بھی ہے مگر معنوی مناسبت کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ ملتانی نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں میں کوئی صوری مناسبت نہیں ہے البتہ معنوی مناسبت موجود ہے اور وہ یہ کہ اپنے زہر کی وجہ سے مار (سانپ) مُہلک ہے اور مال بھی اکثر لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ شیخ ناگوری نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور مار ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں تو جو مال جمع کرتا ہے وہ گویا 'مار' جمع کر رہا ہے۔ شیخ ملتانی سمجھ گئے کہ یہ میری دولت کی طرف اشارہ ہے۔ فرمانے لگے کہ اگر کسی کو سانپ کا منتر یاد ہو تو اُسے سانپ کا زہر کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ ایک پلید، زہر دار اور پُر خار جانور کو پالنا اور پھر اُس کا منتر یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پھنسنا کون سی دانائی ہے؟ جب شیخ ملتانی نے دیکھا کہ ان کی دلیل قوی ہوتی جاتی ہے تو کہنے لگے کہ یہ الزام تو مجھ پر ہی نہیں میرے پیر و مرشد پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اُسی وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی رُوحِ پُر فتوح حاضر ہوئی اور کہا کہ بہاء الدین اِن سے یہ کہہ دو کہ تمھاری درویشی میں ایسا حُسن و جمال نہیں ہے جسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو اور ہماری درویشی میں اتنا جمال کمال ہے کہ اُسے نظر گذر سے بچانے کے لیے ٹیکا بھی درکار ہے، اس لیے ہم نے "وسمۂ سیاہیِ دُنیا" اس کے چہرے پر لگا لیا ہے۔ جب شیخ ملتانی نے حضرت ناگوری سے یہی بات کہی تو اُنھوں نے فرمایا:

"سُبحان اللہ! آپ کی درویشی میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشی سے زیادہ تو حُسن و جمال نہیں ہے۔" آن حضرتؐ نے غنا پر فقر کو ترجیح دی اور فرمایا کہ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَالْفَقْرُ مِنِّیْ"—— اس پر شیخ ملتانی نے کچھ جواب نہیں دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ملتانی کے ایک صاحبزادے ناگور تشریف لائے تو اُنھوں نے دیکھا کہ شیخ حمید الدین ناگوری جُمعہ کی نماز میں موجود نہیں تھے، اس پر اُنھوں نے خاصا ہنگامہ کیا اور شیخ ناگوریؒ نے فرمایا کہ ناگور 'مصر' کے حکم میں نہیں، اس لیے یہاں جمعہ کا وُجوب بھی نہیں ہے مگر اُنھوں نے علما کو ساتھ ملا کر خاصی بحث کی۔ شیخ نے فرمایا کہ تم نے جتنا ہمارے اوقات میں خلل ڈالا ہے اُتنی دیر کے لیے "ما ترا حبسِ درویشان دادیم"۔

شیخ حمید کے انتقال کے بعد حضرت مُلتانی کے یہ فرزند کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ڈاکو نے اُنھیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تمھیں اپنے والد ماجد کی چھوڑی ہوئی جایداد سے اتنا مال ملا ہے وہ سب

لاؤ جب رہا کروں گا۔ اُنھوں نے اپنے بھائی شیخ صدرالدین مُلتانی کو قید کا ماجرا اور رہائی کی شرط لکھی۔ وہاں سے مال آیا تب اُنھیں نجات ملی۔

حضرت مُلتانی کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین مُلتانی علیہ الرحمۃ ۷۲۰ھ میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی دعوت پر دہلی آئے تھے جس نے انھیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی نیت سے بُلوایا تھا مگر اسی سال خسرو خاں نے سلطان کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ حضرت شیخ رکن الدینؒ پھر بھی چار سال تک دہلی میں رہے۔ اُنھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی اور اُس وقت یہ فرمایا تھا کہ :

"امروز مرا تحقیق شد کہ چہار سال کہ مرا در دہلی داشتند مقصود این بود کہ بہ شرفِ امامت نمازِ جنازہ سلطان المشائخ مشرّف شوم"۔ (سیر الاولیا)

لیکن دہلی میں اُن کے طویل قیام کا سبب معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رکن الدین مُلتانی خسرو خاں کے محل کے زینے سے گر پڑے تھے جس سے چہرہ مبارک پر بہت چوٹ لگی تھی اور پانو کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ۷۲۰ھ (۱۳۲۱ء) کا واقعہ ہوگا کیوں کہ اسی سال چار ماہ اور چند روز کے لیے برسرِ اقتدار رہ کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں مارا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اِس مجبوری کی وجہ سے آپ کو ایک طویل عرصے تک دہلی میں قیام کرنا پڑا ہوگا۔

شیخ فریدالدینؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے سُنا ہے حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے :

ہاں اے دلِ گرم، بادمِ سرد بساز — با دیدۂ لعل و با رُخِ زرد بساز
فریاد رسے چو نیست فریاد مکن — درماں چو نمی بینی ، با درد بساز

اور فرمایا کہ شیخ جیو نے یہ اشعار بھی اکثر "خواجہ جیو" کو پڑھتے سُنا ہے :

اے دل غم آن مخور کہ فردا چہ شود — زیرا کہ ہمہ خوشی دران پے بشود
حکمے کہ بکر داست خداوندِ جہان — دانم چہ شود، و اگر ندانم چہ شود؟

۵ رجمادی الثانی ۷۲۷ھ کی مجلس میں شیخ فرید ناگوری نے فرمایا :

"شیخ بزرگ قدس اللہ روحہ العزیز امامت خواجہ جیو ہم کردے۔ چون خواجہ جیو

اجمیر فرود آمد ملکے کہ دران وقت بود خواجہ جیو را مرید شد و دختر کے بخدمت خواجہ جیو فرستاد و خواجہ جیو دران وقت معمّر شدہ بود میگویند عمر ایشاں بنود ۹۰ سال رسیدہ بود۔ خواجہ جیو را ازان دخترک دو فرزنداں شدند۔ تا وقتیکہ شیخ بزرگ را گفت: حمید چیست اینکہ ہرگاہ کہ ما را دران جوانی کہ مجرّد بودہ ایم حاجتے بشدے دعا میکردیم و در حال اجابت شدے و این ساعت کہ پیر شدیم و فرزندان آمدند ہرگاہ کہ حاجتے می شود بسیاری می باید و دعا ہم کردہ شود ولیکن بعد از دیر تر باجابت می رسد و حاجت برمی آید این حکمت چیست؟ شیخ بزرگ فرمود گفتم یا شیخ شما را بہتر روشن است از قصہ مریم۔ دران وقت کہ مجرّد بود بے خواست او میوۂ زمستانی بتابستان می رسید و میوۂ تابستان بزمستان می آمد کہ دلش بخدا یکتا بود۔ چون عیسٰی علیہ السلام بزاد، مریم علیہا السلام منتظر بود کہ ہم چنان خواہد رسید فرمان آمد وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ۔ چون دلت یا و یکتا بود نخواستیم کہ برائے نان دو دلہ مانی"۔

از شیخ خواجہ جیو چون ایں بشنیدند پسندیدند"۔

سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں (۶۳۳-۶۰۷ھ) چالیس یاروں کا قافلہ ایک ساتھ دہلی میں آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو سلطان نے جائزہ گراں دیا تھا۔ ان میں شیخ نجیب الدین نخشی بھی تھے۔ انھوں نے اپنا حصّہ کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا اور کچھ دوستوں کی ضیافت میں۔ التمش نے انھیں اپنا مُنھ بولا باپ بنالیا تھا اور دہلی کی شیخ الاسلامی ان کو تفویض کی۔ اس لیے یہ دہلی میں رہنے لگے۔ دوسرے احباب مختلف شہروں میں جاکر بس گئے۔ حضرت شیخ معین الدین اجمیر میں تشریف لے آئے۔ جب شیخ نجیب الدین دہلی کے شیخ الاسلام تھے، خواجہ بزرگ اُن سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لائے تھے اور شیخ حمید الدین ناگوری بھی دہلی آیا کرتے تھے۔ ایک بار کہیں دعوت میں یہ سب بزرگ موجود تھے: شیخ نجیب الدین نخشی، شیخ معین الدین، شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیار اور شیخ حمید الدین صوفی ناگوری۔ اس وقت موضوع گفتگو یہ تھا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" کون ہو سکتا ہے؟ اور کون ہے؟ سب اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے۔ شیخ حمید الدین ناگوری نے کہا کہ اس زمانے میں شیخ وقت

"جیتل" (پیسہ) ہے۔ سب حضرات کہنے لگے کہ شیخ! ہم سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں اور تم مذاق میں جواب دے رہے ہو۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ میں بھی سنجیدگی سے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس زمانے میں جس کے پاس جیتل زیادہ ہوں وہی "شیخ وقت" مانا جاتا ہے۔ ان کا یہ پُر معنی فقرہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

شیخ حمید الدین صوفی نے ایک بار ۵ جمادی الاول ۶۶۶ھ کو فرمایا کہ میرے تین پیر ہیں: ایک پیر ارادت حضرت شیخ معین الدین اجمیری، دوسرے پیر صحبت مولانا شمس الدین حلوائی، تیسرے پیر خرقہ شیخ حمید الدین محمد جوئنی۔

لیکن انھیں حضرت خواجہ بزرگ غریب نوازؒ سے بھی خرقۂ ارادت ملا تھا اور وہ تبرّکات ان کے پوتے شیخ فرید الدین صوفی کے پاس محفوظ تھے۔ جمال الدین کلدنی متصرّف ناگور کو انھوں نے ایک کلاہ بھیجی اور اس کے ساتھ خط لکھا تھا:

"کلاہے کہ این ضعیف را از شیخ رسیدہ است و شیخ را از خدمت اجل شیخ معین الدین سجزی قدّس اللہ روحہ رسیدہ است فرستادہ شد باید کہ بحرمت و تعظیم تمام بر سر نہند و دوگانہ بگذارند و مرادے کہ پیش دل آید بخواہد یقین است کہ بیابد بفضل اللہ۔"

حضرت خواجہ بزرگ کا خرقہ بھی شیخ فرید الدین صوفی تک پہنچا تھا۔ انھیں بیعت کرتے وقت یہ اقرار لیا تھا کہ:

"درویشی را دوست دارم و درویشان را خدمت کنم۔"

پھر اپنا جبہ اُتار کر پہنایا اور کہا:

"این خرقہ شیخ است کہ بمن رسیدہ بود ترا می پوشانم و این ضعیف را پوشانیدند۔"

غرض یہ کتاب حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے ایک جلیل القدر خلیفہ کے حالات و ملفوظات کا سب سے اہم اور قابل قدر ماخذ ہے۔ اس میں ایک کتاب شرف الانوار کا حوالہ بھی آیا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات پر مشتمل تھی اور فصل اور نوع کے عنوان سے مختلف فصول و ابواب میں تقسیم کر کے لکھی گئی۔ یہ اب ناپید ہو چکی ہے۔ اگر کہیں اس کا نسخہ دستیاب ہو جائے تو اس میں بھی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں گی اور یہ حضرت کے حالات میں سرور الصدور سے بھی قدیم تر ماخذ ہوگی۔

# حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

یوں تو سبھی سلسلوں کے صوفیوں نے عوام میں مقبولیت حاصل کی ہے لیکن چشتی صوفیوں نے خاص طور پر عام انسانوں کے دلوں کو جیتا ہے اور وہ آج تک عوام کی محبّت و عقیدت کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ چشتیوں کے سرتاج حضرت خواجہ معین الدین سجزی اجمیری علیہ الرحمۃ آج بھی "غریب نواز" کہلاتے ہیں اور ماہِ رجب کی ابتدائی تاریخوں میں ہندستان بھر سے لاکھوں زائرین ان کے آستانے پر والہانہ عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے جب اجمیر کو اپنا مسکن بنایا تھا اُس وقت وہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی۔ اسی سے ظاہر ہے کہ عوام کا دِل جیتے بغیر وہ وہاں اپنی خانقاہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت غریب نوازؒ کے خلفا میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کی ہے۔ اُنھوں نے دِلّی کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ ہر چند وہ عزلت اور استغراق کے عالم میں رہتے تھے اور اُن کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی، صرف ۵۳ سال تک صدرِ حیات میں رہے، اور دِلّی میں اُن کا قیام ۳۰ سال کے لگ بھگ رہا، لیکن اِس مختصر سی مدّت میں اُنھوں نے شہنشاہِ وقت سے لے کر ادنا اور غریب انسانوں تک سبھی کو اپنا ایسا گرویدہ بنالیا تھا کہ جب حضرت خواجہ اجمیریؒ آخری بار دِلّی تشریف لائے تو اُس وقت دھلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے اُن سے شکایت کی کہ آپ نے شہر میں اپنا ایک ایسا مرید

بٹھا رکھا ہے جس کے سامنے میری شیخ الاسلامی کا چراغ نہیں جلتا اور مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔ اِس پر حضرت غریب نوازؒ نے فرمایا: تم اطمینان رکھو میں قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جاؤں گا۔ جب دِلّی والوں کو یہ معلوم ہوا کہ قطب صاحب اپنے پیر و مرشد کے ساتھ اجمیر کی طرف کوچ کر رہے ہیں، تو سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ یہ دونوں بزرگ آگے آگے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے شہنشاہِ وقت سلطان شمس الدین اِلتتمش اپنی آنکھوں میں آنسو لیے منّت سماجت کر رہا تھا، اور اس کے ساتھ ساری خلقِ خدا گریہ کناں تھی۔ جب ایسا کہرام دیکھا تو حضرت غریب نوازؒ نے خواجہ قطب الدینؒ سے فرمایا کہ کسی ایک شخص کا دِل رکھنے کے لیے خدا کی اتنی مخلوق کا دِل توڑنا جائز نہیں ہو سکتا، تم دلّی ہی میں رہو۔ اِسی ایک واقعے سے اُن کی ہر دِل عزیز شخصیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ وسط ایشیا کے قصبہ اوش کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والدِ محترم کا نام احمد بن موسیٰ بتایا جاتا ہے۔ بعض تذکروں میں کمال الدین احمد لکھا ہے۔ اقتباس الانوار میں آپ کو حسینی سیّد بتایا گیا ہے اور ایک شجرہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر تاریخ خان جہانی کے مؤلف خواجہ نعمت اللہ ہروی نے آپ کو افغانوں کے قبیلہ سڑبنی کا چشم و چراغ بتایا ہے۔ حضرت قطب الدین صاحبؒ کی ولادت ۵۸۰ھ کے قریب ہوئی اور ابھی آپ دو برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور آپ کی تعلیم و تربیت والدہ ماجدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ جب آپ مکتب جانے کے قابل ہوئے تو والدہ محترمہ نے ایک ہمسایہ کے ساتھ آپ کو محلّے کی مسجد میں پڑھنے کے لیے بھیجا، مگر راستے میں ایک مردِ غیب مل گئے اور اُنھوں نے آپ کو ایک بزرگ ابو حفص کی خدمت میں پہنچا دیا، جنھوں نے خاص توجّہ سے ظاہری و باطنی تربیت فرمائی۔ جب آپ کی عمر ۲۵ سال تھی، حضرت خواجہ معین الدین سجزیؒ کا اوش سے گذر ہوا، آپ اُسی وقت اُن سے بیعت ہو گئے۔ مرشد نے انھیں تمام فضائل سے آراستہ دیکھا تو اپنی خلافت بھی مرحمت فرما دی۔ اب آپ کو شدید طلب پیدا ہوئی کہ عالمِ اسلام کی بڑی خانقاہوں میں جا کر مزید فیوض حاصل کریں، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ آپ

بغداد تشریف لے گئے اور اُس وقت وہاں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحدالدین کرمانی جیسے باکمال موجود تھے، اُن کی صحبت سے استفادہ کیا۔ وہاں سے ہندستان کی طرف روانہ ہوئے، اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانیؒ کی خانقاہ میں کچھ عرصے تک مُلتان میں رہے۔ اُس وقت ناصرالدین قباچہ مُلتان کا حاکم تھا اور اُس سرحدی علاقے کو منگولوں کے لشکر نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قباچہ نے آپ سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے ایک تیر پر کوئی دعا دَم کر کے اُسے دیا اور فرمایا کہ اِسے کسی بلند مقام سے دشمن کے لشکر کی طرف پھینکو۔ قباچہ نے ایسا ہی کیا، اور اُسی رات کو منگول کسی دوسری طرف نکل گئے۔ اُس زمانے میں حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نوعمر تھے اور بعض درسی کتابیں پڑھ رہے تھے، اُن سے قطب صاحب کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ دلّی آکر قطب صاحب نے ابتدا میں کیلوکھیڑی میں قیام فرمایا تھا، بعد کو مَلِک اعزّالدین کی مسجد کے سامنے ایک مکان میں منتقل ہوئے۔ یہاں آپ ایک دن عید گاہ سے نماز پڑھ کر واپس آرہے تھے، راستے میں ایک مقام پر اچانک ٹھہر گئے اور فرمایا کہ "اِس زمین سے دِلہائے سوختہ کی بو آرہی ہے۔" تفتیش کر کے اس قطعۂ زمین کے مالک کو بُلایا گیا اور وہ زمین آپ نے خرید لی۔ اُسی پر آج کل آپ کی ابدی آرام گاہ بنی ہوئی ہے، اور یہی وہ مقدّس مقام ہے جہاں گذشتہ سات سو برسوں سے ہزاروں انسانوں کے سر عقیدت سے جھک رہے ہیں۔

حضرت قطب صاحب اکثر و بیشتر مشغولی اور استغراق کے عالم میں رہتے تھے۔ آپ کی خوراک بھی بہت ہی کم تھی، اکثر روزہ رکھتے تھے اور نیند بھی بس برائے نام ہوتی تھی۔ آپ کی باطنی مشغولی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو کسی آنے والے کی خبر کرنی ہوتی تھی تو خادم آپ کے دونوں شانوں کو پکڑ کر ہلاتا تھا، اُس وقت آپ اشارہ کر کے دریافت فرماتے کہ کیا بات ہے؟ خادم عرض کرتا کہ بہت سے لوگ سلام کرنے کو حاضر ہیں۔ آپ اشارہ فرماتے کہ ان لوگوں کو باریاب کیا جائے اور ان کے آنے پر ایک ایک کوزہ سادہ پانی پیش کیا جاتا تھا۔ لوگ پانی پیتے اور آپ ہاتھ اُٹھا کر سورۂ فاتحہ پڑھتے اور دُعا کر کے آنے والوں کو رخصت فرما دیتے۔ آپ کی زندگی بہت عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی، اس لیے

زائرین کو صرف پانی سے ہی نوازا جاتا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ہماری خانقاہ میں لنگر ۵۰ سال کے بعد جاری ہوگا۔ چناں چہ حضرت نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کی خانقاہ پورے ۵۰ برس کے بعد بنی اور اس میں ایسا لنگر جاری ہوا کہ سارے مُلک میں اس کی نظیر نہیں تھی اور وہ لنگر آج تک جاری ہے۔ اگر کبھی آپ گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو راستے میں بھی استغراق کا یہ عالم طاری رہتا تھا، اور آپ کا سر کسی دیوار سے لگتا تھا تو آنکھیں کھول کر راستہ درست کرتے تھے۔ حضرت قطب صاحبؒ کا وصال بھی وجد و کیف اور استغراق تمام کی حالت میں ہوا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ ۱۲ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ یعنی ۱۳ نومبر ۱۲۳۶ء کو جمعرات کے دن شیخ علی سجزیؒ کی خانقاہ میں سماع کی محفل منعقد ہوئی، جس میں قطب صاحبؒ بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ کے ہمراہ شیخ بدرالدین غزنویؒ اور شیخ محمود نہروالاؒ جیسے یارانِ طریقت بھی تھے۔ وہاں قوّال نے حضرت شیخ احمد جامؒ کی یہ غزل شروع کی:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

آپ کو اس شعر پر وجد ہوا اور قوّال سے بار بار اِسی کو پڑھواتے رہے اور یہ کیفیت تین دن رات تک طاری رہی۔ جب نماز کا وقت آتا تو آپ عالمِ صحو میں آجاتے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے، اس سے فارغ ہوتے ہی پھر وہی حال طاری ہو جاتا، یہاں تک کہ آپ نے ۱۴ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ یعنی ۱۵ نومبر ۱۲۳۶ھ کو اسی عالم میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تاریخِ وفات کسی نے اُسی زمانے میں "آہ خواجہ جی" سے برآمد کی تھی۔ قطب صاحب نے غالباً دو نکاح کیے، پہلا نکاح اوائلِ شباب میں ہوا تھا۔ اُس وقت آپ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل تین ہزار بار درود شریف پڑھ کر اُس کا ثواب بارگاہِ رسالت میں پیش کیا کرتے تھے۔ آپ کے ایک مرید احمد رئیس نے خواب میں دیکھا کہ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

"قطب الدین سے ہمارا سلام کہو اور یہ کہ وہ جو ہدیہ بھیجا کرتے تھے، وہ تین دن سے نہیں ملا، کیا بات ہے؟"

آپ پر اس خواب کا اتنا اثر ہوا کہ زوجۂ محترمہ سے علاحدگی اختیار کرلی۔ دوسرا نکاح غالباً ہندستان آنے کے بعد کیا اور ان زوجۂ ثانیہ کے بطنِ مبارک سے دو جُڑواں بچّے پیدا ہوئے، اِن میں سے ایک طفولیت ہی میں کسی بیماری سے گذر گئے۔ جب آپ کے کانوں میں بچّے کی ماں کے رونے کی آواز پڑی تو دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ فرزند کی رحلت پر رو رہی ہیں، تو آپ کو بہت رنج ہوا اور فرمایا کہ مجھے افسوس یہ ہے کہ خدا سے اس بچّے کی زندگی مانگنا یاد نہ آیا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ خدا اُسے سلامت رکھتا۔ آپ کے دوسرے صاحبزادے کا نام احمد تمتاجی بتایا جاتا ہے اور حضرت خواجہ نظام الدینؒ کا بیان ہے کہ یہ اپنے والدِ محترم کے رنگ پر بالکل نہ تھے، نہ انھیں قطب صاحبؒ کے احوالِ باطنی سے کچھ نسبت تھی، اور دُررِ نظامی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ احمد تمتاجی کی یہ خواہش تھی کہ وہ قطب صاحب کے سجّادہ نشین ہوں، مگر قطب صاحب نے وصیّت فرمائی کہ میرا سجّادہ شیخ فریدالدین مسعود کو دیا جائے، اُن سے ہمارا سلسلہ آگے چلے گا۔ دوسری وصیّت یہ بھی تھی کہ حضرت بابا فرید آپ کی بیوہ سے عقد کرلیں، لیکن بابا صاحب نے فرمایا کہ میں اس وصیّت کی تعمیل سے عاجز ہوں۔ قطب صاحب نے اپنا جامہ مبارک جو شیخ فریدالدین کو مرحمت فرمایا تھا وہ حضرت نظام الدین نے دیکھا تھا اور ایک مجلس میں فرمایا کہ "دوتائی بود سوزنی"۔ امروہہ میں حضرت بابا فرید علیہ الرحمۃ کے وہ تمام تبرّکات ابھی تک محفوظ ہیں اور گمان غالب یہ ہے کہ ان میں وہ جامۂ خلافت بھی شامل ہے۔

جب قطب صاحب کی رحلت ہوئی اس وقت حضرت بابا فرید ہانسی میں مقیم تھے۔ دہلی سے ایک آدمی انھیں بُلانے کو بھیجا گیا مگر اس سے پہلے ہی حضرت بابا فریدؒ کو ایک خواب میں یہ مکشوف ہوا کہ میرے مرشد کی رحلت ہوگئی ہے، آپ فوراً وہاں سے دہلی کی طرف روانہ ہوگئے اور یہاں سے گیا ہوا قاصد آپ کو نہم میں ملا۔ تیسرے دن آپ دہلی پہنچے اور شیخ کے سجّادہ پر بیٹھے۔ حضرت قطب صاحب کی عمر ۵۳ سال دو ماہ اور ۱۴ دن بتائی گئی ہے۔ اسی سال حضرت خواجہ معین الدین اجمیر سے دلّی تشریف لائے تھے اور ابھی وہ اجمیر واپس بھی نہ پہنچے تھے کہ قطب صاحب کا انتقال ہوگیا اور اس سے پانچ ماہ کے

بعد ہی ۶؍ رجب ۶۳۴ھ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بھی اجمیر میں رحلت فرمائی۔

حضرت بابا فریدؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اور دادا پیر حضرت خواجہ غریب نواز نے وقتِ واحد میں بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا، اور اس طرح بابا صاحبؒ حضرت غریب نوازؒ کے بھی راست جانشین ہوئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے پاک پٹن میں قیام فرما کر خلقِ خدا کو اپنا روحانی فیضان پہنچایا اور آپ کی خانقاہ غریبوں اور دُکھی انسانوں کی ایسی پناہ گاہ بن گئی جہاں آدھی رات تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کے جانشین حضرت نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کی بدولت یہ فیضان ہندستان کے ایک ایک گوشے میں پہنچ گیا۔

غرض ہندستان کی سرزمین میں چشتی برکات کا جو پودا حضرت غریب نواز نے لگایا تھا اس کی آبیاری حضرت قطب صاحب نے کی اور حضرت بابا فریدؒ کے عہد میں وہ ایک چھتنار درخت بن گیا جس کے سایے میں خلقِ خدا کو راحت ملی، پھر حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے زمانے میں اس کے پھل ہی عام لوگوں تک نہیں پہنچے بلکہ اُس کی قلمیں بھی دُور دُور تک لگ گئیں جن کا فیض ہمیں اور آپ کو بھی مل رہا ہے۔

[اردو سروس آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر ہوا]

# فوائد السّالکین

## (ایک تنقیدی جائزہ)

فوائد السّالکین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی قُدِّس سرُّہٗ (ف ۶۳۴ھ) کے ملفوظات ہیں جنھیں حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ (ف ۶۷۰ھ) نے جمع کیا تھا۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے۔ شائع بھی ہو چکی ہے اور بعض کُتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے بھی پائے جاتے ہیں مگر کوئی نسخہ بارھویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نظر سے نہیں گذرا۔ ہمارے سامنے سرِ دست اس کا اُردو ترجمہ ہے جو ہشت بہشت نامی مجموعے میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ کتاب کے دیباچے میں مرتّب نے اپنا تعارف یوں پیش کیا ہے:

"فقیر حقیر مسعود اجودھنی جو کہ درویشوں کا غلام بلکہ ان کی خاکِ پا ہے۔ یوں عرض کرتا ہے۔"

کتاب کا ترجمہ بڑے سائز کے صرف ۲۹ صفحات میں آیا ہے۔ اصل فارسی رسالے کی ضخامت بھی تقریباً اتنی ہی ہے۔[۱]

کتاب میں مجالس کی ترتیب کا لحاظ نہیں ہے۔ ایک کے بعد دوسری مجلس صرف

---

۱؎ اصل فارسی کتاب میں نے دیکھی ہے مگر یہ مضمون لکھتے وقت میری دسترس میں نہیں ہے۔ اگر مترجم نے کہیں ترجمے میں غلطی کی ہو تو میں اس کی نشان دہی سے قاصر ہوں۔ فوائد السالکین کے نسخوں میں کچھ کمی بیشی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ محمد بولاق نے روضہ اقطاب (ص ۶۳) میں اس کتاب کا جو حوالہ دیا ہے وہ فوائد کے اس ترجمے میں نہیں ملتا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔

تاریخ کی تبدیلی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

**زمانہ** اس طرح کتاب میں کُل سات مجلسوں کا حال قلم بند ہوا ہے جن کے انعقاد کی تاریخیں اس طرح ہیں :

| | | |
|---|---|---|
| (۱) | ۲؍ رمضان ۵۸۴ھ | (ص ۱) |
| (۲) | شوال ۵۸۴ھ | (ص ۸) |
| (۳) | شوال ۵۸۴ھ سوموار | (ص ۱۷) |
| (۴) | ذی قعدہ ۵۸۴ھ سوموار | (ص ۱۷) |
| (۵) | ذی الحجہ ۵۸۴ھ ہفتہ | (ص ۲۰) |
| (۶) | شوال ۵۸۴ھ جمعہ | (ص ۲۲) |
| (۷) | بدھ کے روز ۵۸۴ھ | (ص ۲۷) |

ان تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے تاریخوں کا خاص اہتمام نہیں کیا ــــ پہلی مجلس میں ماہِ رمضان کی تاریخ درج ہے، دن ندارد۔ دوسری، تیسری اور چھٹی مجلسیں شوال ۵۸۴ھ کی ہیں۔ ان کے دن درج ہیں، تاریخ نہیں بتائی گئی۔ چوتھی مجلس ذیقعدہ کی ہے اور پانچویں ذی الحجہ کی۔ ساتویں میں مہینہ درج نہیں۔ ساتوں مجلسیں بظاہر ۵۸۴ھ میں منعقد ہو رہی ہیں مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شوال کی چھٹی مجلس ترتیب میں ذی الحجہ کے بعد کیوں آگئی ہے؟ اور نہ متن میں ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے جس سے جامع ملفوظات کی اتنی طویل غیر حاضری کا سبب معلوم ہو سکے۔

**حاضرینِ مجلس** حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کی مجالس میں جن بزرگوں کو حاضر باش دکھایا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں :

---

لہ حاضرین کے نام جامع فوائد السالکین نے غالباً سیر الاولیا (ص ۶۱) کی اس روایت سے اخذ کیے ہیں :
"منقول است : دران مجلس کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین قدس اللہ سرہ العزیز بخدمت شیخ الاسلام قطب الدین بختیار بیعت کردہ است این بزرگان حاضر بودند : قاضی حمید الدین ناگوری و مولانا علاء الدین کرمانی و سیّد نور الدین مبارک غزنوی و شیخ نظام الدین ابو المویّد و مولانا شمس ترک و خواجہ محمود موئنہ دوز و عزیزان دیگر ...."

| | | |
|---|---|---|
| (۱) | قاضی حمید الدین ناگوری | ص ۸ ؛ ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۲) | مولانا شمس الدین ترک | ص ۸ ؛ ۲۷ |
| (۳) | خواجہ محمود[۱] | ص ۸ |
| (۴) | مولانا علاء الدین کرمانی | ص ۸ ؛ ۱۷ ؛ ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۵) | سیّد نور الدین غزنوی | ص ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۶) | شیخ نظام الدین ابوالمؤیّد | ص ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۷) | ملک اختیار الدین | ص ۱۲ |
| (۸) | شیخ محمود موزہ دوز | ص ۱۷ ؛ ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۹) | سیّد شرف الدین | ص ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۱۰) | مولانا فقہ خدایداد | ص ۲۰ ؛ ۲۷ |
| (۱۱) | مولانا شہاب الدین اوشی | ص ۲۷ |
| (۱۲) | خواجہ تاج الدین غزنوی | ص ۲۷ |
| (۱۳) | قاضی عماد الدین | ص ۲۷ |
| (۱۴) | مولانا فخر الدین زاہد | ص ۲۷ |

کتاب کے مندرجات پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حاضرین مجلس کے بارے میں کچھ ضروری معلومات پیش کر دی جائیں :

(۱) حضرت قاضی حمید الدین ناگوری : حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے اجلّ خلفا میں سے ہیں۔ اصل نام محمد بن عطا ہے۔ انھوں نے ۶۴۳ھ میں انتقال فرمایا۔ قطب صاحب کے دوستوں اور مصاحبوں میں سے ہیں۔ صاحب تصانیف بھی تھے۔ مزار مبارک قطب صاحبؒ کے پائین بلند چبوترے پر ہے۔

(۲) مولانا شمس الدین ترک : ان کی نشان دہی نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ اسی

---

[۱] یہ غالباً خواجہ محمود موئنہ دوز ہی ہیں جن کا حوالہ نمبر ۸ میں ہے اور وہاں انھیں موزہ دوز لکھا ہے۔

نام کے پانی پتی بزرگ مراد ہوں۔

(۳) **خواجہ محمود:** یہ غالباً شیخ محمود موئنہ دوز ہی ہیں جن کا نام اس فہرست میں آٹھویں نمبر پر آیا ہے۔ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے مرید تھے مگر قطب صاحبؒ سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی مجلسوں کے حاضر باش تھے۔ قطب صاحب کے جوار ہی میں مدفون ہیں۔ خواجہ محمود موئنہ دوز ۵۸۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۶۵۵ھ میں انتقال فرمایا۔[۱]

(۴) **مولانا علاء الدین کرمانی**

(۵) **سیّد نور الدین غزنوی:** یہ بھی شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ ہیں۔ شیخ اجل شیرازی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ حوضِ شمسی کے جانب شرق ان کا مزار ہے۔ ۶۳۲ھ میں انتقال فرمایا۔[۲]

(۶) **شیخ نظام الدین ابوالمویّد[۳]:** یہ شمس العارفینؒ کی اولاد میں تھے۔ ان کی اولاد میں شیخ جمالؒ ہیں جن کا مزار علی گڑھ میں ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے بھی بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔ دہلی میں وعظ کرتے تھے، بہت پُر اثر بیان ہوتا تھا۔

(۷) **ملک اختیار الدین[۵]:** اس کا حوالہ یوں ملتا ہے کہ "ملک اختیار الدین اس قصبے کا مالک آیا۔" (ص ۱۲)

(۸) **شیخ محمود موزہ دوز:** یہ غالباً وہی ہیں جن کا حوالہ نمبر ۳ پر خواجہ محمود کے تحت دیا گیا ہے۔ موزہ دوز غلط لکھا ہے۔ موئنہ دوز ہونا چاہیے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار ص ۳۷، ۳۸ میں تاریخ وفات ۶۰۸ھ غلط ہے۔ ان کا انتقال قطب صاحبؒ کی وفات سے دس سال بعد ہوا ہے۔ معین الاولیا: ص ۱۷۵۔ اس میں تاریخ وفات ۶۷۸ھ غلط درج ہے۔

[۲] اخبار الاخیار: ص ۵۰۔ [۳] ایضاً: ۲۸، ۲۹۔

[۴] اخبار الاخیار: ص ۴۶؛ فوائد الفواد: ص ۱۵۹؛ ۳۲۳، ۳۲۴ وغیرہ۔

[۵] ملک اختیار الدین بلبن کے امرا میں سے ہے۔ دیکھو سیر الاولیا: ص ۵۳۔
ضیاء برنی: تاریخ فیروز شاہی (مرتبہ سر سیّد احمد خاں)، ص ۲۴ (کلکتہ ۱۸۶۲ء)۔
طبقات ناصری (بہ تصحیح کپتان ولیم ناسولیس۔ کلکتہ ۱۸۶۴ء): ص ۱۴۱۔

(۹) سیّد شرف الدین

(۱۰) مولانا فقہ خدایداد

(۱۱) مولانا شہاب الدین اوشی

(۱۲) خواجہ تاج الدین غزنوی

(۱۳) قاضی عماد الدین

(۱۴) مولانا فخر الدین زاہد

## تاریخی پس منظر

فوائد السالکین کی تمام مجلسیں ۵۸۴ھ میں منعقد ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں تو سلطنت دہلی بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ قطب الدین ایبک نے ۲۰ سال تک دہلی پر حکومت کرنے کے بعد ۶۰۷ھ میں انتقال کیا ہے۔[1] گویا اس نے ۵۸۷ھ میں دہلی فتح کی تھی۔ اس لحاظ سے جتنے واقعات فوائد السالکین میں درج ہیں، ان کی تاریخی حیثیت قطعاً مشتبہ ہے۔

## کتابوں کے حوالے

دوسرے موضوع ملفوظات کی طرح فوائد السالکین میں کتب فقہ و تصوّف کے حوالے بہت کم ہیں۔ صرف تین کتابوں کا سرسری تذکرہ آیا ہے۔

(۱) اسرار العارفین : خواجہ شبلی، ص ۲

(۲) تنبیہ : خواجہ ابو اللیث سمرقندی، ص ۱۱

(۳) "شیخ الاسلام برہان الملّۃ والدّین کے روضۂ مبارک میں لکھا دیکھا ہے" (ص ۱۲)

## سیاحت

فوائد السالکین میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے صرف پانچ اسفار کا حوالہ ہے:

(۱) غزنی، ص ۲

(۲) سمرقند، ص ۸

(۳) بغداد، ص ۱۳؛ ۱۷

---

[1] طبقات ناصری (بہ تصحیح کپتان ولیم ناسولیس۔ کلکتہ ۱۸۶۴ء) : ص ۱۴۱

۴ سفرج ، ص ۱۴

۵ بدایوں ، ص ۲۴

**سوانحی بیانات** اس کتاب میں جو حصّہ حضرت قطب صاحبؒ کے سوانح پر روشنی ڈالتا ہے پہلے اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

فوائد السالکین سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ ۲ رمضان ۵۸۴ کو قطب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی وقت چار گوشہ ترکی کلاہ جو آپ پہنے ہوئے تھے، بابا صاحب کے سر پر رکھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ بابا صاحب نے ۶۷۰ھ میں نوّے سال سے زائد (تقریباً ۹۳ سال) کی عمر میں انتقال فرمایا ہے[۱] اس لحاظ سے ۵۸۴ھ میں بابا صاحب کا سن شریف بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے[۲] اور ظاہر ہے کہ آپ اتنی کمسنی میں حضرت قطب صاحب سے بیعت نہیں ہوئے تھے۔

قطب صاحب نے فرمایا کہ میں "کئی سال تک شیخ معین الدین حسن سجزیؒ کی خدمت میں رہا۔" (ص ۴) دوسرے مواقع پر بھی حضرت غریب نوازؒ کا تذکرہ ایسے لفظوں میں کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا وصال ہو چکا تھا۔ چناں چہ ایک موقعے پر ہے :

> "میں خود بھی اپنے خواجہ شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی علیہ المغفرۃ کے وقت حاضر نہ تھا ...." (ص ۲۸)

اور اس سے ہی کتاب کے جعلی ہونے کا پردہ چاک ہو جاتا ہے کیوں کہ اتّفاق سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے پیرو مرشد حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا وصال ایک ہی سال یعنی ۶۳۴ھ میں ہوا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ حضرت قطب صاحبؒ نے ۱۴ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ کو انتقال فرمایا ہے اور خواجہ غریب نوازؒ ان سے تقریباً چار ماہ بعد

---

[۱] فوائد الفواد : ص ۸۹ ؛ سیر الاولیا : ص ۹۱۔

[۲] مولّف سیر الاولیا نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابا صاحب ۵۸۴ھ میں بیعت ہوئے تھے۔ لیکن یہ غلط ہے تفصیلی بحث ہم نے دوسرے موقع پر کی ہے۔

۶ ر رجب ۶۳۴ھ کو محبوب حقیقی سے ملے ہیں [1] جب خود مرشد کا انتقال مرید کے بعد ہوا ہے تو فوائد السالکین میں قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ :

" میں خود اپنے خواجہ کے انتقال کے وقت موجود نہ تھا "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے فوائد السالکین لکھی ہے اسے ان بزرگوں کے حالات و سوانح سے ذرّہ بھر واقفیت بھی نہیں ہے اور اس نے کتاب وضع کرنے میں بھی کسی چالاکی یا ذہانت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیے :

" فرمایا کہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری ایک مرتبہ شیخ علی سجزی قدس اللہ سرہ العزیز کی خانقاہ میں تھے، وہاں سماع ہو رہا تھا [2] اور قوّال یہ قصیدہ گا رہے تھے :

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زمان از غیب جانے دیگر است

---

[1] فوائد الفواد : ص ۲۴۶ ؛ سیر الاولیا : ص ۵۵، ۵۶ ؛ درر نظامی : ص ۲۱۰ ؛ اخبار الاخیار : ص ۲۵، ۲۶۔
درر نظامی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۳۳ھ میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ دہلی تشریف لائے تھے اور یہاں سے رخصت ہو کر ابھی اجمیر پہنچے نہیں تھے کہ دہلی میں قطب صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔
محمد بولاق مولف روضہ اقطاب (مطبع محب ہند، دہلی ۱۸۸۷ء، ص ۳۴) نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے قطب صاحبؒ کی وفات سے چند ماہ بعد انتقال فرمایا تھا۔ اور اپنی تائید میں دلیل العارفین کی عبارت پیش کی ہے جو قطب صاحب سے منسوب جعلی ملفوظ ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحبؒ کی تاریخ وصال ۶ ر رجب ۶۳۲ھ بیان کی ہے۔ لیکن مولف درر نظامی کا بیان مستند ہے۔

[2] فوائد السالکین میں ایک اور محفل سماع کا حوالہ بھی ملتا ہے :
" وقتے در خدمت خواجہ قطب الدین قوّالاں در رسیدند و ایں بیت را بصوتِ زیبا و آہنگ دلربا آغاز گردانیدند :

سرود چیست کہ چندیں فسون عشق در وست    سرود محرم عشق است و عشق محرم اوست

خواجہ را ایں بیت در گرفت و ہفت شبانہ روز بے ہوش ماند میل بطعام و شراب نداشت امّا وقت نماز از دست نمی داد و بہوش باز آمدے و نماز بدستور قدیم می گذاشت ...." (روضۃ الاقطاب : ص ۶۴)

.... ہم دونوں میں اس بیت نے کچھ ایسا اثر کیا کہ ہم تین دن رات اسی بیت میں مدہوش رہے، پھر جب گھر آئے تو پھر بھی قوالوں سے یہی سنتے رہے۔ چناں چہ تین دن رات اور بھی ہم اس بیت کی حالت میں رہے کہ ہمیں اپنے آپ کی کچھ سدھ بدھ نہ تھی۔ اسی طرح سات دن اور سات راتیں ہم نے اسی بیت میں گذار دیں۔ ہر مرتبہ جب گانے والے یہ گاتے تو ہمیں ایک خاص قسم کی حالت طاری ہوتی جس کا بیان نہیں کر سکتے۔"[1]

اب اصل واقعہ فوائد الفواد کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیے:

"حکایت شیخ الاسلام قطب الدین بختیار فرمود قدس اللہ سرہ العزیز کہ اورا ہم چنین چہار شبان روز تحیر بود در وقتِ نقل. و آن چنان بود کہ در خانقاہ شیخ علی سجزی رحمۃ اللہ علیہ سماع بود و شیخ قطب الدین نوّر اللہ مرقدہٗ حاضر بود گوینده قصیدۂ می گفت:

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

شیخ قطب الدین را قدس اللہ سرہ العزیز این بیت بگرفت. چوں ازان مقام بخانہ آمد مدہوش و متحیّر بود، می فرمود کہ ہمین بیت بگویند ہمین بیت پیش او بگفتند او ہم چنان متحیّر می بود الاّ آن کہ چون وقت نماز در می آمد نماز می گذارد و باز ہمین

حضرت شیخ الاسلام قطب الدین بختیار کی حکایت بیان فرمائی کہ انھیں بھی چار شبانہ روز حیرت کا عالم رہا۔ انتقال کے وقت۔ اور ہوا یہ تھا کہ شیخ علی سجزی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں محفل سماع تھی اور شیخ قطب الدین نوّر اللہ مرقدہٗ وہاں تشریف رکھتے تھے۔ قوّال نے یہ قصیدہ پڑھا:

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز کو اس شعر پر کیفیت ہوگئی۔ جب وہاں سے گھر واپس آئے تو مدہوش اور متحیّر تھے اور فرماتے تھے کہ بس یہی پڑھے جاؤ، چناں چہ یہی شعر ان کے سامنے پڑھا جاتا رہا اور آپ اسی طرح عالم حیرت میں رہے۔ بس نماز کا وقت ہوتا تھا تو نماز پڑھ لیتے تھے اور پھر یہی

---

[1] فوائد السالکین: ص ۱۴۔

بیت می گویانید حالے و حیرتے پیدا می آمد چہار شبان روز ہم برین حال .بود شب پنجم رحلت فرمود شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ می گوید کہ من آن شب حاضر بودم. چون وقت نقل شیخ نزدیک شد مرا اندک غنودگی ربود. در خواب دیدم کہ شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز گوئی از ین مقام خود برآمدہ است و جانب بالا می رود و مرا می گوید کہ بنگر بدر الدین دوستانِ خدا را مرگ نباشد. چون بیدار شدم. شیخ بدار البقا رحلت فرمودہ .بود"[1]

شعر کہلواتے تھے اور اس سے حال اور حیرت پیدا ہوتی تھی۔ چار شباں روز اسی حال میں رہے۔ پانچویں شب میں انتقال ہوا۔ شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں اس رات کو حاضر تھا۔ جب شیخ کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو مجھے کچھ دیر کے لیے اونگھ آگئی۔ خواب دیکھا کہ شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز اپنے مقام سے نکل کر آسمان کی طرف جا رہے ہیں اور مجھ سے فرماتے ہیں کہ دیکھو بدرالدین دوستانِ خدا کو موت نہیں آتی۔ جب میں جاگا تو شیخ کا انتقال ہو چکا تھا۔

فوائدالفواد کی یہ روایت حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۰ رمضان ۷۱۵ھ کی مجلس میں بیان فرمائی ہے اور انھوں نے ایسے بزرگوں کو دیکھا تھا جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے یا تو مرید اور اجازت یافتہ تھے یا ان کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی روایت ہر اعتبار سے مستند اور قابلِ قبول ہے۔ مگر فوائدالسالکین کے مؤلف نے ۶۳۴ھ میں پیش آنے والا واقعہ ۵۸۴ھ کے واقعات میں گویا تقریباً پچاس سال پہلے ہی بیان کر دیا ہے۔

لُطف یہ ہے کہ یہاں بھی شیخ علی سجزی[2] رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ہی کا ذکر ہے۔ اور مبالغہ یہ کیا ہے کہ سات شبانہ روز قطب صاحبؒ کے بے ہوش رہنے کا تذکرہ ہے۔

---

[1] فوائدالفواد (طبع لاہور) : ص ۲۴۶، ۲۴۷؛ دررِ نظامی (ترجمہ) : ص ۲۶۵، ۲۶۶؛ سیرالاولیا : ص ۵۵، ۵۶؛ سیرالاقطاب : ص ۲۲۔

[2] شیخ علی سجزی کے لیے دیکھیے : فوائدالفواد : ص ۱۹۲- ۲۴۶۔

میرا خیال ہے کہ مؤلف فوائد السالکین نے فوائد الفواد ہی کی روایت کو تحریف کے ساتھ پیش کردیا ہے۔

سیرالاولیا میں بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ یکم شوال ۶۳۲ھ کو جب حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عید کا دوگانہ ادا کر کے آرہے تھے اس مقام پر جہاں اب مزار مبارک ہے، ٹھہر گئے اور فرمایا کہ اس زمین سے "بوے دِلہا می آید" (دِلوں کے جلنے کی بوٗ آرہی ہے۔ کنایہ بوٗے محبّت سے ہے)۔ پھر اس زمین کے مالک کو طلب کر کے اسے خرید لیا۔ اسی سال شیخ علی سجزی کی خانقاہ میں حضرت کو خواجہ احمد جام کی اس غزل پر وجد ہوا:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

اور "چہار شباں روز" بے خود رہ کر پانچویں شب میں انتقال فرمایا[۱]

اس سے ظاہر ہے کہ محفلِ سماع ۱۰ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ کی شب میں منعقد ہوئی تھی۔

حضرت شیخ علی سجزی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں اس شب کو شیخ احمد نہروالی[۲] بھی موجود تھے اور مولانا فخرالدین زرّادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ سماع میں لکھا ہے کہ اس وقت ایک طبیب حاذق شمس الدین نامی تھے۔ ان کے پاس حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قارورہ بھیجا گیا تاکہ وہ مرض کی تشخیص کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ "یہ ایسے شخص کا قارورہ ہے جو محبّت کی آگ میں جلا ہے اور اس کا جگر پگھل گیا ہے۔"[۳]

اسی کتاب میں سلطان شمس الدین التتمش کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

---

۱ سیرالاولیا (مطبع محب ہند، دہلی ۱۸۸۵ء): ص ۵۵۔

۲ برائے شیخ احمد نہروانی ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار: ص ۴۷۔

۳ مولانا فخرالدین زرادی کا رسالہ 'سماع' چھپ چکا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ جامعہ ملّیہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں بھی ایک نسخہ ہے۔

سیرالاولیا: ص ۵۶،۵۵؛ روضۃ الاقطاب: ص

"ایک دفعہ شیخ معین الدین، شیخ اوحد کرمانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی اور دعاگو ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انبیا کا تذکرہ شروع ہوا۔ اس وقت آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ سلطان شمس الدین (خدا اس کی دلیل کو روشن کرے) ابھی بارہ سال کا تھا اور ہاتھ میں پیالہ لیے جارہا تھا۔ بزرگوں کی نگاہ جب اس پر پڑی تو فوراً شیخ معین الدین کی زبان سے نکلا کہ یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہولے گا خدا اسے دُنیا سے نہ اٹھائے گا۔"[1]

یہ شوال ۵۸۴ھ کی مجلس کا ملفوظ ہے۔ یہاں بھی سلطان کو باصطلاح اموات یاد کیا ہے۔ اس نے ۶۳۳ھ میں انتقال کیا ہے۔[2] وہ ۶۰۷ھ میں تخت دہلی پر بیٹھا تھا۔[3]

اسی طرح ایک مجلس میں ہے:

"جمعہ کے روز ماہ شوال ۵۸۴ھ کو قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اہل صفا حاضر تھے اور حوض شمسی کے پانی کا تذکرہ ہورہا تھا۔ خواجہ قطب الاسلام ادام اللہ برکاتہ، نے فرمایا کہ جب شمس نے چاہا کہ دہلی میں حوض بنائے تو ایک روز اپنے امیروں، وزیروں کے ہمراہ حوض کے لیے جگہ تلاش کرنے کے لیے نکلا جہاں پر اب حوض واقع ہے۔ جب یہاں پہنچا تو کھڑا ہوگیا اور کہا کہ یہ زمین حوض کے لیے بہتر ہے۔ چوں کہ وہ خدا رسیدہ مرد تھا، اس نیّت سے اس رات مصلّے پر وہیں سوگیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ اس چبوترے کے نزدیک جو حوض واقع ہے، ایک مرد نہایت خوب صورت اور وجیہہ جس کی صفت بیان نہیں ہوسکتی، گھوڑے پر سوار ہے اور چند ایک آدمی اس کے ہمراہ ہیں۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے اپنے پاس بُلایا اور فرمایا کہ تیری کیا نیّت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری نیّت یہاں حوض بنوانے

---

[1] فوائدالسالکین (ترجمہ): ص ۱۳۔ [2] فوائدالفواد: ص ۲۶۵۔

[3] طبقات ناصری (کلکتہ ۱۸۶۴ء): ص ۱۷۰۔

۱۰۷ صفحہ اردو
Hardayal Municipal Public Library Delhi
Acc. No ... 20502 ... 1971

کی ہے۔ اسی گفتگو میں ایک شخص نے جو نزدیک ہی کھڑا تھا آہستہ سے میرے کان میں کہہ دیا کہ اے شمس! یہ رسولِ خدا ہیں۔ تو درخواست کرتا کہ تیری مراد حاصل ہو۔ چوں کہ مجھے اس وقت حوض کا خیال تھا۔ میں نے وہی عرض کی اور آپؐ کے مبارک قدموں میں گر پڑا۔ پھر میں نے اٹھ کر دست بستہ عرض کی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں پر چبوترہ واقع ہے دستِ مبارک زمین پر مارا اور فرمایا: "اے شمس! اسی جگہ حوض کھُدوانا کہ یہاں کے حوض کا پانی ایسا لذیذ ہوگا کہ کسی جگہ کا پانی اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔" ہم اسی گفتگو میں تھے کہ میری نیند کھُل گئی۔ اسی صبح اٹھ کر ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے نے سم مارا تھا وہیں سے پانی جاری ہے۔ اسی جگہ ٹھیر گیا اور حوض بنوایا۔ جو شخص وہاں آکر پانی پیتا قسم کھا کر یہی کہتا کہ لاکھوں شیرینیاں اکٹھی کر کے کھائی جائیں تو بھی اس پانی جیسی لذّت نہیں آتی۔"[۱]

یہ حوض بھی سلطان شمس الدین التمتش نے تخت نشینی (۶۰۷ھ) کے بعد بنوائی ہے، پھر اس کا تذکرہ ۵۸۴ھ میں کیسے ہو رہا ہے؟

پہلی ہی مجلس میں ایک موقع پر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری جو اس دُعاگو کے یارِ غار ہیں دریا کی طرف سیر کر رہے تھے۔"[۲]

اور ابتدا میں جن حاضرینِ مجلس کے نام گِنائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قاضی حمید الدین ناگوری بھی اس مجلس میں تشریف فرما ہیں[۳] اسی طرح قاضی صاحب دوسری مجلس (شوال ۵۸۴ھ) میں بھی موجود ہیں اور ان کا ذکر صیغۂ واحد غائب میں ہو رہا ہے:

"ایک مرتبہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔"[۴]

---

[۱] فوائد السالکین: ص ۲۲، ۲۳ [۲] ایضاً: ص ۶ [۳] ایضاً: ص ۱ [۴] ایضاً: ص ۱۰

اسی طرح فوائد السالکین میں ہے: فرمایا کہ شیخ الاسلام دہلی نے میرے بھائی شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ تہمت لگائی کہ دعوا تو وہ درویشی کا کرتا ہے، لیکن خیال اس کا امیری کی طرف ہے۔ چناں چہ یہ خبر شمس والی نے بھی سن لی۔ اس نے شیخ جلال الدین کے روبرو کچھ نہ کہا۔ شیخ الاسلام دہلی کا اس میں کچھ خاص کام تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کو بُلایا گیا اور شیخ جلال الدین کو کہلا بھیجا کہ اس دعوے کے لیے کوئی منصف ہونا چاہیے۔ شیخ الاسلام دہلی نے کہلا بھیجا کہ ان کو بُلایا جائے۔ چناں چہ دوسرے روز سات بزرگ اکٹھے ہوئے اور شیخ جلال الدین بھی آئے اور معمولی صف میں کھڑے ہو گئے۔ شمس والی نے بہتیرا چاہا کہ شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ سے اوپر بیٹھے لیکن شیخ جلال الدین نے فرمایا کہ اب دعوے کا مقام ہے۔ اس وقت میرا یہی مقام ہے۔ اس کے بعد شیخ الاسلام نے جلال الدین کے مناسب حال روایتیں اور باتیں بیان کیں۔ اسی اثنا میں شیخ بہاء الدین زکریا قدس اللہ سرہ العزیز بھی آن پہنچے۔ سب لوگ حیران رہ گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو کس نے خبر کی تھی؟ اور وہ مُلتان سے کب روانہ ہوئے تھے اور کب یہاں پہنچے؟ اور جب شیخ بہاء الدین زکریاؒ وہاں آئے تو جہاں پر بزرگوں نے جوتیاں اُتاری تھیں، وہاں کھڑے ہو گئے اور شیخ جلال الدین کی نعلین مبارک کو پہچان کر زمین سے اٹھا لیا اور چوم کر سر آنکھوں پر رکھ لیا اور پھر آستین مبارک میں رکھ کر آئے اور سلام کیا۔ اور شیخ جلال الدین کے پاس ہی بیٹھ گئے جوں ہی شمس والی کو معلوم ہوا تو لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا: شیخ جلال الدین تبریزی (رحمۃ اللہ علیہ) کی بزرگی میں کوئی کلام نہیں کیوں کہ جب بہاء الدینؒ جیسے منصف نے شیخ جلال الدینؒ کی نعلین کو بوسہ دے کر آستین میں رکھ لیا۔ پس معلوم ہو گیا کہ وہ دعوا باطل ہے جو شیخ الاسلام دہلی نے شیخ جلال الدین پر کیا ہے اور یہ کہ فعل ان کی نیّت میں نہیں۔ شمس والی نے بہت سی معذرت کی۔ الغرض شیخ جلال الدین اور بہاء الدین دونوں واپس چلے گئے اور ندی کے کنارے آئے۔ رات اسی جگہ بسر کی۔ جب دن چڑھا تو شیخ بہاء الدین کو مُلتان کی طرف وداع کیا اور شیخ جلال الدین لکھنوتی (ہندستان) کو روانہ ہو گئے اور مدّت تک زندہ رہے۔ الغرض بہت زمانہ نہ گذرنے پایا کہ شیخ الاسلام دہلی پیٹ کے درد میں مُبتلا ہوئے اور اسی عارضے میں

انتقال فرمایا[1]

تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ بھی ۵۸۴ھ سے تقریباً تیس سال بعد پیش آیا ہے۔ کتاب میں ایسے واقعات کی بھرمار ہے جو چشتی صوفیا کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں۔ فوق العادت عنصر کی بھی کمی نہیں اور خوارق کے بیان میں مبالغہ ہے۔ چند مثالیں:

(۱) ایک بار خانہ کعبہ خواجہ معین الدین اجمیری کی کُٹیا میں آگیا تھا۔ (ص ۲۱)

"خانہ کعبہ کے مسافروں کی حکایت شروع ہوئی۔ خواجہ قطب الاسلام نے زبان مبارک سے فرمایا کہ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ اپنی کٹیا میں ہوتے ہیں تو خانۂ کعبہ کو حکم ہوتا ہے کہ جاکر ان کے گرد طواف کرے۔ ابھی یہ فرمارہے تھے کہ آپ اور سارے حاضرین اٹھ کر عالمِ تحیّر میں محو ہوگئے اور شوق میں مستغرق ہوگئے۔ اس اثنا میں سارے اشخاص وہی الفاظ زبان سے نکالتے تھے جو حاجی لوگ طواف کے وقت بولتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ تھی کہ ہر ایک کے بدن سے خون جاری تھا اور جو خون کا قطرہ زمین پر گرتا تھا اس سے تکبیروں کے نقش بنتے جاتے تھے۔ جب ہوش میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خانہ کعبہ سامنے کھڑا ہے۔ ہم سارے مقرّرہ آداب بجالائے اور چار مرتبہ اس کے گرد پھرے ...."[2]

(۲) "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری جو اس دعا گو کے یارِ غار ہیں، دریا کی طرف سیر کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات کا نظارہ کر رہے تھے جس کی صفت بیان نہیں ہوسکتی۔ دریا کے نزدیک ایک مقام تھا جہاں پر ہم دونوں بیٹھ گئے اور بھوک نے ہم دونوں کو لاچار کر دیا۔ وہاں بیابان میں طعام کہاں سے مل سکتا تھا۔ الغرض کچھ وقت کے بعد ایک بکری مُنھ میں دو روٹیاں لیے ہوئے آئی اور روٹیاں ہمارے سامنے رکھ کر واپس چلی گئی۔ ہم نے وہ روٹیاں کھالیں۔ اس کے بعد ہم نے آپس میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] فوائد السالکین: ص ۲۵ [2] ایضاً: ص ۲۰، ۲۱۔

یہ دونوں روٹیاں اپنے خزانۂ غیب سے عطا کی ہیں۔ وہ بکری نہیں تھی بلکہ مردانِ غیب سے کوئی ہوگا۔ ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک بچھّو ایک بڑے اونٹ کے قد کا ظاہر ہوا۔ اس طرح جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے اور دوڑتا ہوا آیا۔ جوں ہی کہ دریا کے پاس پہنچا اپنے تئیں بے دھڑک پانی میں پھینک دیا۔ میں نے قاضی کی طرف دیکھا اور قاضی میری طرف دیکھتا تھا ہم دونوں نے کہا کہ اس میں کچھ بھید ہے جو بچھّو جلدی جلدی آرہا ہے۔ مناسب ہے کہ ہم بھی اس کے پیچھے چل کر دیکھیں لیکن دریا کے اس کنارے کوئی کشتی موجود نہ تھی جس پر سوار ہو کر پار جاتے۔ جب عاجز ہو گئے تو دعا کی: "اے پروردگار! اگر ہم درویشی میں مکمّل ہو چکے ہیں تو ہمیں دریا راستہ دے دے تاکہ چل کر اس بچھّو کا تماشا دیکھیں کہ کہاں جاتا ہے۔ جوں ہی یہ مناجات ہم نے کی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دریا پھٹ گیا اور خشک زمین نکل آئی۔ ہم دونوں پار گئے۔ وہ بچھّو ہمارے آگے آگے تھا اور ہم پیچھے پیچھے۔ چلتے چلتے ہم ایک درخت کے پاس پہنچے۔ جہاں ایک آدمی سویا پڑا تھا اور درخت سے ایک بڑا سانپ نیچے اُتر رہا تھا تاکہ اس شخص کو ہلاک کرے۔ اس بچھّو نے سانپ کو ڈسا اور ہلاک کر دیا۔ ہمارے سامنے سے وہ بچھّو غائب ہو گیا اور سانپ اس آدمی کے پاس ہی مُردہ ہو کر گر پڑا۔ ہم نے نزدیک جا کر سانپ کو دیکھا تو تقریباً اڑھائی من وزن کا ہوگا۔ ہم نے کہا: جب وہ آدمی جاگے گا تو ہم دریافت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اسے بچایا ہے تو یہ ضرور کوئی بزرگ آدمی ہوگا۔ جب ہم اس کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شراب پی کر مست پڑا ہے اور قے کی ہوئی ہے۔ ہم از حد شرمندہ ہوئے اور کہا کاش ہم نہ ہی آتے تاکہ اس طرح کی حالت نہ دیکھتے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے شراب خوار اور نافرمان کو بچایا۔ ابھی یہ خیال پورے طور پر ہمارے دل میں نہ گذرا تھا کہ غیب سے آواز آئی کہ اے عزیزو! اگر ہم صرف پرہیزگاروں اور صالح آدمیوں کو بچائیں تو گنہ گاروں اور مفسدوں کو کون بچائے؟ ہم اسی گفتگو میں تھے کہ وہ مرد جاگ پڑا اور سانپ کو پاس مرا ہوا دیکھا تو بہت ہی حیران ہوا اور اس فعل سے توبہ کی۔ کہتے ہیں کہ وہ جوان خدا رسیدہ بن گیا اور ستر حج ننگے پانو کیے۔[1]

---

1. فوائد السالکین: ص ۶، ۷۔

اس روایت میں جو مبالغہ اور فوق الفطری عنصر ہے۔ اس کے علاوہ یہ لطیفہ بھی ہے کہ ابتدا میں حاضرینِ محفل کے نام گنائے ہیں تو ان میں خود قاضی حمید الدین ناگوری موجود ہیں۔ ان کے روبرو وہی واقعہ سنایا جارہا ہے جس کے مشاہدے میں وہ شریک تھے۔ پھر یہ محفل ۵۸۴ھ کی ہے جب باباصاحبؒ کی عمر ۱۰-۱۲ سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس میں وہ دعا کر رہے ہیں کہ "اے پروردگار! اگر ہم درویشی میں مکمل ہو چکے ہیں تو دریا ہمیں رستہ دے دے۔" فوائد السالکین کے مطابق اسی سال باباصاحبؒ نے قطب صاحبؒ سے بیعت بھی کی ہے، ابھی منازلِ سلوک ہی پورے نہیں ہوئے کہ درویشی میں "مکمل" ہونے کا حوالہ آگیا۔

جس شرابی کی جان بچانے کا قصّہ بیان ہوا ہے اس نے اس واقعے کے بعد ستّر حج ننگے پانو کر لیے تھے۔ گویا یہ قصّہ فوائد السالکین کی تالیف سے کم سے کم ستّر سال پہلے کا ہوا اور یہ ۵۱۴ھ کے مطابق ہو جاتا ہے جب باباصاحبؒ یا قاضی حمید الدین ناگوری تو کجا، قطب صاحبؒ، حضرت خواجہ غریب نواز اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

(۳) مبالغہ آرائی کی ایک اور مثال :

"ایک مرتبہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ وہاں پر شیخ برہان الدین نامی ایک بزرگ جو خواجہ ابوبکر شبلی کا غلام تھا اور از حد بزرگ تھا، خانۂ کعبہ کا طواف کرنے آیا تھا۔ ہم نے بھی اس کے پیچھے پیچھے اسی طرح طواف کرنا شروع کیا کہ جہاں وہ قدم رکھتا ہم بھی وہیں رکھتے۔ چوں کہ وہ پیر روشن ضمیر تھا سمجھ گیا۔ اس نے کہا میری ظاہری متابعت کیوں کرتے ہو، اگر کرنی ہے تو باطنی کرو اور جو ہمارا عمل ہے اس پر کاربند رہو۔ ہم دونوں نے اس سے پوچھا: آپ کون سا عمل کرتے ہیں؟ شیخ مذکور نے کہا کہ ہم ایک دن میں بیس ہزار مرتبہ قرآن شریف ختم کرتے ہیں۔ ہم دونوں نے اس بات سے بڑا تعجّب کیا کہ یہ بزرگوار کیا کہتا ہے۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید اس نے ہر سورت کا کوئی خاص حصّہ زبانی یاد کیا ہوگا۔ اتنے میں اس نے سر اٹھا کر مجھ سے کہا کہ خبردار! ایسا نہیں بلکہ ہم حرف بحرف کرتے ہیں۔"[۱]

غرض اس طرح کی مبالغہ آمیز حکایات اور تاریخی اعتبار سے غلط روایات ہی سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا انتساب جعلی ہے۔ نہ یہ قطب صاحبؒ کے ملفوظات ہیں اور نہ ان کے جامع حضرت بابا فریدؒ ہو سکتے ہیں۔

---

[۱] فوائد السالکین : ص ۱۰۔

# حضرت نظام الدین اولیاءؒ

## سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ملفوظات میں

**۱۔ مجالسِ حسنہ**

مجالسِ حسنہ حضرت شیخ حسن محمد چشتی[۱] علیہ الرحمۃ کے ملفوظات ہیں جن کے جامع اور مؤلف حضرت خواجہ شیخ محمد چشتی[۲] ہیں۔ اس میں صرف ۲۳ مجلسوں کے ملفوظات قلمبند ہوئے ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں ہے اور غالباً آج تک شائع نہیں ہوئی مگر اس کا اُردو ترجمہ جو کُل ۴۴ صفحوں میں آیا ہے عرصہ ہوا لاہور سے چھپ گیا تھا۔[۳]

اس کتاب میں اختصار کے باوجود بزرگان سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے حالات و سوانح سے متعلق مفید اشارات ملتے ہیں۔ اس کتاب کا حوالہ خواجہ گل محمد احمد پوری کی تالیف تکملہ سیر الاولیاء[۴] میں متعدد مواقع پر ملتا ہے مگر غلطی سے نام ہر جگہ مجالسِ حسینیہ لکھا ہے۔[۵]

آپ کا شجرۂ طریقت اس طرح ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ (متوفی ۷۵۷ھ) سے ان کے خواہر زادے شیخ کمال الدینؒ کو خلافت ملی تھی اور تکملہ سیر الاولیاء کے مطابق انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے بھی اجازت حاصل کی تھی، ان کا انتقال ۲۷ ذیقعدہ ۷۵۶ھ کو ہوا۔ دہلی میں اپنے پیر و مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو: تکملہ سیر الاولیاء، صفحات ۴۹-۵۳

[۲] حضرت شیخ محمد چشتی کے خلیفۂ اعظم شیخ یحییٰ مدنی تھے جن سے اجازت و خلافت حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (متوفی ۱۱۴۲ھ) کو حاصل تھی۔ (دیکھو مکتوبات کلیمی: مطبع یوسفی دہلی، طبع ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء، صفحات ۴-۵)

[۳] ملک فضل الدین وغیرہ تاجران کتب قومی، بازار کشمیری، لاہور۔ سنہ ندارد

[۴] مطبع رضوی دہلی، ۱۳۱۲ھ [۵] مثلاً: تکملہ سیر الاولیاء: صفحات ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۵ وغیرہ

انھوں نے اپنے بیٹے حضرت شیخ سراج الدین کو خلافت دی تھی جنھیں حضرت چراغ دہلی سے بھی خرقہ مِلا ہوا تھا۔ ان کا وصال ۲۱ر جمادی الاولیٰ ۸۱۷ھ کو ہوا اور نہروالہ (گجرات) کے محلہ برکات پورہ میں مدفون ہیں۔ ان کے فرزند شیخ علم الدین چشتی تھے جنھوں نے اپنے والد کے علاوہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے بھی خرقہ پایا اور ۲۶ر صفر ۸۱۹ھ کو انتقال فرمایا۔ اپنے والد کے جوار میں دفن ہوئے۔ ان کے فرزند اور جانشین حضرت شیخ محمود راجن چشتی (وفات ۲۲ر صفر ۹۰۰ھ) ہوئے۔ انھیں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بھی خرقہ ملا تھا۔[1] ان کے جانشین حضرت شیخ جمال الدین عرف شیخ جمنؒ ہوئے اور ان کے بھتیجے حضرت شیخ حسن محمد چشتی بن شیخ احمد عرف میاں جیو تھے جن کے ملفوظات مجالسِ حسنہ میں قلمبند ہوئے ہیں۔ شیخ حسن محمد سے خرقہ خلافت شیخ محمد چشتیؒ (جامع مجالسِ حسنہ) کو پہنچا، ان سے حضرت شیخ یحییٰ مدنی کو اور ان سے حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کو ملا

شجرۂ نسب جو شجرۂ طریقت بھی ہے، اس طرح ہے:[2]

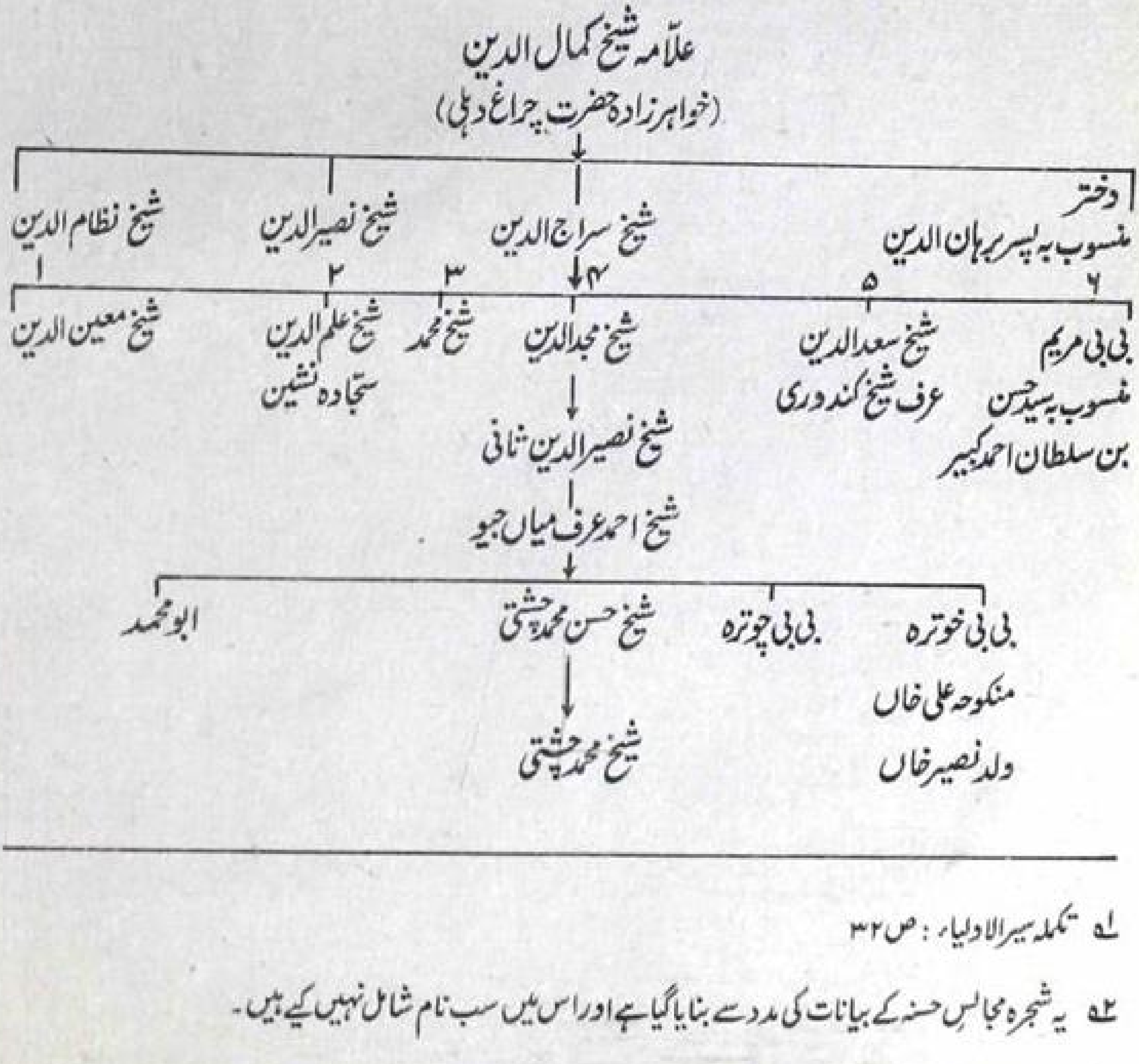


[1] تکملہ سیر الاولیاء: ص ۳۲

[2] یہ شجرہ مجالسِ حسنہ کے بیانات کی مدد سے بنایا گیا ہے اور اس میں سب نام شامل نہیں کیے ہیں۔

حضرت شیخ حسن محمد چشتی[۱] نے ۲۸ ذیقعدہ ۹۸۲ھ کو انتقال فرمایا۔ احمد آباد (گجرات) کے محلہ شاہ پور میں مدفون ہیں۔ انھوں نے بیشتر روایات اپنے والد بزرگوار شیخ احمد میاں جیوؒ سے سنی ہوں گی۔ اس لیے مجالس حسنہ میں جو سوانحی اشارے خاندان چشتیہ کے بزرگوں کے بارے میں ملتے ہیں وہ معتبر اور مستند ہیں۔

یہ ملفوظات مختصر ہیں۔ ان میں تعلیمِ سلوک بھی ہے، آدابِ درویشی کا بیان بھی اور سلسلے کے بزرگوں کے بارے میں سوانحی معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ ملفوظات کے دوسرے موضوع مجموعوں کے برخلاف اس میں فوق الفطری عنصر اور خوارق کا بیان تقریباً نہیں ہے۔

کتاب کے جامع شیخ محمد چشتی صاحب (وفات ۲۹ ربیع الاوّل) بھی احمد آباد میں مدفون ہیں۔ یہ صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کے چہل و دو رسائل مشہور ہیں۔ مگر اب بیشتر تصانیف ناپید ہیں۔ ان ہی میں سے ایک تالیف یہ مجالسِ حسنہ ہے جس میں انھوں نے اپنے والد بزرگوار اور پیر و مرشد شیخ حسن محمد چشتیؒ کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف فنِ سلوک میں آداب الطالبین ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے ذخیرۂ محمود شیرانی میں محفوظ ہے۔[۲]

مجالسِ حسنہ میں کتابوں کے حوالے بہت کم آئے ہیں۔ صرف ایک جگہ یوں ہے کہ نزہۃ الارواح میں سیدؔ حسن نے فرمایا ہے[۳] اس کے علاوہ حجۃ الاسلام غزالیؒ اور شیخ شہاب الدینؒ کے اقوال کا جہاں حوالہ ہے ممکن ہے کہ ان کی تصانیف سے ماخوذ ہو۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کے بزرگوں کی نظر سے فوائد الفواد نہ گذرے۔ شیخ حسن محمد چشتیؒ کے ملفوظات میں اس کتاب کا حوالہ تو کہیں نہیں آیا ہے مگر بعض باتیں صریحاً فوائد الفواد سے منقول ہیں۔ مثلاً:

---

[۱] یہ خود بھی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں: تفسیر محمدی، تقسیم الاوراد، حواشی تفسیر بیضاوی، حاشیہ قوت القلوب، حاشیہ شرح مطالع اور حاشیہ نزہۃ الارواح ان کی تصانیف ہیں۔ (برکاتِ اولیاء: افضل المطابع دہلی، ۱۳۲۲ھ، ص ۵۱)

[۲] فہرست مخطوطات شیرانی: ۲/۱۹۸ (طبع لاہور) ۱۹۶۵ء [۳] مجالسِ حسنہ: ص ۱۶ — اور غالباً اسی نزہۃ الارواح کی شرح شیخ حسن محمد چشتی نے لکھی تھی۔ اصل کتاب حسین بن عالم ابی الحسن حسینی کی تصنیف ہے۔ اس کے قلمی نسخے کتاب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کے تین نسخے موجود ہیں۔

" حکایت شیخ عثمان حرب آبادی رحمۃ اللہ علیہ در اُفتاد .... اگر کسے بیامدے و درم قلب بدو دادے وانچہ او پختہ بودے، بخریدے او آن درم بستدے اگرچہ بدانستے کہ قلب است بر روے خرندہ چیزے نگفتے و آنکہ درم سرہ بیاوردے او را نیز بدادے تا خلق را چنان معلوم شد کہ او قلب و سرہ را فرق نمی کند و بیشترے می آمدند و درم قلب را می دادند و او بجاے سرہ می گرفت و بایشان پیدا نمی کرد و طعام بدیشان می داد تا وقت نقل او شد۔ روے سوے آسمان کرد و گفت خداوندا تو دانا تری کہ خلق مرا درم قلب دادند و من بجاے سرہ قبول کردم و بر روے ایشان ردّ نکردہ ام اگر از من طاعت قلبی در وجود آمدہ است بکرم خود بر روے من ردّ مکن۔ "

(فوائد الفواد : ص ۵۳)

" فرمایا شیخ عثمان حرب آبادی رحمۃ اللہ علیہ بہت اعلیٰ درجے کے بزرگ تھے اور ان کی ایک معتبر تفسیر بھی ہے۔ وہ غزنی میں رہا کرتے تھے اور سبزی پکاکر فروخت کیا کرتے تھے اور اگر کوئی شخص کھوٹا درم دے کر سبزی خرید لیتا تو وہ کھوٹا درم بھی لے کر خاموش ہو جاتے تاکہ خلقت کو معلوم نہ ہو کہ یہ کھوٹے کھرے میں تمیز کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے آدمی اسے کھوٹے درم دے کر سبزی خرید لے جاتے۔ ایک مرتبہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آسمان کی طرف مُنہ کرکے اور صدق دل سے کہا: اے خداوند تعالیٰ! تجھے معلوم ہے کہ میں نے کھوٹے درموں کو ردّ نہیں کیا، اگر مجھ سے بھی کوئی کھوٹی طاعت ظاہر ہوئی ہو تو تُو اپنی مہربانی سے ردّ نہ کر۔"

(مجالسِ حسنہ : ص ۱۵)

اسی طرح ایک مجلس میں شیخ سعد الدین حمویہؒ کا قصّہ بیان ہوا ہے، یہ بھی فوائد الفواد سے ماخوذ ہے اور ۹ر ذی الحجہ ۷۱۴ھ کی مجلس میں ملتا ہے[۱]

یہاں مجالسِ حسنہ سے صرف وہ حصّے اقتباس کیے جاتے ہیں جن میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ یا ان کے جانشین حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کا حوالہ آیا ہے۔

مجالسِ حسنہ میں ان بزرگوں سے متعلق بعض نئے اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) اس کتاب سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ بغیر شیرازے کی کلاہ نہیں باندھتے تھے کیونکہ ان کے شیخ نے بھی ایسی کلاہ استعمال نہیں کی تھی۔

---

[۱] فوائد الفواد : صفحات ۲۲۲-۲۲۱

(۲) دوسرا واقعہ جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حوضِ شمسی پر حضرت نماز میں مشغول تھے، کچھ لوگوں نے آپ کی دستار کی وضع سے یہ سمجھا کہ یہ نقشبندی سلسلے کے درویش ہیں۔ آپ نے سلام پھیر کر اپنی دستار مبارک اُتاری اور اسے اپنے شیخ کے طریقے سے باندھا۔ یہ بات دُررِ نظامیہ اور سیر الاولیاء میں بھی ملتی ہے مگر یہ اشارہ اسی کتاب سے ملا ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدینؒ "فیل گوشی" وضع کی دستار باندھتے تھے۔

(۳) اس کے ساتھ ہی حضرت برہان الدین غریبؒ کے لباس کی وضع بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے شیخ کے اتباع میں اس طرح پگڑی باندھتے تھے کہ ایک کان ڈھکا رہتا تھا۔

(۴) مجالسِ حسنہ ہی سے یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ نے بابا صاحبؒ کو دعا دی تھی کہ آپ کی نسل بہت ہوگی۔

**کلاہ کی وضع**

(۱) فرمایا کہ ایک روز شیخ الاسلام نظام الحق والدین محمد احمد بدایونی قدس اللہ روحہٗ جمعہ کی نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ جب آپ لباس پہن چکے تو خادم کلاہ لایا جس کے بند میں شیرازہ نہ تھا، آپ نے نہ پہنی اور خادم کے ہاتھ واپس کر کے فرمایا کہ ہمارے خواجہ بابا فریدؒ نے کبھی بغیر شیرازے کے نہیں پہنی۔ ہم کس طرح پہنیں؟[۱]

**فیل گوشی دستار**

(۲) فرمایا: ایک روز شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہٗ حوضِ شمسی پر نماز ادا کر رہے تھے، چند درویش آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ جو آدمی نماز میں مشغول ہے یہ "بہاء الدینی" معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے نے پوچھا: یہ کس طرح معلوم ہوا؟ اس نے کہا کہ پگڑی کی بندش سے معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد شیخ الاسلام نے دستار سر سے اُتار کر حضرت فرید الدین قدس اللہ سرہٗ کے طریق کے موافق باندھی یعنی فیل گوشی باندھی۔ فیل گوشی پگڑی کی وہ بندش ہے جس میں کور پر کور آتی ہے۔[۲]

**محبوب الٰہیؒ کی وضع**

(۳) فرمایا کہ حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ کے مرید ایک کان پگڑی کے نیچے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک روز جب شیخ الاسلام نظام الحق والدین محمد بدایونی رضی اللہ عنہ کو شیخ برہان الدین نے دیکھا کہ ایک کان

---

[۱] مجالسِ حسنہ: ص ۹ [۲] ایضاً: ص ۹ ؛ دیکھو: دُررِ نظامی ؛ سیر الاولیاء

پگڑی سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اسی روز سے شیخ برہان الدین غریبؒ نے بھی اسی طرح پگڑی باندھنی شروع کی، اس لیے ان کے مرید بھی اسی طرح باندھتے ہیں۔ فرمایا کہ شیخ جمال الحق والدین محمد عرف شیخ جمنؒ کے ملفوظات سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد یعنی شیخ محمود عرف راجنؒ کی زبانِ مبارک سے سُنا کہ خواجہ یعقوبؒ کے مریدوں میں سے ایک مرید کہتا تھا کہ جب شیخ برہان الدین[1] نے شیخ نظام الدینؒ کی پیروی کر کے ایک کان دستار میں ڈھانپا تو بہت حضوری حاصل ہوئی۔ کاش وہ دوسرے کان کو بھی ڈھانپ لیتے تاکہ اس سے بھی زیادہ حضوری حاصل ہوتی۔[2]

**واسکٹ کا عطیہ**

(۴) فرمایا: ایک روز شیخ احمد پٹوہؒ شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس سرہ کی خدمت میں آئے اور واسکٹ کے واسطے التماس کی۔ بندگی شیخ نے واسکٹ مرحمت فرمائی اور بیعت اور بالوں کا کترنا نہ ہوا۔ شیخ الاسلام شیخ نظام الدینؒ کی وفات کے بعد شیخ احمد پٹوہؒ دہلی میں آئے اور بندگی قطب الاقطاب شیخ نصیر الدین محمودؒ سے ملاقات کی اور بیعت کی التماس کی۔ شیخ نے فرمایا کہ تو کسی پر ارادت رکھتا ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ سے واسکٹ عنایت ہوئی تھی لیکن بیعت نہیں کی تھی۔ پس شیخ نے فرمایا کہ کوئی ضرورت نہیں وہی بیعت تھی۔[3]

**اہل اللہ**

(۵) ایک لاہوری آدمی آیا اور اس نے کہا کہ اس زمانے میں کوئی اہل سماع (سننے والا) نہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر اہل اللہ نہ ہوں تو دُنیا ہلاک ہو جائے۔ پس اس آدمی نے کہا جیسا کہ گذشتہ زمانے میں شیخ نصیر الدین، شیخ نظام الدین، شیخ فرید الدین گنج شکر قدس اللہ اسرارہم وغیرہ تھے۔ اب ان جیسا کوئی بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اُس زمانے میں بھی لوگ ایسا ہی کہا کرتے تھے۔[4]

**قطب صاحبؒ اور سماع**

(۶) آپ نے فرمایا کہ بعض مردانِ خدا سماع ہی میں فوت ہو گئے! اس کے بعد فرمایا کہ حضرت قطب الدین رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہینے میں (مراد ربیع الاوّل) ان دو بیت کا سماع سنتے تھے:

---

[1] مجالسِ حسنہ میں یہاں برعکس کر دیا ہے کہ "شیخ نظام الدینؒ نے شیخ برہان الدینؒ کی پیروی کر کے ....." غالباً یہ مترجم کا سہو ہے۔ اصل فارسی عبارت تکملہ سیر الاولیا میں ملے گی۔ [2] مجالسِ حسنہ: صفحات ۹-۱۰ [3] ایضاً: صفحات ۱۴-۱۵ [4] ایضاً: ص ۱۹

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر است
عقل کے داند کہ این رمز از کجاست این حکایت را بیانے دیگر است

نماز کے وقت ہوشیار ہو کر نماز ادا کرتے اور پھر سماع میں مشغول ہو جاتے، حتیٰ کہ بدن سے خون جاری ہوگیا اور دُنیا سے کوچ کر گئے۔ آپ عشق میں ایسے جلے کہ غسل دیتے وقت جب آپ کے جسمِ مبارک پر پانی ڈالا گیا تو گوشت پارہ پارہ ہوگیا۔

فرمایا کہ حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب ہم نے سُنا کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے زمانے میں ایک مردِ خدا (سماع ہی میں) فوت ہوگیا تو دل میں شوق ہوا کہ کوئی ایسا آدمی ملے جو اس مجلس میں حاضر تھا تاکہ اس سے اس مرد کا حال معلوم ہو جائے۔ پس ہم اس شہر میں گئے جہاں یہ واقع ہوا تھا۔ بڑی تلاش اور جستجو کے بعد ایک آدمی سے ملاقات ہوئی، جس نے کہا کہ میں مجلس میں حاضر تھا۔ وہ ایک اندھا بوڑھا آدمی تھا۔ ہم نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ سماع میں ایسے محو ہو گئے کہ سماع ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا اور ایسے جل گئے کہ پانی ڈالتے وقت آپ کا گوشت مبارک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔[1]

### باباصاحبؒ کو غریب نوازؒ کی دعا

(۷) جب قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ درویشوں کو چاہیے کہ اپنے پاس مال نہ رکھیں۔ آپ نے فرمایا کہ سلطان ابوسعید گازرونیؒ کے پاس بہت مال تھا اور شیخ بہاء الدینؒ بھی مالدار تھے۔ اس کے بعد فرمایا کہ درویشوں کے طریقے ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ فرید گنج شکرؒ کی اولاد زیادہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی تنگی تھی۔ اس کے بعد ایک نے پوچھا کہ شیخ فریدالدینؒ کی اولاد زیادہ کیوں تھی؟ آپ نے فرمایا کہ ایک روز حضرت خواجہ معین الدینؒ اجمیر کی راہ دہلی آئے[2] خواجہ قطب الحق والدینؒ دھلی میں تھے۔ خواجہ معین الدینؒ نے خواجہ قطب الدینؒ سے ملاقات کی، کچھ مدت کے بعد اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔

---

[1] مجالسِ حسنہ : صفحات ۱۹-۲۰

[2] حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کا یہ سفر ۶۳۳ھ میں ہوا تھا اور اس کے ایک ہی سال کے بعد خواجہ غریب نواز اور خواجہ بختیار کاکی (قدس اللہ اسرارہما) کا وصال ہوگیا۔ اس سفر کی تفصیل قدیم کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن شاید یہ اور کسی نے نہیں لکھا کہ خواجہ غریب نوازؒ نے باباصاحبؒ کو افزایشِ نسل کی دعا دی تھی۔

خواجہ قطب الدینؒ بھی ہمراہ ہولیے۔ وہ تمام آدمی جو خواجہ قطب الدینؒ کے ہمراہ تھے، خواجہ معین الدینؒ کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے اور حضرت فرید الدینؒ خواجہ قطب الدینؒ کی طرف توجہ کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے خواجہ معین الدینؒ کی طرف توجہ ترک نہیں کی تھی اور خواجہ معین الدینؒ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ خواجہ قطب الدینؒ نے فرمایا کہ یہ بھی آپ کا غلام ہے۔ پس خواجہ معین الدینؒ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ بہت بڑا ہوگا۔ کلاہ منگا کر ایک طرف سے آپ پکڑی اور دوسری طرف سے خواجہ قطب الدینؒ کے ہاتھ دے کر شیخ فریدؒ کے سر پہنائی اور فرمایا کہ اس کی نسل بہت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑا کرے گا۔ اس سبب سے شیخ فرید الدینؒ کی نسل زیادہ تھی۔[1]

**محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ**

(۸) فرمایا کہ شیخ کمال الحق والدینؒ کی والدہ شیخ نصیر الحق والدینؒ کی حقیقی بہن تھیں۔ آپ زمانے کی رابعہ تھیں اور اودھ میں وفات پائی۔ اور شیخ کلاں سے تھیں۔ پہلے آپ کی سکونت اودھ میں تھی، پھر جب حضرت شیخ نصیر الدینؒ سلطان المشائخ نظام الدینؒ کی اجازت سے دہلی میں مقیم ہوئے تو تمام اہل و عیال اودھ سے آگئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور شیخ کمال الدینؒ تمام علوم میں ماہر تھے، چنانچہ مولانا احمد تھانیسریؒ، مولانا عالم پانی پتیؒ، مولانا عالم سنگریزہ ملتانیؒ اور تاتار خاں مرحوم آپ کے شاگرد تھے۔ اور مخدوم جہانیاں سیّد جلال الحق والدین بخاری قدس سرہ العزیز نے بھی حضرت شیخ کمال الدینؒ سے علم حاصل کیا اور جامع العلوم میں لکھا ہے کہ "میں نے شرح مشارق حضرت شیخ کمال الدینؒ سے پڑھی ہے"۔[2]

**مخدوم جہانیاںؒ کا بیان**

(۹) نقل ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ ایک دفعہ چاشت کے وقت خلوت میں تھے۔ اپنے چند یاروں کے ساتھ خوش و خرّم بیٹھے تھے۔ اور جیسے دوست دوست کے ساتھ بات چیت کرتا ہے۔ آپ نے کہا کہ سنو! میں تمہیں ایک بات سُناتا ہوں کہ شروع شروع میں میں کیا دیکھتا ہوں کہ سلطان محمد نے دُعا گو اور ابوسعید بن شیخ جلال الدینؒ ساکن اُچّہ کو شہر میں طلب کیا۔ میرے مخدوم والد بزرگوار دامت برکاتہ، نے اجازت دی کہ شہر اُچّہ جاؤ۔ حکم کا بجا لانا واجب ہے، اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ جب میں آیا تو شیخ الاسلام شیخ نصیر الدینؒ کی

---

[1] مجالسِ حسنہ: صفحات ۲۸، ۲۹ [2] ایضاً: صفحات ۳۱، ۳۲

خانقاہ میں اُترا تو میرے لیے حجرہ مقرّر کر کے شیخ نے اپنے بھانجے شیخ کمال الدینؒ کے پاس جو حاجب تھا، لے جاکر فرمایا کہ پڑھ! اور مولانا شمس الدینؒ نے ان سے شرح مشارق سنی ہے۔ اور پڑھنے والے جمال الدینؒ تھے۔ اور شیخ جمال الدینؒ نے شیخ نظام الحق والدین محمد بدایونیؒ سے بھی خلافت حاصل کی ہے اور حضرت شیخ نصیر الحق والدینؒ سے بھی۔ ان کی نظر مبارک کی برکت سے آج تک مشیخت کا سجّادہ ویسے کا ویسا شیخ کمال الدینؒ کی اولاد میں سلسلہ وار چلا آتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابد تک اسی طرح رہے[۱] آمین یا ربّ العالمین!

### شیخ کمال الدینؒ کا مرتبہ

اور پہلے محققین سے حضرت نصیر الدین محمودؒ شیخ کمال الدینؒ کی بہت تعظیم بجا لاتے اور جوں ہی شیخ کمال الدینؒ کی دستار مبارک دیکھتے تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے اور نیز شیخ جمنؒ نے بھی فرمایا ہے کہ ملک صدر جہاں بن مولانا خواجہ کندوری بن شیخ سرالدین محمدؒ سے میں نے سُنا ہے کہ شیخ ابوالفتحؒ کی مجلس میں جب بندگی شیخ راجنؒ تشریف لاتے تو جس وقت آپ کا رُخِ مبارک دیکھتے کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ جس جگہ شیخ نصیر الدین محمودؒ شیخ کمال الدینؒ کی دستار مبارک دیکھ لیتے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور شیخ جمنؒ کی والدہ شیخ عزیز اللہؒ کی بیٹی تھیں۔ آپ کا اسم مبارک بی بی در ملکؒ تھا۔ یہ صالح اور پرہیزگار تھیں۔ اور سیّد السادات سیّد محمد گیسو دراز قدّس اللہ سرّہ العزیز نے اپنی تالیفات میں شیخ کمال الدینؒ کے مناقب بہت درج فرمائے ہیں۔ اپنے عہد میں وہ زمانے کے پیشوا تھے۔ ابوالمظفر سلطان فیروز شاہ انار اللہ برہانہٗ اور اس کے امیر اور وزیر حضرت شیخ کمال الدینؒ پر بہت توجّہ رکھتے تھے[۲]

(۱۰) آپ نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ کمال الدینؒ کو خانہ کعبہ اور رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روضہ مبارک کی زیارت کا بہت اشتیاق ہوا تو سلطان المشائخ شیخ نظام الدین قدّس اللہ سرّہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر خانہ کعبہ کی زیارت کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت شیخ نظام الدینؒ نے آپ کو اجازت عنایت فرمائی اور اپنا پہنا ہوا جامہ پہنایا اور اپنی جگہ پر بٹھا کر خلافت نامہ مرحمت فرمایا۔ شیخ کمال الدینؒ نے سلطان المشائخؒ کے قدم مبارک پر سر رکھا اور روانہ ہوئے۔ شیخ نظام الدینؒ کی نظر مبارک

---

[۱] حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ملفوظات جامع العلوم اور سراج الہدایہ میں شیخ کمال الدینؒ کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ پہلی کتاب کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ [۲] مجالسِ حسنہ: صفحات ۳۲-۳۳

کی برکت سے خانہ کعبہ کی زیارت حاصل ہوئی اور سات حج کیے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بیت المقدس کی زیارت کی اور خراسان کی طرف واپس چلے گئے۔ مُلکوں . ور ولایتوں کے بادشاہ شیخ کمال الدینؒ کی زیارت کے لیے آتے اور تعظیم بجا لاتے۔ آپ بہت مال و اسباب لائے، چنانچہ جب آپ دہلی میں تشریف فرما ہوئے تو آپ کے علاوہ اور اسباب کے تیرہ گوتیں (بوریاں) سونے اور چاندی کی تھیں۔ جب شیخ نصیر الدین محمودؒ نے تیرہ اونٹ مال و اسباب کے لدے ہوئے دیکھے تو فرمایا: شیخ کمال الدین! اتنی دُنیا تو نے کس واسطے جمع کی ہے؟ شیخ کمال الدینؒ نے کہا: میں نے راہ میں سُنا تھا کہ سلطان المشائخ شیخ نظام الدینؒ رحلت فرما گئے ہیں اور شیخ نصیر الدین محمود سجّادے پر بیٹھے ہیں۔ اگر میں خالی ہاتھ جاؤں گا تو میری اہانت ہوگی، اس واسطے میں لایا ہوں۔ اب میں اسے عالموں اور صالحوں پر خرچ کروں گا اور اپنے پاس کچھ نہ رکھوں گا۔ چنانچہ اسی طرح آپ نے کیا کہ سونے کی تھیلی کا مُنھ بند کر کے اس پر سیاہی مل کر فرماتے کہ یہ سیاہی ہے اس کو قبول کرو۔ اسی طرح تیرہ کے تیرہ اونٹ کا مال و اسباب عالموں، مسکینوں اور نیک لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے پاس کچھ نہ رکھا۔ اس کے بعد تاتار خاں نے اسّی ٹکے (تنکے؟) روزینہ بادشاہی کچہری سے لکھوا کر لا دیا۔ شیخ کمال الدینؒ اسے شیخ نصیر الدینؒ کے پاس لے گئے اور عرض کی کہ کیا حکم ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ جب بغیر قصد اور طلب کے تمھیں ملتا ہے تو یہ بمنزلہ فتوح کے ہے اسے قبول کرو۔

شیخ کمال الدینؒ نے وظیفہ قبول کر لیا۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کی مبارک نظر کی برکت سے شیخ کمال الدینؒ زاہد عابد اور پیشوائے زمانہ ہوئے۔[1]

---

[1] مجالس الحسنہ: صفحات ۳۳-۳۴

اس کے بعد مجلس ۱۸ میں مولانا سنگریزہ ملتانیؒ سے مولانا کمال الدینؒ کی ملاقات کا حال بیان ہوا ہے۔ اس مجلس میں ہے کہ شیخ لطف الدینؒ سفرِ حج میں مولانا کمال الدینؒ کے رفیق تھے اور وہیں یہ عہد کیا تھا کہ اگر ہم عیال دار ہوئے اور ہماری اولاد ہوئی تو آپس میں رشتہ داریاں ہوں گی۔ (مجالس الحسنہ: ص ۳۸)

آگے وہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ شیخ کمال الدینؒ شادی کے بعد چھ سال تک اپنی بیوی کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ نے بشارت دی کہ اس کے بطن سے اولیاء اللہ پیدا ہوں گے۔

## ۲۔ کشکول کلیمی

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ[۱] (متوفی ۱۱۴۲ھ) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدّد ہیں۔ کمالاتِ باطنی کے علاوہ علومِ شریعت میں بھی مقتدائے زمانہ تھے۔
ان کی تصانیف میں سوا، السبیل، کشکول، مکتوباتِ کلیمی وغیرہ معروف ہیں جو اگرچہ شائع ہو چکی ہیں مگر آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ ان کے کشکول[۲] میں صرف ایک مقام پر حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کا نام مبارک آیا ہے۔ اور یہ بیان خاصا اہم ہے۔ اس سے بابا صاحبؒ کے پنجابی کلام کی سند بھی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

"حضرت شیخ الشیوخ شکر گنج قدّس سرّہ نے زبان پنجابی میں ذکر کیا ہے: 'اہ ول توں' اس سے جانب علویات اشارہ ہے۔ 'اہ ول توں' جانب سفلیات اشارہ ہے۔ توہیں توُں یہ اشارہ جانب اطلاق ہے۔"[۳]

اسی وجہ سے خود حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے بھی تلقین کی ہے:

"اگر مرید عجمی مرد ہو، اس کو ذکر اس کی زبان مادری میں تلقین کرنا چاہیے کہ عمدہ فائدہ پہنچے گا۔"[۴]

## ۳۔ مکتوباتِ کلیمی

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے مکتوبات، جن کا بیشتر حصّہ حضرت کے خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے نام ہے، ۱۳۰۱ھ میں مطبع یوسفی دہلی سے طبع ہو چکے ہیں۔ چشتی نظامی سلوک کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ خطوط نہایت اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مکتوبات میں صرف دو جگہ حضرت بابا شیخ فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کا حوالہ آیا ہے۔ ایک موقع پر بابا صاحبؒ کا وہ عربی خط نقل ہوا ہے جو انھوں نے کسی شخص کی سفارش کرتے ہوئے سلطان بلبن کو لکھا تھا[۵] اور یہاں اس کی عبارت قدرے مختلف ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے یہ محض یادداشت سے لکھا ہے۔ خط کی شکل اخبار الاخیار میں ملے گی۔[۶]

---

[۱] حضرت شیخؒ کے حالات صوفیائے کرام کے تمام تذکروں میں ملیں گے لیکن پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ مشائخ چشت میں موجود ہیں۔ مزید مطالعے کے لیے اس کتاب سے رجوع کیا جائے۔

[۲] کشکول کلیمی کا اُردو ترجمہ غلام احمد بریاں جھجری نے شائع کیا تھا وہی ایڈیشن ہمارے سامنے رہا ہے۔

[۳] کشکول کلیمی (اُردو ترجمہ): ص ۲۵ [۴] ایضاً: ص ۱۹

[۵] مکتوباتِ کلیمی (مطبع یوسفی دہلی، ۱۳۰۱ھ) ص ۱۵ [۶] اخبار الاخیار (مطبع مجتبائی دہلی) ص ۵۴

دوسرا حوالہ بہت دلچسپ ہے:

"شیخ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ می فرمود کہ روز قیامت اگر حضرت جلّ شانہ بصورت خواجہ قطب الدینؒ کہ پیر من است تجلّی خواہد کرد خواہم دید والّا نہ"۔ [۱]

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن حضرت جلّ شانہ (خدا) اگر میرے پیر خواجہ قطب الدینؒ کی صورت میں جلوہ گر ہوگا تو میں دیدارِ باری کروں گا ورنہ نہیں۔

اس سے اپنے شیخ کی عقیدت و محبّت کا کمال ظاہر ہے۔ اور حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے بھی متعدّد مواقع پر یہی لکھا ہے کہ تصوّف کا اصل الاصول محبّتِ پیر ہی ہے۔

کشکول میں ایک جگہ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے اسمائے الٰہی میں سے "علیم و سمیع و بصیر" کا مراقبہ بتایا ہے جو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے محبوب الٰہیؒ سے نقل کیا ہے اور عین ممکن ہے کہ انھیں اپنے شیخ سے پہنچا ہو۔ وہ یہ ہے:

"نماز کے تشہّد کی طرح بیٹھے اور ملاحظہ اسم عَلِیْمٌ وَ سَمِیْعٌ وَ بَصِیْرٌ کا شیخ کی صورت کے ساتھ کرے اور ملازمت سب حال کی کرے اور جب اس میں استقامت ہو اسی ہیئت پر بیٹھا رہے اور چشم باطن دل کی طرف رکھے اور خیال کرے کہ حق سبحانہ جل شانہ کو دیکھتا ہوں اور نظر آسمان کی طرف رکھے پھر آنکھیں کھول کر تصوّر کرے کہ میری روح قالب سے باہر ہوگئی اور آسمانوں سے گذر گئی اور حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہوئی۔ اگر کسی کو اس کام میں استقامت ہو جاوے تو اس وقت ایک دھاگا سبز ظاہر ہوگا۔ ایک سرا اس کا ساتوں آسمان سے اوپر ہوگا اور دوسرا سالک کے دل میں ہوگا۔ اعلیٰ مرتبہ اس فکر کا یہی ہے اور مشائخ جو پوشیدہ مشغول رکھتے ہیں وہ یہی ہے۔ اوّل کو مراقبہ، دوسرے کو مشاہدہ، تیسرے کو معائنہ کہتے ہیں۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی قدس سرہ ان اشغال کو حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ سے نقل کرتے ہیں"۔ [۲]

---

[۱] کشکول کلیمی: ص ۱۹ [۲] کشکول کلیمی (اردو): صفحات ۲۹-۳۰

## ۴۔ خلاصۃ الفوائد

حضرت شیخ فخر الدین نظامی محب النبی رحمۃ اللہ علیہ (۲۷، جمادی الآخر ۱۱۹۹ھ) کے زمانے میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے خلفاء میں حضرت میاں نور محمد مہاروی[لہ] رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلہ کی توسیع و تبلیغ پنجاب میں کی۔ میاں نور محمد مہارویؒ کے ملفوظات قاضی محمد عمر حکیم نے خلاصۃ الفوائد کے نام سے جمع کیے تھے۔ چنانچہ خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے:

"قاضی محمد عمر حکیم مرحوم چند ملفوظ آن حضرت آوردہ کہ دل را نظارت (نضارت؟) و دیدہ را بصارت ازان حاصل می شود"۔[لہ]

چنانچہ اس کتاب سے متعدد اقتباسات تکملہ سیر الاولیاء میں لیے گئے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے خلاصۃ الفوائد ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کے دو قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ذخیرۂ محمود شیرانی میں پائے جاتے ہیں۔ ایک ناقص قلمی نسخہ میرے پاس ہے، جس کی تکمیل دوسرے نسخوں کے دستیاب ہونے پر منحصر ہے۔ اس میں جا بجا حضرت شیخ فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ سے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ ان کو یہاں اقتباس کیا جاتا ہے۔ یہ پہلی بار شائع ہو رہے ہیں:

۱۔ "فرمودند کہ در لنگر حضرت شیخ فرید گنج شکر رضی اللہ عنہ میوہ و گل درختانِ شور و تلخ درویشان را می دادند۔ ہم درین باب فرمودند کہ روزے دو شخص آمدہ در خدمت حضرت بابا صاحب گنج شکر قدس سرہٗ عرض کردند کہ ما را بیک دیگر معاملۂ ہست کسے را امر فرمایند کہ اظہار ما ہر دو شنیدہ بانفصال آن پردازد۔

(حضرت میاں نور محمد مہارویؒ نے) فرمایا کہ حضرت شیخ فرید گنج شکر رضی اللہ عنہ کے لنگر میں (خشک) میوہ اور کھاری اور کڑوے درختوں کے پھول (پیلو اور کریل) درویشوں کو دیے جاتے تھے۔ اسی ضمن میں یہ فرمایا کہ ایک دن حضرت بابا صاحب گنج شکر قدس سرہٗ کی خدمت میں دو شخصوں نے آکر عرض کیا کہ ہمارے درمیان ایک جھگڑا ہے۔ آپ کسی کو حکم دیجیے کہ ہم دونوں کے بیانات سن کر فیصلہ کر دے۔

---

لہ آپ کے حالات تکملہ سیر الاولیاء: صفحات ۱۲۱ - ۱۳۶ میں موجود ہیں۔

لہ تکملہ سیر الاولیاء: ص ۱۲۲

پس حضرت بابا صاحبؒ شیخ نظام الدین و شیخ بدرالدین اسحٰق را رضی اللہ عنہما. حکم فرمودند کہ از ایشان مدّعاے ہر واحد شنیدہ۔ بحسب شرع شریف انصرامی آن نمایند. پس ہر دو بزرگواران کہ از خلفاے عظام و علماے متبحرّ بودند۔ بحسب امتثال امرِ شیخ خود معاملہ از ہر دو شنیدہ متعجّب شدہ باز۔ بخدمت شیخ رسیدہ معروض داشتند کہ ایشان با یکدیگر نحوے گفتگو کردہ اند کہ از استماع آن در رقص و گریہ آمدہ ایم. بس شیخ قدّس سرّہٗ در جواب فرمود کہ این ہر دو فرشتہ بودند برائے تعلیم شما آمدہ بودند پس شما را باید کہ فیما بین خود چنین لطف و نرمی با وجود نزاع در معاملہ می کردہ باشید[1]"

پس بابا صاحبؒ نے شیخ نظام الدین اور شیخ بدرالدین اسحٰق کو اللہ تعالیٰ ان دونوں سے راضی ہو حکم فرمایا کہ ان دونوں سے ان کا مدّعا سُن کر شرع کے مطابق طے کر دو۔

دونوں بزرگوں نے جو (بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے) خلفاے عظام میں سے تھے اور (شریعت کے) عالم متبحرّ بھی تھے، اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کا جھگڑا دونوں شخصوں سے سُنا اور تعجبّ کرتے ہوئے پھر شیخ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ انھوں نے آپس میں اس طرح بات چیت کی ہے کہ ہم پر اسے سُن کر رقص اور گریہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ شیخ قدّس سرّہٗ نے جواب میں عرض کیا کہ یہ دونوں فرشتے تھے جو تمھیں تعلیم دینے کے لیے آئے تھے۔ لہٰذا تمھیں بھی چاہیے کہ آپس کے جھگڑوں کو اسی طرح لطف اور نرمی سے طے کیا کرو۔

دو درویشوں کا یہ واقعہ فوائد الفواد اور سیرالاولیاء میں بھی نقل ہوا ہے۔ دوسرے مجموعوں میں بھی ملتا ہے

۲۔ فرمودند کہ حضرت محبوب الٰہی در خدمت حضرت فریدالدین گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بشرف بیعت از دہلی آمدہ بہرہ مند

فرمایا کہ حضرت محبوب الٰہی حضرت فریدالدین گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں دہلی سے آ کر شرف بیعت سے مشرّف ہوئے۔

---

[1] خلاصۃ الفوائد (قلمی)

گردید باز در دہلی رفت نزد بقالے کہ ازو قرض برداشتہ بود پیشتر در ادائے آن تہاون می فرمودند این بار خود بخود رفتہ از عہدۂ نصف آن خود را خلاص نمودند بقال حیران گشتہ ازان پرسید کہ چندین روز کجا رفتہ بودی؟ فرمود در اجودھن گفت از جاے اسلام آمدی تا این کار کردی۔ و پس این بیت فرمودند:

سالکا! اسلام گر آسان بدے
ہر کسے چون شبلی و ادہم شدے[1]"

۳۔" در کتابے این بے ہیچ نوشتہ دیدہ کہ حضرت بابا صاحب فریدالملۃ والدین رضی اللہ عنہ در اول وقت قبل از بیعت پیر می فرمودند برائے ملاقات درویشے کہ بر سر کوہ بلند مکان خود کردہ و کنج گزین از خلق شدہ بود رفت بعد از حکایات کہ فیما بین کردند فرمودند کہ درین جا سبب روزی شما چیست؟ و بچہ وجہ می رسد۔ آن درویش ہم برآمد (کذا) فرمودند کہ این سنگ را بردار و بر دیگرے بزن۔ حضرت فرمودۂ

پھر دہلی گئے تو ایک بنیا تھا جس سے آپ نے قرض لے رکھا تھا اور اس کے ادا کرنے میں ڈھیل ہوتی رہتی تھی۔ اب آپ خود بخود اس کے پاس گئے اور آدھا قرض ادا کر دیا۔ بنیا حیران ہوا اور پوچھا کہ آپ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ فرمایا: اجودھن میں۔ کہنے لگا کہ ٹھیک ہے "اسلام" کے گھر سے آرہے ہو جبھی تو تم نے ایسا کیا۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

اے سالک! اگر اسلام آسان بات ہوتی تو ہر شخص خواجہ شبلی اور ابراہیم ادھم بن جایا کرتا۔

اس فقیر نے ایک کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ حضرت بابا شیخ فریدالملۃ والدین رضی اللہ عنہ اپنے پیر سے بیعت ہونے سے پہلے کسی درویش سے ملنے گئے جس نے ایک اونچے پہاڑ پر اپنا گھر بنایا تھا اور خلق سے کنارہ کشی کر کے بیٹھ گیا تھا۔ آپ نے آپس کی بات چیت میں اس سے پوچھا کہ یہاں آپ کی روزی کا کیا ذریعہ ہے؟ اور وہ کس طرح پہنچتی ہے؟ اس درویش کو غصہ آگیا اور کہا کہ یہ پتھر (جو سامنے پڑا ہے) اٹھاؤ اور اسے دوسرے پتھر پر مارو۔ حضرت نے اس کے کہنے

[1] خلاصۃ الفوائد (قلمی)

او بجا آورد. اتفاقاً ازان میان کہ سنگ شکستہ شد کرمے با برگ گیاہ سبز در دہان داشت بر آمد. پس گفت درین جا خدائے تعالیٰ این را روزی می رساند و مرا نمی رساند؟"[1]

کے مطابق کیا۔ اتفاقاً جیسے ہی وہ پتھر درمیان سے ٹوٹا، ایک کیڑا جس کے مُنھ میں سبز گھاس کا تنکا تھا، نکل آیا۔ اس فقیر نے کہا کہ جب یہاں خدا اس کیڑے کو روزی پہنچاتا ہے تو کیا مجھے نہیں دے گا؟

یہ واقعہ غالباً حضرت شیخ نور محمد مہارویؒ کا ملفوظ نہیں ہے بلکہ قاضی محمد عمر حکیم جامع ملفوظات نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ یہ واقعہ راحت القلوب[2] میں ملتا ہے اور اس کا درست ہونا بہت مشتبہ ہے۔

۴۔ "حضرت من فرمودہ است کہ از اخلاق درویشان است اگر کسے را اذیت و درد رسد او را مثل او درد می رسد چنانچہ درویشے در خدمت سلطان المشائخ رضی اللہ عنہ نشستہ بود از خادم ایشان حرکتے صادر شد کہ در نظر سلطان صاحب ناپسند آمد بدن او را بہ سوط مؤلم کردند پس دران ساعت آن درویش را مانند آن بر بدن مبارک اثر ضرب ظاہر شد. پس فرمودند این معنی از مر غلبہ وحدت وجود می باشد ازان کہ نزد ایشان وجود واحد است و این کثرت وہمی کہ نمودار است از شیونات و صفات آن متصوّر است."[3]

میرے حضرت نے فرمایا ہے کہ درویشوں کا اخلاق یہ ہے کہ جب کسی کو درد اور اذیت پہنچتی ہے تو انھیں بھی اس کی جیسی ہی تکلیف ہوتی ہے، چنانچہ ایک درویش سلطان المشائخ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھا تھا، ان کے خادم سے ایک ایسی حرکت صادر ہوئی جو سلطان صاحب کو ناپسند ہوئی اور اس شخص کے جسم پر کوڑے لگائے گئے۔ اس وقت اس درویش کے بدن مبارک پر بھی اس چوٹ کا اثر ظاہر ہوا۔ پھر آپ نے (حضرت مہارویؒ نے) فرمایا کہ ایسا وحدت الوجود کے غلبہ سے ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک وجود ایک ہی ہے اور یہ کثرت (جو نظر آتی ہے) وہمی ہے، یہ اسی وجود کی صفات اور مختلف تجلّیات کی (کثرت) ہے۔

۵۔ "فرمودند کہ شخصے را از اولاد بابا صاحب قدّس سرّہ در وقت مطالعۂ کتاب تشنگی غالب آمد

فرمایا کہ بابا صاحب قدّس سرّہ کی اولاد میں سے کسی کو کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پیاس لگی۔

---

۱۔ خلاصۃ الفوائد (قلمی) ۲۔

۳۔ خلاصۃ الفوائد (قلمی)

نزد وے یک آوند پُر از روغن زرد موجود بود آن را آب تصوّر یدہ بکار بردند از کمال اشتغال مطالعہ ہیچ امتیاز نہ فرمودند"۔[1]

۶۔ "فرمودند کہ سالک را باید لیل و نہار علی الدّوام در تقویٰ و زہد و ورع کوشش بلیغ کند تا حق تعالیٰ او را مرتبہ بیخودی نصیب گرداند کہ اہم مطالب است چنانچہ حضرت بابا فرید گنج شکر قدّس سرّہ فرمودہ است از خود رستن و بحق پیوستن"۔[2]

۷۔ "و نیز قبلۂ من فرمودہ است سالک را باید کہ از سہ چیز خود را دور دارد: یکے حکم قضا کردن، دوم ضامن کسے شدن، سوم امانت کسے نزد خود نگاہداشتن. ازانکہ این وصیّت از پیران ما بمریدان خود جاری شدہ آمدہ است و ہم فرمودند چنانکہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر بہ شیخ نظام الدین دہلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہما وصیّت فرمودہ است چون مہمانان و مسافران بر تو آیند و ترا فاقہ باشد شکر خدا تعالیٰ بجا آری کہ این نعمتے است بس عظیم و فرمودند کہ چنین شیخ بمرید کامل می فرماید"۔[3]

ان کے پاس گھی سے بھرا ہوا ایک برتن رکھا تھا، اسے پانی سمجھ کر پی گئے اور مطالعہ میں محویت کی وجہ سے کوئی تمیز نہ کر سکے۔

فرمایا کہ سالک کو چاہیے کہ رات اور دن ہمیشہ تقویٰ، زُہد اور پرہیزگاری میں کوشش کرے تاکہ اسے بیخودی کا مرتبہ حق تعالیٰ نصیب کرے جو سب سے بڑا مطلب ہے جیسا کہ بابا فرید گنج شکر قدّس سرّہٗ نے فرمایا ہے کہ "خود سے چھوٹو تو حق سے ملو"۔

اور نیز ہمارے قبلہ (حضرت مہارویؒ) نے فرمایا ہے کہ سالک کو چاہیے کہ تین چیزوں سے خود کو بچائے: ایک تو قضا کا حکم کرنا، دوسرے کسی کی ضمانت دینا، تیسرے کسی کی امانت اپنے پاس رکھنا، اس لیے کہ یہ ہمارے پیروں کی وصیّت اپنے مریدوں کے لیے جاری ہوتی آئی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر نے شیخ نظام الدین دہلوی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو وصیّت فرمائی تھی کہ جب تمہارے پاس مہمان اور مسافر آئیں اور تمہیں فاقہ ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے اور فرمایا کہ یہ بات شیخ کسی مرید کامل سے فرماتا ہے۔

---

[1] خلاصۃ الفوائد (قلمی) [2] ایضاً [3] ایضاً

## ۵۔ انوار الصفی

انوار الصفی فی اظہار اسرار الجلی والخفی حکیم حسین علی خاں ردولوی[1] کی تالیف ہے اور اس کتاب میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی[2] (متوفی ۹۴۴ھ) کے دادا حضرت شیخ صفی الدین ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و ملفوظات جمع ہوئے ہیں[3]

حضرت شاہ صفی الدین ردولوی (متوفی ۸۱۹ھ) حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کچھوچھہ سے خلافت رکھتے تھے اور سیّد اشرف سمنانیؒ کو حضرت خواجہ علاء الحق بنگالیؒ سے اور انھیں مخدوم اخی سراجؒ سے خلافت حاصل تھی جنھوں نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی اشاعت بنگال، اُڑیسہ اور آسام میں کی بلکہ وہیں سے یہ سلسلہ مشرقِ بعید اور چین تک پہنچا تھا۔

حضرت شاہ صفی الدینؒ کے صاحبزادے مخدوم محمد اسمٰعیلؒ ہوئے، ان کے صاحبزادے حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمۃ ہیں۔ شجرۂ نسب اس طرح ہے :

شجرۂ نسب حضرت مخدوم صفی الدین ردولویؒ

- شیخ نظام الدین
  - شیخ نصیر الدین
    - شیخ صفی الدین ردولوی
      - شیخ محمد اسمٰعیل
        - شیخ عبدالصمد (اسومئو)
        - شیخ عزیز اللہ
        - شیخ عبدالقدوس گنگوہی (گنگوہ)
          - حضرت شیخ رکن الدین (مؤلف : لطائف قدوسی)
        - شیخ حبیب اللہ عرف شیخ مٹھن (بھٹورہ)
    - قاضی رضی الدین (قاضی ردولی)

[1] حکیم حسین علی خاںؒ حضرت شاہ عبدالرحمٰن موحد لکھنویؒ سے بیعت ہوئے تھے۔ شاہ صاحبؒ کے حالات میں انوار الرحمٰن لتنویر الجنان مشہور ہے اور اسی کا خلاصہ نور الرحمٰن صاحب پھرایونیؒ نے نور الرحمٰن کے نام سے کیا تھا۔

[2] حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے متعلق ایک مفصل کتاب اعجاز الحق قدوسی کی لکھی ہوئی پاکستان میں شائع ہو چکی ہے۔

[3] انوار الصفی کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے وہ مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ (تعداد صفحات ۷۲)

انوار الصفی میں اختصار کے باوجود فن سلوک کی بہت قابل قدر معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً مخدوم صفی الدینؒ نے ایک بار فرمایا کہ درویش اپنی خلافت کے ساتھ عصا اور خرقہ و نعلین چوبیں وغیرہ کیوں عطا فرماتے تھے:[۱]

مصلّا : استقامت طاعت و عبادت کی نشانی ہے۔

تسبیح : جمعیت خاطر پر دلالت کرتی ہے۔

شانہ : دفع شر کے لیے اور نشانِ خیر ہے۔

عصا : اس پر دلالت کرتا ہے کہ واحد حقیقی پر تکیہ کرنا چاہیے۔

مقراض : قطع علائق اور اُمیدوں کے اختصار کی نشانی ہے۔

سوزن : پیوند کرنے کے لیے ہے۔ مگر سُوئی بغیر دھاگے کے نہیں دی جاتی۔

صراحی اور کاسہ : مہمانوں کو کھلانے پلانے کی دلالت ہے۔

نمکدان وطشت : اس کی علامت ہے کہ سفرہ (لنگر) حوالے کیا گیا۔

کفش و نعلین : ثبات قدم کی دلیل ہے۔

اسی طرح ایک صحبت میں فرمایا کہ انسان (طالبِ خدا) اور خدا کے درمیان چار حجاب ہوتے ہیں: دُنیا[۱]، خلق[۲]، نفس[۳] اور شیطان[۴]۔ پھر ان کی تشریح یوں فرمائی:[۲]

"دُنیا آخرت کا حجاب ہے، خلق عبادت کا حجاب ہے، شیطان دین کا حجاب ہے اور نفس خدا کا حجاب ہے۔"

ایک بار فرمایا کہ سالک کا علم بارہ طریق (مدارج) رکھتا ہے:

علمِ معرفت[۱]، علمِ طاعت[۲]، علمِ مکاشفہ[۳]، علمِ مشاہدہ[۴]، علمِ خطاب[۵]، علمِ سماع[۶]، علمِ وجد[۷]، علمِ معرفتِ روح[۸]، علمِ معرفتِ نفس[۹]، علمِ معرفتِ عقل[۱۰]، علمِ توحید[۱۱]، اور علمِ معاملت[۱۲]۔[۳]

یعنی مدارج سلوک کے آخری مرحلے میں توحید کا ذوق حاصل ہوتا ہے اور تکمیل سلوک کے بعد حسنِ معاملت با خلق جسے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" (اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو) کہا گیا ہے۔

---

[۱] انوار الصفی: صفحات ۲۱-۲۲ [۲] ایضاً: ص ۲۴ [۳] ایضاً: ص ۲۵

انوار الصفی کے باب ششم میں ہے کہ ایک روز حضرت شیخ صفی الدین ردولویؒ حضرت شیخ داؤد پالاہیؒ خلیفۂ[1] حضرت گنج شکرؒ کے مزار کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان کا مزار موضع پالہی مئو میں ہے جو ردولی سے دو کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ راستے میں دریائے گھاگھرا کے کنارے سیّد درویش قاضیؒ سے ملاقات ہوئی۔ اور بعد کو ان کی دختر سے آپ نے عقد کر لیا جن کے بطن سے شیخ محمد اسمٰعیلؒ ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ کو پیدا ہوئے۔

انوار الصفی میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا حوالہ متعدد بار آیا ہے —— ایک موقع پر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مکتوب کا اقتباس ہے:

"..... در مقامے کہ اصحاب ولایت عمرے گذرانیدہ اند اثر لیست کُلّی. و در مرامے کہ ارباب نہایت بہم دیگر سرائیدہ اند قدرے است اصلی..... باید کہ گاہ گاہے در حجرۂ متبرکہ کلمۂ منوّرہ حضرت در دریائے توحید و جوہر معاون تفرید گنج شکر فرید قدّس اللہ روحہٗ ہم صحبت محرمانہ دارند و در یک دیگر مکالمہ دوستانہ آرند کہ آن جائے بسیار بہ فیض آباد و مہبط انوارِ الٰہی و منزل انوار نامتناہی است. زنہار زنہار این دولت از دست ندہند و دولت زیارت و طوف مرقد منوّرہ حضرت شیخ داؤدؒ کہ قریب اُفتادہ است گاہ گاہے بآن دولت بہرہ مند شوند.

جن مقامات میں اصحاب ولایت نے عمریں گذاری ہیں، ان میں پوری تاثیر ہے۔ اور جس جگہ اہل کمال نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ہے ان کی قدر و قیمت ہے۔ واقعی تمہیں چاہیے کہ دریائے توحید کے موتی اور کان تفرید کے جوہر حضرت شیخ فرید گنج شکر قدّس اللہ روحہٗ کی مبارک کٹیا میں بھی صحبت محرمانہ رکھو اور باہم دوستانہ بات چیت کرو کیونکہ وہ ایسی جگہ ہے جو فیض سے آباد ہے اور اللہ کے انوار لامتناہی وہاں نازل ہوتے ہیں۔ خبردار خبردار! اس دولت کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا اور شیخ داؤدؒ کا مرقد منوّرہ جو قریب ہی واقع ہے اس کی نعمت سے بھی کبھی کبھی بہرہ مند ہوتے رہو۔

---

[1] شیخ داؤد پالہیؒ کو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا خلیفہ نہیں سمجھا جاتا۔ ان کا تذکرہ سیر الاولیاء، اخبار الاخیار وغیرہ میں ہے۔ مگر انھیں باباصاحبؒ کا خلیفہ نہیں بتایا گیا ہے۔ لیکن انوار الصفی میں شیخ داؤدؒ کا حوالہ کئی جگہ آیا ہے اور انھیں باباصاحبؒ کا خلیفہ لکھا ہے۔

آں جا دو دولت اند: یکے مقبرۂ حضرت داؤدؒ کہ در روے آثار فیوضات الٰہی و اطوار واردات نامتناہی زیادہ می نماید، دوم مقدم شریف حضرت گنج شکر قدس اللہ روحہ، در مسجد کہ پہلوے روضۂ متبرکہ ایشاں افتادہ است بسیار نزول فرمودہ اند"۔

وہاں دو نعمتیں ہیں: ایک تو یہی حضرت داؤدؒ کا مقبرہ جس میں فیوض الٰہی کے بے پایاں آثار ہیں اور بیکراں واردات آتی ہیں، دوسرے حضرت گنج شکر قدس اللہ روحہ، کے قیام فرمانے کی جگہ جو اُن (شیخ داؤدؒ) کے روضۂ متبرکہ کے قریب کی مسجد میں ہے اور جہاں آپ (بابا فریدؒ) نے بہت نزول فرمایا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے اقتباسات جن میں حضرت بابا صاحبؒ کا حوالہ ہے یہ ہیں:

۱۔ "حضرت صاحبؒ بعد مرور ایام از جونپور بہ اودھ تشریف آورند دراں جا با علمائے شہر ملاقی شدہ۔ فاضلے ازاں جماعت بر زباں راند کہ بابا صفی الدینؒ می دانید کہ از اولیاے کرام بعد ممات کرا تصرف باقیست؟ جوابش فرمودند کہ روزے از روزہاے حضوری آستانہ مقدس حضرت پیر دستگیر خود ایں مسئلہ عرض کردہ بودم۔ ارشاد شدہ بود کہ اولیاء اللہ کہ پنج کس در قبور خود مانند احیاء تصرف میکند: عبدالقادر جیلانی و حضرت شیخ معروف کرخی و حضرت شیخ محی الدین ابن عربی و حضرت شیخ عقیل مسیحی و حضرت شیخ جرانی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ آں وقت عرض کردم کہ ایں تصرف مشائخان ولایت است از مشائخان ہند

حضرت (شیخ صفی الدین ردولویؒ) کچھ مدت کے بعد جونپور سے اودھ تشریف لائے اور وہاں شہر کے عالموں سے ملاقات کی۔ اس جماعتِ علماء میں سے ایک نے کہا کہ بابا صفی الدینؒ کیا آپ جانتے ہیں کہ اولیائے کرام میں سے مرنے کے بعد کس کس کا (روحانی) تصرف باقی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جن دنوں اپنے پیر دستگیر (حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) کے آستانہ مقدس پر حاضری دیا کرتا تھا، ایک دن میں نے بھی اپنے پیر و مرشد کے سامنے یہ مسئلہ عرض کیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ اولیاء اللہ میں پانچ ہستیاں ایسی ہیں جن کا زندوں کی طرح تصرف جاری ہے، یعنی حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ معروف کرخی، حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت شیخ عقیل مسیحی اور اور حضرت شیخ جرانی (اللہ ان سب سے راضی ہو) اس وقت میں نے عرض کیا کہ یہ تو (باہر کی) ولایتوں کے مشائخ کا تصرف ہوا۔ ہندوستان کے مشائخ میں

کیست ؟ فرمودند کہ تعین ایں مراتب خالی از بے ادبی نیست. امّا بیشترے از خاندان چشت را باقیست بالتخصیص حضرت خواجہ غریب نواز سلطان الہند معین الدین رضی اللہ عنہ و حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی و حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر و حضرت سلطان نظام الدین محمد اولیاء بدایونی و حضرت مخدوم الانام علاء الحق والدین بنگالی رضوان اللہ علیہم "۔[1]

۲۔ "یکے را از متعلّماں استفسار کرد کہ حدود والایت ہر یک اولیاء اللہ معیّن است یا نہ ؟ ارشاد شد کہ در ملفوظات حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ دیدہ ام کہ عبد اللہ نامی قوّال بخدمت حضرت گنج شکرؒ حاضر شد. بعد چند روز رخصت طلبید کہ باز بہ مُلتان رود و درخواست فاتحہ خیریت کرد کہ در راہ مُلتان خوف قطّاع الطریقاں بود. حضرت گنج شکرؒ فرمودند کہ تا موضع فلاں تعلّق (بما) دارد و از فلاں حوض سرحد شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانی رحمۃ اللہ علیہ است

ایسے کون بزرگ ہیں ؟ فرمایا کہ ان مراتب کا تعین کرنا بے ادبی سے خالی نہیں ہے مگر خاندان چشتیہ میں سے بہتوں کا تصرّف باقی ہے خاص طور سے حضرت خواجہ غریب نواز سلطان الہند معین الدین رضی اللہ عنہ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی اور حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر اور حضرت سلطان نظام الدین محمد اولیاء بدایونی اور حضرت مخدوم الانام علاء الحق والدین بنگالی اللہ ان سب سے راضی ہو۔

طالب علموں میں سے ایک نے پوچھا کہ اولیاء اللہ میں بھی ولایت کی سرحدیں مقرّر ہوتی ہیں یا نہیں ؟ ارشاد ہوا کہ حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں مَیں نے دیکھا ہے کہ عبد اللہ نامی قوّال حضرت گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چند روز کے بعد رخصت طلب کی تا کہ پھر مُلتان جائے اور خیریت کے لیے فاتحہ (پڑھنے) کی درخواست کی کیونکہ مُلتان کے راستے میں بٹ ماروں کا خوف بہت تھا۔ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا کہ فلاں گاؤں تک ہم سے متعلق ہے اور فلاں حوض سے شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانی رحمۃ اللہ علیہ کی سرحد ہے۔

---

[1] انوار الصفی : صفحات ۲۲-۲۳

تعلق بادشاں دارد. القصہ قوال مذکور بداں حوض رسید کہ از آں جا سرحد ملتان بود و تعلق بہ شیخ الاسلام داشت از جانب حوض قطاع الطریقاں با شمشیرہاے برہنہ نمودار شدند. آں وقت قوال را فرمودۂ حضرت گنج شکرؒ یاد آمد درخواست مدد از بہاء الدین زکریاؒ کرد کہ ایں زمین در ذمہ ضمانت شما ہست. ہماں زماں بہ فرمان اللہ تعالیٰ دزداں کہ نمودار شدہ بودند غائب شدند. بعد چند روز عبداللہ قوال بملتان رسید و از قدم بوسی حضرت شیخ بہاء الدینؒ مشرف گشت ازیں واضح می شود کہ حدود ولایت ہر یک اولیاء اللہ مقرر است.

ہم چنیں حکایت دیگر حضرت قدوۃ الکبریٰؒ میفرمودند کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی رضی اللہ عنہ در شہر ملتان در مسجدے نزول فرمودند حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ را بنور ولایت و فراست دریافتہ خادم را نزد خواجہ صاحب فرستادند و بر محافہ سوار کردند در خانقاہ خود آوردند و در ضیافت

وہ علاقہ ان سے متعلق ہے۔ القصہ جب یہ قوال اس حوض پر پہنچا کہ جہاں سے ملتان کی سرحد شروع ہوتی تھی اور جو شیخ الاسلام کی ولایت میں تھا حوض کے ایک جانب سے لٹیرے ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے نکل آئے۔ اس وقت قوال کو حضرت گنج شکرؒ کا فرمانا یاد آیا اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے مدد کی درخواست کی کہ یہ زمین آپ کی ضمانت میں ہے۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ لٹیرے جو نکل کر آئے تھے کہیں غائب ہوگئے۔ چند روز کے بعد عبداللہ قوال ملتان پہنچا اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر ایک اولیاء اللہ کی سرحدیں (ولایت کی) مقرر ہیں۔

اسی طرح دوسری حکایت: حضرت قدوۃ الکبریٰ[1] فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی رضی اللہ عنہ ملتان شہر کی ایک مسجد میں نازل ہوئے۔ شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو ولایت کے نور (کشف) سے ان کے ورود کا حال معلوم ہوگیا۔ اپنے خادم کو خواجہ کی خدمت میں بھیجا اور انھیں پالکی میں سوار کرکے اپنی خانقاہ میں لے آئے اور ان کی مہمان داری میں

---

[1] قدوۃ الکبریٰ سے اس کتاب میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ مراد ہیں۔

باقصیٰ غایت کوشیدند بعد از سہ روز حضرت خواجہؒ فرمودند کہ دعوت بے نمک است. حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ دانستند کہ جہت سماع میگویند. قوّالاں را امر کردند و حضرت خواجہؒ و اصحاب ایشاں را در خانقاہ آوردند و خود چوبے گرفتہ بہ دربانی بر در خانقاہ ایستادند. قوّالاں بہ غنا پرداختند خواجہ را حالتے در گرفت کہ بہ در و دیوار تاثیرش سرایت کرد. اصحاب و متعلّقان شیخ بہاء الدین زکریاؒ عرض کردند کہ در خانقاہ شیخ خلاف شرع می شود چہ گونہ جائز داشتند. حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ فرمودند کہ ایشاں عجب دیوانہ ہستند نمی بیند کہ دربانی کسے کہ ہم چو بہاء الدینؒ میکند. متعلّقان مبالغہ کردند. شیخ فرمودند کہ اگر تو ا یسند بروید و در خانقاہ منع کنید آنہا در مجلس خواجہ رفتند و در سماع در آمدند چناں ذوقے و نعمتے در ایشاں افتاد کہ ہرگز ندیدہ بودند چوں تنزّل حال شد ایشایاں عرض کردند کہ در سلسلہ ارادت آرند. خواجہ فرمودند کہ ایں ولایت برادرم بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ در خانوادۂ سہروردیہ است اینجا مرید کردن

حد درجہ کوشش کی. تین دن کے بعد حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ دعوت بے نمک رہی۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ آپ سماع کے لیے فرما رہے ہیں۔ قوّالوں کو حکم دیا اور حضرت خواجہؒ اور آپ کے ساتھیوں کو خانقاہ کے اندر بٹھایا، خود ایک لاٹھی لے کر دربانی کرنے کے لیے خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ قوّالوں نے گانا شروع کیا. خواجہ کو کیفیت ہو گئی حتیٰ کہ اس کی تاثیر در و دیوار میں سرایت کر گئی۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے اصحاب اور متعلّقین نے عرض کیا کہ شیخ کی خانقاہ میں خلاف شرع کام ہو رہا ہے، اسے آپ نے کس طرح گوارا کر لیا؟ حضرت شیخ زکریاؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ بھی عجب دیوانے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کون شخص ہے جس کی دربانی بہاء الدین جیسا شخص کر رہا ہے۔ مگر متعلّقین نے اصرار کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر تم میں ہمّت ہے تو جاؤ اور خانقاہ کے اندر جا کر روک دو۔ وہ لوگ خواجہ کی مجلس میں گئے اور خود بھی سماع میں شریک ہو گئے. انھیں ایسا ذوق اور نعمت حاصل ہوئی کہ اس سے پہلے ہرگز نہیں دیکھی تھی۔ جب حال کی کیفیت میں تنزّل ہوا تو انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں مرید کر لیجیے۔ خواجہ نے فرمایا کہ یہ میرے بھائی بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت ہے اور خاندان سہروردیہ کی ہے۔ یہاں مرید کرنا

و خلافت دادن مرا نمی باید چوں حضرت خواجہ رضی اللہ عنہ در قصبہ ہانسی رسیدند جماعتے را کہ ہمراہ آمدہ بودند در قید ارادت آوردند و فرمودند کہ ایں سرحد ولایت سہرورد و چشت است ازاں رو شمایاں تکلیف دادہ بودم. پس ازیں معلوم شد کہ تا قصبہ ہانسی سرحد ولایت چشت است "۔[۱]

یا خلافت دینا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ جب حضرت خواجہ رضی اللہ عنہ قصبہ ہانسی میں آئے تو وہ جماعت بھی آپ کے ساتھ آئی تھی۔ وہاں آکر ان کو مرید کیا اور فرمایا کہ یہ جگہ (ہانسی) سہرورد اور چشت کی ولایتوں کی سرحد ہے، اس لیے تمہیں یہاں تک تکلیف دی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قصبہ ہانسی تک ولایت چشت کی سرحد ہے۔

۳۔ "روزے حضرت صاحبؒ در مجمع یاراں بخانہ مولانا کریم الدینؒ رونق دہ بزم بودند دراں میان ذکر سماع افتاد مولانا سماء الدین خلیفہ حضرت قدوۃ الکبریٰ رحمہم اللہ استفسار فرمودند حضرت صاحبؒ ارشاد کردند کہ بحضور قدوۃ الکبریٰؒ ایں مسئلہ در بحث آمدہ بود صورتش اینست کہ ہر مسئلہ کہ مختلف فیہ است در حلت و حرمت در او دلیرانہ دم نزد ازاں جملہ مسئلہ سماع است کہ مطلقاً وے را حرام و حلال نتواں گفت بغیر قیدے۔ چنانچہ حضرت سلطان المشائخؒ فرمودہ اند کہ سماع علی الاطلاق نہ حلال است

ایک روز حضرت (شیخ صفی الدینؒ) مولانا کریم الدینؒ کے مکان پر احباب کی محفل میں رونق افروز تھے۔ اس وقت سماع کا ذکر چھڑ گیا۔ مولانا سماء الدین خلیفہ حضرت قدوۃ الکبریٰ (اللہ ان پر رحمت کرے) نے سوال کیا۔ حضرت صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور قدوۃ الکبریٰ (سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) کی خدمت میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو مسئلہ اختلافی ہے اس کے حرام یا حلال ہونے پر دلیری سے زبان نہیں کھولنی چاہیے۔ چنانچہ مسئلہ سماع بھی انھیں میں سے ہے کہ اسے نہ مطلق حلال کہہ سکتے ہیں، نہ مطلق حرام مگر یہ کہ مشروط کیا جائے۔ چنانچہ حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا ہے کہ سماع نہ مطلق حلال ہے اور

---

[۱] انوار الصفی: صفحات ۳۹-۴۰

و نہ حرام تا نداند کہ سماع چیست و مستمع کیست؟ و ایں سرّیست از اسرار الٰہی و نوریست از انوار نامتناہی تا کدام سعادت مند بود کہ دل وے مطلع خورشید سماع و جان وے مشرّف ناہید استماع بود. بیت :

عشق در پردہ می نوا سازد
عاشقے کو کہ بشنود آواز
ہمہ عالم صدائے نغمۂ اوست
کہ شنید ایں چنیں صدائے راز

عالم جان باز و عارفِ محرم راز باید کہ گوش بر سماع کند لِاَنَّ السَّمَاعَ اَمرٌ خَفِیٌّ وَ نُورٌ جَلِیٌّ وَسِرٌّ لَمْ یطلع عَلَیْہِ اِلَّا الْمُحَقِّقُوْنَ الرَّاسِخُوْنَ الرَّبَّانِیُّوْنَ الْوَاصِلُوْنَ الْعَارِفُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَھُمُ الذَّوْقُ اِبْتِدَاءً وَّالرَّبُّ اِنْتِھَاءً ۔

و حضرت سلطان المشائخؒ فرمودند کہ سماع بر چہار قسم است : یکے حلال کہ شنوندہ را تمام میل بجانبِ حق باشد و سوے مجاز ہیچ میلش نبود، دوم مباح کہ جانب حق میل او زیادہ باشد و جانب مجاز کم،

نہ مطلق حرام ہے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ سماع کیا ہے اور سننے والا کون ہے؟ اور یہ ایک بھید ہے اللہ کے اسرار میں سے ایک نور ہے اللہ کے بے پایاں انوار میں سے۔ کون سعادت مند ایسا ہوگا جس کا دل سماع کے خورشید کا مطلع بنے اور جس کی جان سے سماع کا ستارہ (ناہید) طلوع ہو۔ شعر:

عشق ساز کے پردے میں نوازن ہے،
کوئی عاشق کہاں ہے جو یہ آواز سمجھے،
تمام عالم اس کے نغمے کی آواز ہے،
اس صدائے راز کو سننے والا کون ہے؟

جان باز عالم اور رازوں کے محرم کو سماع سُننا چاہیے" کیوں کہ سماع ایک امر خفی ہے، ایک نور جلی ہے اور ایک بھید ہے جس سے اہلِ تحقیق، راسخ العقیدہ، اہل اللہ، واصلین اور عارفین ہی واقف ہوسکتے ہیں، ان کو ابتداء میں ذوق ملتا ہے اور انتہا میں رب (کا وصال)۔

اور حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا کہ سماع کی چار قسمیں ہیں: ایک حلال ہے جس سے سننے والے کا میلان تمام تر جانبِ حق ہوتا ہے اور مجاز کی طرف قطعاً نہیں ہوتا، دوسرے مباح ہے جس میں جانبِ حق میل زیادہ ہو اور مجاز کی طرف کم ہو۔

سوم مکروہ کہ میل او سوے مجاز بسیار باشد از حق، چہارم حرام کہ میل او جانب مجاز کلیتہً بود اصلاً بسوے حقیقت نہ پروازد"۔[1]

تیسرے مکروہ ہے جس میں مجاز کی طرف میل زیادہ اور حق کی طرف کم ہو، چوتھے حرام ہے جس میں تمام میلان مجاز کی طرف ہو اور حق کی طرف قطعاً نہ ہو۔

۴۔ "حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ می فرمایند کہ شرط سماع آنست کہ دراں سہ چیز نگاہ دارد: مکان[1] و اخوان[2] و زمان[3]. مکان باید کہ بقعہ مشائخ با موضع پاکیزہ و کشادہ و روشن باشد واخوان باید کہ یاران و درویشان اہل تمیز و صحبت باشند و زمان باید کہ دل از کلّی اشغال خالی بود و آدابِ سماع آنست کہ در سماع تا ذوقے نیابی نکنی"۔[2]

حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سماع کی شرط یہ ہے کہ اس میں تین باتوں کا لحاظ رکھے: مکان، اخوان اور زمان۔ مکان تو مشائخ کا حجرہ ہو پاکیزہ، کشادہ اور روشن جگہ پر اور اخوان میں دوست اور درویش اہل تمیز و لائق صحبت ہوں اور زمان یہ کہ دل تمام اشغال سے خالی ہو۔ اور آدابِ سماع یہ ہیں کہ جب تک سماع میں ذوق نہ پاؤ نہ کرو۔

۵۔ "بندگی اسمٰعیلؒ استفسار کردند کہ حضرت قدوۃ الکبریٰؒ برائے زیارت مزار شیخ صلاح سہروردیؒ و شیخ صلاح صوفیؒ کہ در قصبہ ردولی آسودہ اند بجناب تاکید می فرمایند. کیفیت ایں بزرگواراں رحمہم اللہ انچہ معلوم باشد بیان فرمودہ آید. ارشاد شد کہ

بندگی اسمٰعیلؒ (فرزند حضرت شیخ صفی الدین ردولویؒ) نے استفسار کیا کہ حضرت قدوۃ الکبریٰ (سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) شیخ صلاح سہروردیؒ اور شیخ صلاح صوفیؒ کے مزارات کی زیارت کے لیے جو ردولی میں آسودہ ہیں، جناب کو تاکید فرماتے ہیں کہ ان بزرگواروں کی کیفیت (اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے) جیسا کہ معلوم ہو بیان فرمائیے ـــــ ارشاد ہوا کہ

---

[1] نیز دیکھو: سیر الاولیاء: ص ۴۹۱؛ دررِ نظامیہ: ص ۲۴۳ [2] انوار الصفی: ص ۴۵

شیخ صلاح صوفیؒ در زمان سلطنت
سلطان علاء الدین خلجیؒ از دیار
کرمان بہ ہندوستان رسید عارف
صاحبِ اسرار بود خرقہ خلافت از
سلسلہ بند کلان خود شاہ شجاع کرمانیؒ
داشت و شیخ صلاح صوفیؒ محض محبّت
شیخ صلاح سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کہ
صاحب ولایت ایں قصبہ ردولی بردہ
و شیخ داؤد خلیفہ حضرت مخدوم
فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہم کہ در
موضع پالہی مئو سہ کروہ غرب ردولی
آسودہ اند توطن ردولی اختیار
نمودہ بودند ....

روزے حضرت صاحبؒ برائے زیارت
مزار فائض الانوار شیخ داؤد خلیفہ
حضرت فریدالدین گنج شکر رضوان اللہ تعالیٰ
علیہما بہ موضع پالہی مئو کہ دو کروہ مغرب
از ردولی واقع است تشریف بردند
دراں جا از اتّفاقات وقت از
سیّد درویشؒ قاضی قصبہ کوبلا در کہ
جانب شمال از ردولی چہار فرسنگ و
کنار دریاے گھاگر دست ملاقات
حاصل گشتہ۔ قاضی صاحبؒ بدریافت

شیخ صلاحؒ صوفیؒ تو سلطان علاء الدین خلجی کے
زمانے میں کرمان سے ہندوستان آئے
تھے۔ یہ صاحبِ اسرار عارف تھے
اور انھیں خلافت کا خرقہ اپنے بڑے بھائی
شیخ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملا تھا
اور شیخ صلاح صوفی رحمۃ اللہ علیہ صرف
شیخ صلاح سہروردیؒ سے محبّت رکھتے تھے
جو صاحب ولایت قصبہ ردولی ہیں اور
شیخ داؤد خلیفہ حضرت مخدوم فرید الدین
گنج شکر رحمۃ اللہ علیہم جو پالہی مئو گاؤں
میں ردولی سے مغرب کی طرف تین کوس
پر آسودہ ہیں۔ انھوں نے ردولی میں توطن
اختیار کیا تھا۔

ایک دن حضرت صاحبؒ حضرت شیخ داؤد
خلیفہ حضرت فریدالدین گنج شکر رضوان اللہ
تعالیٰ علیہما کے مزار فائض الانوار کی زیارت کے
لیے پالہی مئو تشریف لے گئے جو ردولی سے
جانب غرب دو کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔
وہاں اتّفاق سے سیّد درویشؒ سے ملاقات
ہوئی جو قصبہ کویلادر کے قاضی تھے جو
ردولی سے چار فرسنگ کے فاصلے پر
جانب شمال ہے اور دریاے گھاگھر کے
کنارے ہے۔ قاضی صاحبؒ نے ان کے

حالات علم و زہد و تقویٰ و تجرّد حضرت صاحبؒ از یاران ہمراہی حضرت صاحبؒ مشورہ کردند کہ دخترے دارم بسا صاحب عصمت و عفّت اگر با چنیں شخص صورت ازدواج بندد ایں مناسب خواہد بود یاران حضرت باشارہ قاضی صاحبؒ ایں سخن بآں حضرت رسانیدند. حضرت صاحبؒ را اگرچہ خاطر از دُنیا و اہل دُنیا سرد بود و طبیعت جانب تفرّد مائل. امّا بحکم کمال اتّباع سُنّتہ سینہ، نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کہ اَلنِّکَاحُ سُنَّتِیْ واردست ایں امر را منظور فرمودہ بہ قصبہ کویلا در تشریف بردند و ادائے ایں سنّت فرمودہ با اہلیۂ خود بردولی قدوم آوردند... بعد چندے فرزند ارجمند.... محمد اسمٰعیل بتاریخ دوازدہم ربیع الثانی سنہ ہفت صد و ہشتاد و نہ ہجری متولّد شدند..."[1]

۶۔ "...اے فرزند شنیدہ ام کہ روزے حضرت سلطان المشائخ نظام الحق والدین محمد بدایونی

حالات جان کر اور علم و زُہد اور تقویٰ و تجرّد وغیرہ کا حال دیکھ کر حضرتؒ کے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ میری ایک لڑکی ہے بہت پاکیزہ اور صاحب عصمت۔ اگر ایسے شخص سے اس کا عقد ہو جائے تو مناسب ہوگا۔ حضرت کے ساتھیوں نے قاضی صاحبؒ کے اشارے سے یہ بات حضرت تک پہنچا دی۔ حضرت صاحبؒ کا دل اگرچہ دُنیا اور اہلِ دُنیا سے سرد ہو چکا تھا اور طبیعت تفرّد کی طرف مائل تھی مگر کمال اتّباع سُنّت کے زیرِ اثر کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے: "نکاح میری سُنّت ہے"۔ اس بات کو منظور فرما لیا اور قصبہ کویلا در تشریف لے گئے اور اس سُنّت کو ادا فرما کر اپنی اہلیہ کے ساتھ ردولی تشریف لے گئے.... کچھ زمانے کے بعد فرزند ارجمند .... محمد اسمٰعیل بتاریخ ۱۲؍ ربیع الثانی ۷۸۹ ہجری کو پیدا ہوئے۔

.... اے فرزند! میں نے سُنا ہے کہ ایک روز حضرت سلطان المشائخ نظام الحق والدین محمد بدایونی

---

لہ انوار الصفی: ص ۵۰

رحمۃ اللہ علیہ می فرمودند کہ طالب صادق تا راہ نرود بمنزل مقصود نرسد و اگر کسے خواہد تا نشستہ باشد بمنزل رسیدن نتواند۔ مجاہدہ شرط است. وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔[1] و فرمود حاصل از مجاہدہ جذب الْقُلُوْبِ اِلٰی غَیْرِ اللّٰہِ وَالْاِسْتِغْرَاقُ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ یعنی مجاہدہ گردانیدن دل است از غیر خدا بسوے استغراق در طاعتِ خدا. و نیز سلطان المشائخؒ فرمودہ اند کہ صوفیاں ریاضت ہاے قوی کردہ اند و شہوت ہا از پیش برگرفتہ و مدّتے مدید در خلوتہا نشستہ و دل بکلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پرساختہ اند۔"[2]

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ طالب صادق جب تک راستہ مقامات سلوک کا نہ چلے گا منزل کو نہیں پہنچ سکتا اور اگر کوئی یہ چاہے کہ بیٹھا رہے تو منزل کو نہیں پہنچے گا۔ مجاہدہ شرط ہے" جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم انھیں اپنے وصال کے راستے دکھا دیتے ہیں۔" اور فرمایا کہ مجاہدہ کا حاصل یہ ہے کہ دل غیر اللہ سے کھنچے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں استغراق پیدا ہو۔ اور سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ صوفیوں نے بہت زبردست ریاضتیں کی ہیں اور اپنی خواہشات کو سامنے سے ہٹایا ہے اور مدتوں تک خلوت میں بیٹھے ہیں اور دل کو کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے مملو کیا ہے۔

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹

[2] انوار الصفی : صفحات ۵۳-۵۴

# احسنُ الاقوال

## حضرت باباصاحبؒ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالات کا ایک اہم ماخذ

احسن الاقوال آٹھویں صدی ہجری کے ادب ملفوظ میں ایک اہم اور مستند مجموعہ ہے[1]۔ اس میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قدّس سرّہٗ کے خلیفہ حضرت خواجہ برہان الدین غریب علیہ الرحمۃ کے ملفوظات وارشادات جمع ہوئے ہیں۔ ان کے مرتّب حضرت خواجہ حمّاد کاشانیؒ ہیں۔ یہ خواجہ عمّاد کاشانیؒ کے فرزند ہیں ——— ان کے دو بھائی خواجہ مجدّ الدین کاشانیؒ اور اور خواجہ رکن الدین دبیر کاشانیؒ بھی حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ سے بیعت تھے، اور تینوں بھائیوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اہم کام کیے ہیں۔

### خواجہ حمّاد کاشانیؒ

چنانچہ خواجہ حمّاد کاشانیؒ کی تصانیف میں ایک تو یہی احسن الاقوال ہے جس کا تعارف یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسری کتاب فقہ میں منافع المسلمین ہے۔ فن سلوک میں دو اور کتابیں اسرار الطریقت اور حصول الوصول بھی ان کے رشحات قلم سے ہیں۔ اوّل الذکر کے سوا ان میں سے کوئی کتاب بھی دستیاب نہیں ہے۔

---

[1] اس کے قلمی نسخے بہت کم ملتے ہیں۔ راقم الحروف کے علم میں صرف ایک نسخہ ہے جو پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے کتب خانے میں تھا۔ (مشائخ چشت: ص ۲۰۶)

دوسرے بھائی خواجہ مجدالدین کاشانیؒ نے بھی حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات اور کرامات پر مشتمل دو کتابیں تالیف کیں۔ ایک کا نام غرائب الکرامات اور دوسری کا بقیۃ الغرائب ہے۔ یہ دونوں بھی کمیاب ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے تراجم کی اشاعت کا اعلان ہوا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی چھپے نہیں۔ اصل فارسی نسخے بھی ابھی تک ناپید ہیں لیکن ایسا گمان ہوتا ہے کہ ان میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے اسلاف اور آپ کے اجازت یافتہ خلفاء کے حالات و کرامات و ملفوظات سے متعلق بہت قابل قدر خزانہ ہوگا۔ خواجہ مجدالدین کی تیسری تالیف دیوان عین الحیات ہے۔ ممکن ہے یہ شعری دیوان ہو۔

تیسرے بھائی خواجہ رکن الدین دبیر کاشانیؒ اپنی تالیف شمائل الاتقیاء کی وجہ سے حلقۂ اہل تصوّف میں خاصی معروف اور محترم ہستی ہیں۔ یہ کتاب چشتی سلسلے کے سلوک اور طریق تعلیم و آداب کے بارے میں نہایت جامع اور مستند ہے۔ بزرگانِ چشت نے برسوں تک اسے اپنا رہنما بنایا ہے۔ اس کا ترجمہ دکھنی زبان میں اسی نام سے میراں یعقوب نے کیا تھا جس کے قلمی نسخے حیدرآباد دکن کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔[۱]

خواجہ رکن الدین دبیرؒ نے بھی حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات "نفائس الانفاس" جمع کیے تھے۔ یہ کتاب بھی غیر مطبوعہ ہے۔ ان کی تیسری معلوم تصنیف فن سلوک میں رموز الوالہین ہے۔

خواجہ حمادؒ کاشانیؒ کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بقیۃ الغرائب میں ان کے حالات کے علاوہ کچھ ملفوظات بھی قلم بند ہوئے تھے۔ وہ کتاب دریافت ہو جائے تو ہم ان کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

خواجہ حمادؒ کو سماع کا بہت ذوق تھا۔ چنانچہ ۱۲؍ جمادی الاولیٰ ۷۶۱ھ کو ایک محفل میں انھیں

---

۱؎ ملاحظہ ہو: فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو: مرتبہ ڈاکٹر زور، جلد ۴، صفحات ۱۵۸-۱۵۹

فہرست کتب خانہ سالار جنگ: مرتبہ نصیر الدین ہاشمی

فہرست کتب خانہ آصفیہ

اس کے دو نسخے — جن میں ایک نسخہ ۱۰۴۷ھ کا لکھا ہوا ہے — کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں موجود ہیں۔ (فہرست مرآۃ العلوم: جلد اوّل، ص ۲۲۲)

تمام رات اس شعر پر وجد و حال رہا:

اے اجل آن قدرے صبر کن امروز کہ من
لذّتے گیرم ازان زخم کہ بر جانم زد

اور صبح کو اسی وجد کے عالم میں انتقال فرمایا۔ ان کا مزار گلبرگہ کے نواح میں "سکر بھکر" نامی قصبہ میں ہے۔

## حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ

حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ بن شیخ محمد محمود ہانسویؒ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں جن کی کوششوں سے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کو دکن میں فروغ حاصل ہوا۔ حضرت برہان الدین غریبؒ ۶۵۴ھ میں ہانسی (ہریانہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ ۶۹۳ھ میں آپ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور غالباً ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں دکن کا سفر اختیار کیا تھا جہاں آپ نے ۷۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ مزار مبارک خلد آباد (مہاراشٹر) میں ہے۔

آپ کو حضرت نظام الدینؒ سے بے حد عشق اور عقیدت تھی جس کی وجہ سے تمام عمر نہ اس سمت کو پشت کی جدھر غیاث پور (موجودہ بستی نظام الدینؒ) واقع تھا، نہ اُدھر کو تھوکا۔[۵۱] حضرت امیر خسروؒ، حضرت میر حسن دہلویؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی آپ کے گرویدہ تھے اور اپنا وقت اکثر ان کی خدمت میں گذارتے تھے۔

مؤلف سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ انھیں سماع کا خاص ذوق تھا اور ان کا محفل سماع میں وجد و رقص کا بھی مخصوص طرز تھا جو "برہانی طرز" مشہور ہو گیا تھا۔[۵۲]

---

۵۱ سیر الاولیاء (مطبع محب ہند، دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء): صفحات ۲۷۸ و بعد

۵۲ ایضاً: ص

# حضرت محبوب الٰہیؒ کی رنجش کا واقعہ

مؤلف سیر الاولیاء نے ایک واقعہ بھی درج کیا ہے؛[۱] ——— ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت برہان الدین غریبؒ سے ناخوش ہو گئے تھے۔ اور حضرت امیر خسروؒ کی وساطت سے حضورؒ کی رنجش دُور ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ مولانا برہان الدین غریبؒ چھریرے بدن کے تھے اور کثرت ریاضت سے ہڈیاں بھی نکل آئی تھیں، پھر عمر شریف بھی ستر سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اپنی خانقاہ میں اکثر ایک کمبل دوہرا بچھا کر اس پر نشست کرتے تھے۔ یہ طریقہ مشائخ کرام کا رہا ہے۔ علی زنبیلی اور ملک نصرت دونوں سلطان علاء الدین خلجی کے مقربان خاص میں سے تھے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے خدا جانے کن لفظوں میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے یہ بیان کیا کہ خواجہ برہان الدینؒ "مسندِ شیخی" پر بیٹھتے ہیں۔ کہ جب مولانا برہان الدینؒ حضور کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان سے بات نہیں کی اور مولانا برہان الدینؒ پا بوسی کے بعد وہاں سے آ کر جماعت خانے میں بیٹھ گئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے خادم خاص اقبالؒ یہ فرمان لے کر آئے کہ تم اسی وقت اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ مولانا برہان الدینؒ سخت حیران تھے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور حضور محبوب الٰہیؒ کس سبب سے ناراض ہیں؟ خیر جماعت خانے سے نکل کر اپنے ایک قدیم اور مخلص دوست مولانا ابراہیم کے مکان پر غیاث پور ہی میں مقیم رہے لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ کی خفگی ایسی نہیں تھی کہ آپ کے معتوب کو کوئی اپنے گھر میں پناہ دے سکتا۔ انھوں نے بھی دبے لفظوں میں یہی کہا کہ یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ اگر محبوب الٰہیؒ کو یہ اطلاع ملے گی کہ میں نے تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی ہے تو ایسا نہ ہو کہ مجھے ان کے دل کو تکلیف پہنچانے کا عذاب ملے۔ مولانا برہان الدینؒ دہلی شہر کی طرف چلے گئے اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ہر وقت زار و قطار روتے تھے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شیخ کو کس طرح خوشنود کریں ——— سارے شہر میں یہ خبر اُڑ گئی کہ

---

[۱] حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار، صفحات ۹۳-۹۴ میں یہی واقعہ نقل کیا ہے (مطبع مجتبائی ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)۔ اس کے آخر میں اتنا اضافہ ہے کہ مدھیہ پردیش کا شہر برہان پور انھیں برہان الدین غریبؒ کے نام پر آباد ہے۔

مولانا برہان الدینؒ معتوب ہوگئے ہیں۔ لوگ انھیں دیکھنے کے لیے آتے تھے تو ان کی گریہ و زاری دیکھ کر ان کا گریہ بھی نہیں تھمتا تھا۔ آخر حضرت امیر خسروؒ نے محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولانا برہان الدینؒ بہت ضعیف ہوگئے ہیں اور بوریا پر بیٹھنے سے ان کے زانو دُکھنے لگتے ہیں اسی وجہ سے کمبل پر نشست رکھتے ہیں اور کوئی سبب نہیں ہے۔ مگر یہ عذر حضور محبوب الٰہیؒ نے قبول نہ فرمایا۔ آخر امیر خسروؒ نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ تدبیر کیا ہو؟ سب نے کہا کہ امیر خسروؒ اپنے گلے میں دستار ڈال کر عفو تقصیر کے لیے شیخ کی خدمت میں جائیں اور معافی طلب کریں۔ چنانچہ ایک دن حضرت امیر خسروؒ نے یہی کیا کہ دستار گردن میں ڈال کر آئے۔ یہ عذر خواہی اور معافی کے لیے حاضر ہونے کی علامت تھی۔ حضرت شیخؒ نے اس عالم میں دیکھا تو فرمایا: "کیوں ترک کیا ہوا؟" کہا: "حضور! مولانا برہان الدینؒ کے جرائم کی معافی طلب کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" محبوب الٰہیؒ نے تبسّم فرمایا اور پوچھا: "وہ کہاں ہیں؟" خادم کو حکم دیا کہ "بلا کر لاؤ!" مولانا برہان الدینؒ اپنے گھر سے مرشد کی خانقاہ میں لائے گئے۔ اب امیر خسروؒ نے ان کی گردن میں بھی دستار ڈال دی۔ اور دونوں عفو طلبی کے لیے سلطان المشائخؒ کے سامنے صف نعال میں کھڑے رہے۔ محبوب الٰہیؒ نے انھیں معاف فرمادیا اور تجدید بیعت سے مشرّف کیا۔[1]

جب سلطان المشائخؒ نے اپنے قدیم مریدوں کو خلافت سے سرفراز فرمایا تو مؤلّف سیر الاولیاء کے چچا سیّد خاموشؒ اور حضور محبوب الٰہیؒ کے خادم خواجہ مبشّرؒ نے سیّد حسینؒ سے کہا کہ مولانا برہان الدینؒ بہت پرانے مرید ہیں اور شیخ کی محبّت و اعتقاد میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ خلافت کے لیے سلطان المشائخؒ کے سامنے ان کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے۔ سید حسینؒ نے کہا کہ میں حضور کے خادم خاص خواجہ اقبالؒ سے کہوں گا کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ بات حضرتؒ کے سمع مبارک تک پہنچادے۔ خواجہ اقبالؒ کو سیّد حسینؒ اور سیّد خاموشؒ سے تعلق خاطر تھا! انھوں نے کہا کہ آپ لوگ تیاّری کر کے آئیے۔ میں مناسب موقع دیکھ کر حضور سے عرض کروں گا۔ اور

---

[1] یہ غالباً ۵ محرّم ۷۰۸ھ (پنجشنبہ) کا واقعہ ہے۔ اس سال کی چودھویں مجلس میں میر حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ اسی دن میر حسن کے بھتیجے میر چھجو اور شمس الدین محلوق ہوئے تھے اور "مولانا برہان الدین غریبؒ سلمہ اللہ تعالیٰ بہ تجدید محلوق شد۔" (فوائد الفواد: طبع لاہور، ص ۲۴)

مولانا برہان الدینؒ کو بھی آمادہ کرکے ساتھ لائیے گا۔

چنانچہ ایک دن خواجہ اقبالؒ مولانا برہان الدینؒ کو سلطان المشائخؒ کے سامنے لے گئے۔ اس وقت سیّد خاموشؒ بھی برابر کھڑے تھے۔ اور سلطان المشائخؒ جماعت خانے کی اوپر کی منزل میں اپنے حجرہ "چوب خانہ" میں پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے۔ آپ نے لحاف اوڑھ رکھا تھا اور صرف چہرۂ مبارک لحاف سے باہر تھا۔ اس وقت خواجہ اقبالؒ نے سلطان المشائخؒ سے عرض کیا کہ مولانا برہان الدینؒ پائے بوسی کے لیے آئے ہیں اور آپ کی عنایات کے امّیدوار ہیں۔ حضورؒ نے آنکھیں کھول کر خواجہ اقبالؒ کو دیکھنا شروع کیا۔ اسی وقت مولانا برہان الدینؒ زمین بوس ہوئے اور خواجہ اقبالؒ نے سلطان المشائخؒ کے جامہ ہائے خاص کا صندوق کھولا۔ اس میں سے "پیراہن و کلاہ" نکالا اور سلطان المشائخؒ کی خدمت میں لائے۔ حضور نے اس پر اپنا دست مبارک رکھا اور خواجہ اقبالؒ نے حضور کے سامنے ہی دونوں چیزیں مولانا برہان الدینؒ کو پہنا دیں اور کہا کہ آج سے تم بھی خلیفہ ہو۔ اس وقت سلطان المشائخؒ خاموش رہے۔ یعنی آپ نے اسے قبول فرمایا۔[1]

فوائد الفواد میں حضرت برہان الدین غریبؒ کا حوالہ چار جگہ آیا ہے۔[2] ان میں سے تین مجالس میں یعنی ۷ محرم ۷۰۸ھ، ذی قعدہ ۷۰۸ھ اور ۲۳ محرم ۷۱۲ھ ہم انھیں موجود پاتے ہیں۔ ایک موقع پر حضور محبوب الٰہیؒ نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے پوچھا ہے کہ کہاں رہتے ہو؟ انھوں نے فرمایا کہ مولانا برہان الدین غریبؒ کے گھر چلا جاتا ہوں۔ فرمایا:

"مرد سرہ باش، ہر کجا کہ خواہی باش۔"[3] (کھرے انسان بن کر ہو کہیں بھی رہو)

---

[1] یہاں تک سیر الاولیاء صفحات ۲۷۹۔ ۲۸۲ سے ماخوذ ہے۔

[2] فوائد الفواد: صفحات ۲۴؛ ۵۵؛ ۷۳؛ ۱۴۳؛ ۴۰۳

[3] فوائد الفواد: ص ۷۳؛ سیر الاولیاء: ص ۲۷۹۔ جیسا کہ آگے ہم نے خیر المجالس کے متعلق اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ان سے گہرے مراسم تھے اور وہ جب دہلی شہر میں جاتے تھے تو مولانا برہان الدین غریبؒ کے مکان پر قیام کرتے تھے۔ مولانا برہان الدینؒ کے انتقال کے بعد ہر سال ان کا عرس بھی حضرت چراغ دہلویؒ بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔

# خیر المجالس

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات خیر المجالس میں بارہ جگہ حضرت برہان الدین غریبؒ کا حوالہ ملتا ہے۔[1]

پہلی ہی مجلس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت چراغ دہلویؒ ہر سال خواجہ برہان الدین غریبؒ کا عرس کرایا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلی مجلس جس روز حمید قلندر نے قلمبند کی ہے وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے عرس کا دن تھا:

"پابوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ خواجہ (حضرت چراغ دہلویؒ) نے مولانا برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کی روح مقدس و مطہر (کو ایصال ثواب کرنے) کے لیے کھانا پکوایا تھا اور آج ان کا عرس تھا۔ افطار کے بعد خود زبان مبارک سے فاتحہ پڑھی اس نیت کے ساتھ کہ "بروح مطہر مولانا وسیدنا برہان الحق والدین فاتحہ بخوانیم"۔ بندہ نے دل میں کہا۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہے درویشوں کا مولانا برہان الدینؒ خود اتنے برسوں تک (حضرت چراغ دہلیؒ کے) قصے اور کرامات اپنی مجلسوں میں بیان کرتے رہے اور یہ ان کے لیے فاتحہ پڑھ رہے ہیں کہ "بروح مطہر سیدنا برہان الحق والدین"۔ حق محبت کی کیسی رعایت ہے۔ مولانا (غریبؒ) کے انتقال کے بعد سے کتنے برس ہوگئے ہر سال ان کا عرس کرتے ہیں۔ یقیناً انھوں نے اپنے شیخ (حضرت نظام الدین محبوب الٰہی) قدس سرہ العزیز کے اخلاق سے بہرۂ وافی پایا ہے۔ الغرض جب تمام خلق خدا چلی گئی تو بندہ نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ اس ناچیز نے حضور مولانا برہان الدین غریبؒ (کے ملفوظات کی) بیس مجلسیں لکھی تھیں۔[2] اس میں ایک حکایت آپ سے متعلق بھی انھوں نے بیان کی ہے۔ وہ بھی میں نے اس کتاب میں لکھی ہے۔ اگر حکم ہو تو پیش کروں۔" خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا: "اچھی

---

[1] خیر المجالس: مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، صفحات ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲؛ ۱۸۶، ۱۸۷؛ ۲۴۰؛ ۲۶۰، ۲۷۹؛ ۲۸۴، ۲۸۵

[2] حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار، صفحات ۹۳، ۹۴ میں یہی واقعہ نقل کیا ہے (مطبع مجتبائی ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء) اس کے آخر میں اتنا اضافہ ہے کہ مدھیہ پردیش کا شہر برہان پور انھیں برہان الدین غریبؒ کے نام پر آباد ہے۔

بات ہے۔" اس موقع پر (حضرت چراغ دہلیؒ) لوگوں کو وداع کرنے اور معذرت طلب کرنے کے لیے اٹھ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ اسی طرح کھڑے کھڑے سُن لیں۔ مگر شیخ زین الدین نے جو آپ کے بھانجے بھی ہیں، عرض کیا کہ یہ قصّہ طویل ہے۔ تو خواجہ تشریف فرما ہوئے اور بندہ کو حکم دیا: "سُناؤ!" بندہ نے شروع کیا کہ حضرت مولانا برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سُنا کہ ایک بار حضرت شیخ نظام الدین قدّس سرّہ سے مجھے کلاہ نمد ملی تھی، وہ کھو گئی۔ اس کی وجہ سے میں سخت پریشان ہوا اور فریاد و زاری کرنے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ خداوند مولانا محمود (حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ) کی خدمت میں جاؤں اور ٹوپی کے گم ہونے کا ماجرا سُنایا۔ اس شب مولانا محمود (سلّمہ اللہ العزیز) عالم مشغولی میں تھے [لہ] فرمایا: "جاؤ اس سے بڑی اور بہتر نعمت تم کو ملے گی۔" یہاں بندہ نے عرض کیا کہ مجھے کئی بار یہ خیال آیا کہ حضور سے دریافت کروں یہاں "درکار بودن" کا کیا مطلب ہے؟ خواجہ نے فرمایا کہ "درکار بودن" یہ ہے کہ مشغولی، استغراق، اور ذوق کا عالم ہو۔ غرض مولانا برہان الدین علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جب مولانا محمود سلّمہ اللہ نے فرما دیا کہ اس سے بہتر اور بڑی نعمت پاؤ گے تو مجھ بندے نے ان کی بات پکڑ لی اور اپنے شیخ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس روز شیخ نے اپنا "مصلّائے صف" مجھے عنایت فرمایا۔ اور یہ نعمت اس (ٹوپی) سے بہتر اور بڑی تھی۔" جب بندہ نے یہ حکایت ختم کی تو خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ آج کتنے برس کے بعد یہ قصّہ یاد دلایا ہے۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: مولانا برہان الدینؒ کے ملفوظات لاؤ۔ بندہ نے پھر عرض کیا: مولانا برہان الدین علیہ الرحمۃ ہی نے حضور سے اتنی عقیدت اور محبت میرے دل میں پیدا کر دی ہے۔ میں نے بارہا دل میں سوچا ہے کہ ایسا بزرگوار صاحبِ کشف و کرامات، ممتاز درویش، مردِ واصل، صاحبِ ولایت، عاشق سوختہ جب حضور سے استمداد کرتا ہے اور نعمت پاتا ہے تو حضور کی بزرگی کا کیا ٹھکانا ہے۔ یا اللہ! کب وہ دن آئے گا کہ میں بھی اس سعادت سے فائدہ حاصل کروں۔ اس موقع پر حضور خواجہ نے فرمایا: ہم تمھیں کیا کہیں قلندر یا صوفی؟

---

لہ یہاں فارسی میں "درکار بود" استعمال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت آگے آتی ہے۔

قلندر کہیں تو کیسے، تم تو طالب علم ہو"۔ بندہ نے عرض کیا کہ میں ایک دن شیخ (نظام الدینؒ) کی خدمت میں حاضر تھا اور انھوں نے دستر خوان بچھا رکھا تھا اور افطار کر چکے تھے۔ عین کھانے کے دوران ایک روٹی ٹوٹ گئی۔ آدھی اپنے سامنے رکھی اور آدھی مجھے مرحمت فرما دی۔ بندہ نے وہ آدھی روٹی لے کر اپنی آستین میں رکھ لی۔

جب شیخ کی خدمت سے نکل کر باہر آیا تو کچھ قلندر آن پہنچے اور کہنے لگے: شیخ زادے! ہمیں کوئی چیز دو۔

میں نے کہا: میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ قلندروں نے کشف سے معلوم کر لیا اور کہا کہ وہ آدھی روٹی جو تمھیں شیخ کی خدمت میں ملی ہے وہ ہمیں دے دو۔ میں چھوٹا سا تھا۔ سخت حیرت ہوئی کہ انھیں کیسے پتا لگ گیا، ان میں سے تو کوئی وہاں موجود نہیں تھا۔ مجبوراً آستین سے وہ آدھی روٹی نکال کر انھیں دے دی۔ قلندر وہیں دہلیز خانے پر، جو کیلوکھڑی کی جامع مسجد کے پاس تھا، بیٹھ گئے اور اس روٹی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گئے۔ اس اثنا میں بندہ کے والد بھی شیخ کی خدمت سے اُٹھ کر باہر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ اس روٹی کا کیا کیا؟ میں نے کہا: قلندروں کو دے دی۔ انھوں نے افسوس کیا اور کہا: تو نے کیوں دی؟ وہ تو ایک نعمت تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں اُلٹے پاؤں پھر شیخ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت شیخ سمجھ گئے اور خود ہی فرمانا شروع کیا: مولانا تاج الدین[1]! خاطر جمع رکھو۔ تمھارا بیٹا بھی قلندر ہو گا۔ تب میرے والد کو اطمینان ہوا۔ جب حضرت شیخ نے قلندر کہہ دیا، اب آپ (حضرت چراغ دہلیؒ) بھی قلندر ہی فرما رہے ہیں۔"

جب حضرت خواجہ نے یہ داستان سنی تو فرمایا: "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم حضرت شیخ (نظام الدینؒ) کے مرید ہو۔ آؤ تمھیں گلے سے لگا لوں"۔ بندہ نزدیک گیا۔ خواجہ نے بڑی محبت کے ساتھ سینے سے لگایا۔ اس دن بڑی برکتیں دیکھیں الحمد للہ"۔[2]

---

[1] حمید قلندر جامع خیر المجالس کے والد بزرگوار۔ یہ خود بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت تھے۔

[2] خیر المجالس (مجلسِ اوّل): صفحات ۸ - ۱۱

# اخبار الاخیار

دوسری مجلس میں یہ بیان ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے حکم کی تعمیل میں اگلے دن حمید قلندر وہ مجموعہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے جس میں حضرت مولانا برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات انھوں نے جمع کیے تھے اور ایک دوسرے موقع پر اس کا نام بھی اخبار الاخیار بتایا ہے۔[1] اس میں بیس مجلسوں کی گفتگو قلمبند ہوئی تھی۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا: وہ مقام نکالو (جس کا مجلسِ اوّل میں تذکرہ ہوا تھا) اتفاق سے وہاں کا ورق پھٹا ہوا تھا، وہی نکال کر حمید قلندر نے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت نے وہ حکایت پڑھی اور پسند فرمایا۔ پھر کتاب کو شروع سے ملاحظہ فرمایا اور چند جزو پڑھے اور بار بار کہتے جاتے تھے: "درویش! تم نے خوب لکھا ہے۔"

اس وقت حمید قلندر کے دل میں خیر المجالس کے قلمبند کرنے کا خیال القا ہوا اور انھوں نے حضرت چراغ دہلیؒ سے مؤدّبانہ عرض کی کہ "حضور! مولانا برہان الدینؒ خدا رسیدہ درویش تھے۔ حضور علم میں بھی بو حنیفۂ وقت ہیں اور زُہد و تقویٰ میں تو آپ اپنے عہد کے حضرت نظام الدینؒ ہیں۔ میں ان شاء اللہ حضور کی مجلسوں کو بھی قلمبند کروں گا۔"[2] یہ گویا خیر المجالس کی تالیف کا آغاز تھا اور یہ ۷۵۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتقال کو تیس سال اور حضرت برہان الدین غریبؒ کے وصال کو سترہ سال گذر چکے تھے۔

اس کے بعد ۵۵ ویں مجلس میں مولانا برہان الدین غریبؒ کا حوالہ ملتا ہے۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا: "جب یہ دُعا گو اودھ سے (دہلی) آتا تھا تو مولانا برہان الدین غریبؒ کے احباب امیر خسرو، امیر حسن اور دوسرے دوست جب سُن لیتے تھے کہ فقیر آ رہا ہے تو چند روز تک دعوتوں کا سلسلہ رکھتے تھے۔ جب میں یہاں پہنچتا تھا تو متواتر دعوتیں ہوتی تھیں۔ استدعا کے وقت شیخ کی خدمت میں عرضداشت کی جاتی تھی کہ فلاں کو بھیج دیں۔[3] اقبال آپ کا فرمان پہنچاتا تھا۔ میں جاتا تھا شہر میں،

---

[1] خیر المجالس: ص ۲۷۹ [2] ایضاً: (مجلس دوم) صفحات ۱۱-۱۲

[3] یہ آداب خانقاہ میں سے تھا کہ جماعت خانے کے کسی مہمان کی دعوت حضرت کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔

اس سے ایک دن پہلے خبر کردی جاتی تھی[1] اس لیے کہ اگر اسی روز غیاث پور سے شہر آئیں تو بہت تکان ہوجاتی تھی۔ اس روز مولانا برہان الدین غریبؒ کے گھر قیام کرتا تھا، دوسرے دن ان کے ساتھ مل کر جاتے تھے اور عصر کے وقت تک دعوت رہتی تھی، کبھی ایسا ہوتا تھا کہ مغرب کا وقت بھی وہیں ہوجاتا تھا۔ جب واپس آتا تھا تو غیر وقت ہوجاتا تھا اور غیاث پور پہنچنا ممکن نہ ہوتا تھا، اس لیے رات کو بھی مولانا برہان الدین غریبؒ کے گھر رہتا تھا۔ تیسرے دن آخر کوئی دوست آتا تھا اور کہتا تھا: ”نہاری آرہی ہے، کچھ دیر انتظار کیجیے تاکہ چاشت کا وقت گذر جائے۔“ قیلولہ کا وقت ہوتا تھا تب کہیں غیاث پور پہنچتا تھا۔ اس روز بھی حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا تھا۔ غرض ایک دن میں اودھ سے آیا ہوا تھا اور بھائی بھی ساتھ تھے یعنی خواجہ یوسف کے والد۔ اس روز میں نے بہت ہی کم کھایا تھا۔ بھائی مُبشّر کے پاس گئے اور کہا کہ فلاں نے بہت سا کھانا چھوڑ دیا ہے، بیکار جائے گا۔ خدمتِ شیخ میں گذارش کرو۔ مُبشّر حضرت شیخ کی خدمت میں گیا اور کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور کہا کہ جب میں دسترخوان اٹھاتا ہوں تو فلاں (یعنی خود چراغ دہلیؒ) کے سامنے سب کھانا بدستور موجود ہوتا ہے۔ حضرت شیخ نے افطار کے وقت ایک قُرص بھیجی اور فرمایا: یہ سب کھالینا۔ وہ قُرص تقریباً دو سیر[2] کی ہوگی، اس پر حلوا اور رکھا ہوا تھا جو احباب ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ حضرت شیخ رمضان کی پہلی تاریخ سے انھیں سحری کا کھانا اپنے پاس سے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا فخرالدین زرادی[3] اور مولانا حسام الدین مُلتانی[4] و مولانا شہاب الدین امام[5] یہ سب صومِ دوام رکھتے تھے۔ لیکن مولانا برہان الدینؒ

---

[1] یعنی جس روز دعوت ہو اس سے ایک دن پہلے غیاث پور سے دہلی جاتے تھے اور دعوت سے ایک دن بعد واپسی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں دہلی مہرولی اور حوض خاص کے آس پاس آباد تھی۔ غیاث پور موجودہ بستی نظام الدین کا نام تھا۔

[2] یہ سیر آج کل کے سیر سے کم ہوتا تھا۔ دو سیر کو تقریباً موجودہ آدھا سیر کی برابر قیاس کرنا چاہیے۔

[3] حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ ہیں۔ حالات کے لیے دیکھو: اخبار الاخیار، صفحات ۹۱-۹۲۔ غالباً ۶۴۶ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۷۲۸ھ میں حج بیت اللہ سے واپسی میں غرق ہوکر شہادت پائی۔ صاحبِ تصانیف اور عالمِ متبحّر تھے۔ ان کا ایک رسالہ سماع کے موضوع پر کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی کے ذخیرہ مخطوطات میں موجود ہے۔ (سیر الاولیاء: ۲۷۰-۲۷۵)

[4] ۶۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۵۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ ہیں۔ گجرات کے شہر پٹن میں انتقال فرمایا تھا۔ وہیں مزارِ مبارک ہے۔ حالات کے لیے دیکھو: سیر الاولیاء: ۲۵۶-۲۶۲؛ اخبار الاخبار: ۸۹-۹۱

[5] ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار: ص ۷۹؛ سیر الاولیاء: صفحات ۲۹۲-۲۹۰

آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں سحر کھاتے تھے، کھچڑی گھی پڑی ہوئی۔ سب احباب جمع ہوتے تھے اور ہاتھ دُھلواتے تھے، پھر سحری اُٹھالی جاتی تھی۔ غرض جب حضرت شیخ نے وہ قُرص بھیجی تو میں حیران ہوا کہ اتنی بڑی روٹی کیسے کھاؤں گا؟ اس سے تو بیماری ہوسکتی ہے۔[۱] عشار کے وقت وہ قُرص میں نے سامنے رکھ لی۔ تھوڑی سی کھائی، باقی سینت کر رکھ دی اور نماز میں مشغول ہوگیا، چند رکعت نماز پڑھی۔ پھر اس میں سے تھوڑی روٹی کھائی۔ اس وقت ایک تہائی رات گذر چکی تھی۔ غنودگی طاری ہوگئی۔ اس وقت پھر اُٹھا اور دوبارہ وضو کیا۔ تہجّد کی نماز پڑھی، پھر قُرص سامنے رکھ لی اور سب کھالی۔ کوئی بھی زحمت نہیں ہوئی۔

پھر فرمایا کہ اسی زمانے میں ایسا ہوا کہ متواتر تین دعوتیں ہوئیں اور تینوں دعوتوں میں تین تین دن تک شہر میں رہا اور نَو دن تک حضرت شیخ کو نہیں دیکھا۔ دوسری جگہوں سے بھی بُلاوے آئے اور شیخ کی خدمت میں بھی عرضداشت کی گئی۔ ایسا یاد آتا ہے کہ اس وقت (حضرت شیخ کے) خادم نصیر تھے۔ انھوں نے شیخ کا فرمان (مجھ تک) پہنچایا کہ دعوت میں جاؤ۔ میں نے کہا کہ مجھے شیخ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنی ہے۔ میری طلبی ہوئی، شیخ کی خدمت میں گیا۔ فرمایا: کیا کہنا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ بندہ ادھر سے آرہا ہے اور اس اشتیاق کے ساتھ کہ کچھ وقت حضور کے قدموں میں بسر ہوجائے اور روزانہ حضرت شیخ کا دیدار کروں۔ ہر شخص دعوت میں کھینچتا ہے اور حضور کی خدمت میں عرضداشت پیش کرتا ہے۔ حضور کا فرمان ہوتا ہے: جاؤ! پہلے دن جاتا ہوں تو مولانا برہان الدین غریبؒ کے گھر رہتا ہوں۔ دوسرے روز دعوت ہوتی ہے، اس روز بھی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ تیسرے دن بھی کوئی مزاحم ہوجاتا ہے اور کہتا ہے: ناشتہ کرلو۔ قیلولہ کے وقت یہاں پہنچ پاتا ہوں۔ اس روز بھی حضور سے ملاقات نہیں ہوپاتی۔"

اس پر حضرت شیخ نے خواجہ سے کہا کہ اس شخص کو بُلاؤ جو مولانا کو طلب کرنے آیا ہے اور اسے واپس کردو، یہ کہدو کہ شہر کے احباب کو یہیں بھیجدو۔ فلاں کو معاف رکھو۔ وہ سب لوگ شکستہ دل واپس ہوگئے۔"[۲]

---

[۱] یعنی مقدار میں زیادہ ہونے کے سبب سے معدے میں گرانی ہوسکتی ہے۔

[۲] خیر المجالس: صفحات ۱۸۵-۱۸۷

اس کے بعد ۷۷ ویں مجلس میں پھر مولانا برہان الدین غریبؒ کا تذکرہ آیا ہے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اپنے مرشد حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کا زمانہ یاد کر رہے ہیں کہ "یا اللہ! وہ بھی کیسے لوگ تھے، کتنے صابر تھے، کیا زمانہ تھا" اس وقت کے کچھ لوگوں کے نام لیے کہ "مولانا برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کیسے بزرگ تھے![1]" وغیرہ۔

مجلس ۸۹ میں بیان ہوا ہے کہ "جب بھی حضرت چراغ دہلیؒ اپنے شیخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں آتے تھے چالیس دن یا کم و بیش وہاں قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں جماعت خانے میں اتنے مسافر بھی نہیں ہوتے تھے۔ پھر بیس دن یا دس دن قیام رہنے لگا۔ ایک بار شیخ نے بطریق مرحمت فرمایا کہ مجھے تمہارے یہاں ٹھہرنے سے کوئی گرانی نہیں ہے مگر کیا کروں، مسافر زیادہ ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے دل میں یہ خیال نہ گذرے کہ پہلے چالیس دن رہتا تھا اور اب دس دن پر نوبت آگئی ہے۔ اس کے بعد ہی چھٹے یا ساتویں دن اقبال (خادم) آیا اور کہا: "تیاری کرلو"۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہا: ملاعنہ کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ ابھی سلطان علاء الدین نے شیخ کی خدمت میں آدمی بھیجا ہے کہ ملاعنہ کا خطرہ ہے۔ آپ شہر کے اندر آجائیں اور حضرت شیخ کل ورنہ پرسوں شہر میں تشریف لے جائیں گے۔ اسی وقت یہ خبر آئی کہ جانوروں کو مقرر کر دیا گیا ہے جو اطراف کے باشندوں کو سوار کر کے شہر میں لائیں گے پھر سب دیہات تباہ کر کے کھیتوں کو آگ دے دی جائے گی۔ میرے جانور مولانا فخر الدین زرادی کے گانو میں تھے۔ مولانا فخر الدین کے رشتہ داروں میں سے کسی کا گانو تھا۔ اس نے مولانا کے گانو میں مویشیوں کو بھیج دیا تھا۔ میں نے رقعہ لکھ کر اپنے مویشی منگوائے اور پھر مولانا برہان الدین غریبؒ کو رقعہ لکھا کہ بندہ کل شیخ کی خدمت سے وداع ہوگا اور ان سے رخصت ہونے کے بعد اور کہیں جا نہیں سکتا۔ لہٰذا ہمارے تمہارے درمیان یہ رقعہ ہی (وداعی پیغام) ہے۔ مولانا برہان الدین غریبؒ نے جواب لکھا کہ میں کل تمہیر، کیلوکھڑی میں الوداع کہنے خود آؤں گا۔"

خیر المجالس کے عام نسخوں میں تو یہ واقعہ یہیں تک ہے لیکن کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کا

---

[1] خیر المجالس (مجلس ۷۷) : ص ۲۴۰

مخطوطہ جو ۱۳۱۳ھ کا لکھا ہوا ہے، اس موقع پر ایک دلچسپ اضافہ بھی رکھتا ہے جسے مرتب خیر المجالس نے مطبوعہ فارسی متن کے حاشیے پر درج کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "اسی سفر میں ایک ترک لونڈی بھی حضرت کے ساتھ تھی۔ راستے میں اس نے حضرت چراغ دہلیؒ کی طرف "تیز نگاہوں" سے دیکھا اور ایک مرحلے پر آپ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دیکھا کہ سامنے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کھڑے ہیں اور دانتوں میں اُنگلی دبا کر اشارے سے منع کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور "غلبۂ حیا" سے بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد تو گویا خواہشِ نفسانی بالکل سلب ہی ہو گئی۔ بعد کو جب شیخ کی خدمت میں آئے تو انھوں نے فرمایا کہ مرید پر پیر کا حق وہی ہے جو تم نے پورا کیا کہ جوتے بھی نہ پہنے اور ننگے پانو ہی چلے آئے کہ اس سے بھی تعمیلِ حکم میں تاخیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اپنے بیوی بچّوں کو الوداع بھی نہ کہا ــــــ یہ پیر کا حق تھا مرید پر۔ مگر مرید کا حق پیر پر وہ تھا جو تم نے راستے میں دیکھا۔ بندہ کو جب یاد آیا تو شرمندہ ہوا۔"[۱]

لیکن حضرتِ چراغ دہلیؒ کے ملفوظات میں اس واقعہ کا اضافہ کسی نے بعد میں کر دیا ہے۔ یہ قصّہ سیرالاولیاء اور جوامع الکلم میں بھی ملتا ہے۔ موخرالذکر میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور ان کے ایک مرید کے مابین بتایا گیا ہے۔

خیر المجالس کا ضمیمہ جو آصفیہ کے مخطوطے میں ہے۔ اس میں وہی کلاہ کے گم ہونے کا قصّہ ہے، جس کا تذکرہ پہلی مجلس میں بھی آیا ہے اور جسے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ ضمیمہ کی عبارت کے مطابق جب مولانا برہان الدین غریبؒ سے حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی عطا کردہ کلاہ نمد گم ہوئی ہے، وہ سراسیمہ و پریشان حضرت چراغ دہلویؒ کی خدمت میں آئے۔ اس وقت "حضرت شیخ نصیر الدین ہم در خانہ ایشاں بین العصر و المغرب بہ استغراقے تمام مشغول بودند۔"[۲] گویا حضرت چراغ دہلویؒ انھیں کے گھر میں مہمان تھے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب ان کی بشارت کے مطابق اس سے بہتر نعمت یعنی "مصلّائے خاص" شیخ سے عطا ہوا تو یہ فرطِ مسرّت سے اسے صندوق میں رکھنے لگے۔ اس وقت وہ گم شدہ کلاہ بھی اسی

---

[۱] خیر المجالس (مجلس ۸۹) : ص ۲۶ [۲] ایضاً : حاشیہ (اضافہ از نسخۂ آصفیہ حیدرآباد) ص ۲۶۰

میں مل گئی ہ[1]

# احسن الاقوال

یہاں تک حضرت برہان الدین غریبؒ کے بارے میں تقریباً وہ سب حقائق بیان ہوئے جو ہم عصر ماخذوں سے ملتے ہیں۔ اب ہم آپ کے ملفوظات احسن الاقوال کے مشمولات کی طرف آتے ہیں اور اس کتاب کے صرف ان حصّوں کا اقتباس پیش کریں گے جو حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے احوال و ملفوظات سے متعلق ہے۔

ملفوظات کا یہ مجموعہ مجلسوں کے اعتبار سے مرتّب نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں سلوک و تصوّف اور اخلاق سے متعلق موضوعات قائم کیے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت مولانا برہان الدین غریبؒ کے فرمودات درج ہیں۔ جا بجا آپ نے اپنے شیخ حضرت محبوب الٰہیؒ یا شیخ شیخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا کوئی واقعہ بطور سند پیش کیا ہے اور ان میں سے بیشتر ملفوظات یا واقعات ایسے ہیں جن کا حوالہ دوسری ہم عصر کتابوں میں نہیں پایا جاتا ہے[2]

## حضرت باباصاحبؒ کا تذکرہ

(۱) (حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ) فرماتے تھے کہ جو شخص ایک چیز کسی کو دینے کی نیّت کرلے وہ دوسرے کو نہ دے اور جس کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی نیّت یہ چیز دوسرے کو دینے کی ہے تو اس

---

[1] خیر المجالس (ضمیمہ) : ص ۲۸۵ [2] حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات صرف وہی مستند ہیں جو فوائد الفواد، سیر الاولیاء، احسن الاقوال اور خیر المجالس میں ملتے ہیں۔ راحت القلوب : موضوع کتاب ہے اور اس کے بارے میں تفصیلی تجزیہ اسی کتاب میں علاحدہ شامل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے ذخیرۂ شیرانی میں ایک قلمی نسخہ خیر الاذکار کا ہے جو شعبان ۱۲۴۲ھ (مارچ ۱۸۲۷ء) میں کتابت ہوا ہے (نمبر ۲/۶۲۷۰)۔ اسے فہرست مخطوطاتِ شیرانی (۲/۲۱۶) میں ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ بتایا گیا ہے۔ میں سرِدست اس کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس عہد کی تالیف ہے۔ فہرست میں اس کے مولّف کا نام محمد بن غلام محمد لکھا ہے۔ میں نے اس کا حوالہ ابھی تک کہیں نہیں دیکھا ہے۔ اسی طرح تصوّف میں ایک رسالہ وجودیہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے منسوب ہے۔ اس کا خطّی نسخہ کتب خانہ خدا بخش (پٹنہ) میں ہے۔ ملاحظہ ہو: مرآۃ العلوم، جلد سوم، ص ۲۴۱ (مرتّبہ: سیّد اطہر شیر، ۱۹۶۷ء)

چیز کو قبول نہ کرے ..... فرمایا کہ مولانا عماد الدین تیر گرؒ ایک تفسیر شیخ بہاء الدین زکریاؒ[۱] کو دینے کی نیّت سے لے کر چلے تھے۔ جب اجودھن پہنچے اور شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ سے ملاقات کی، کہا کہ ایک صحیح تفسیر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ (کو دینے) کی نیّت سے لے جا رہا ہوں۔ اگر آپ کو خواہش ہو تو لے لیجیے۔ حضرت کے واسطے دوسری تفسیر حاضر کر لوں گا۔ فرمایا:

"فرید رہزنی کو نہیں بیٹھا ہے۔ جو چیز دوسروں کے لیے لائے ہو، ہم کیسے قبول کر سکتے ہیں۔"

## درویش کی خدمت میں خالی ہاتھ نہ جائے

(۲) فرماتے تھے کہ درویشوں کی خدمت میں خالی ہاتھ نہ جانا چاہیے ....

ایک شخص شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں خالی ہاتھ آیا۔ شیخ الاسلام نے فرمایا:

"راستے میں ہری گھاس بھی نہ تھی جو ہاتھ میں لے کر آتا؟"

## شیخ کا اَدب

(۳) (درویشوں کے ادب کا ذکر ہوا اور حضرت برہان الدین غریبؒ نے فرمایا) جس وقت شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ میانے میں سوار ہوتے تو محافے کے سامنے مرید اُلٹے پاؤں چلتے تھے تاکہ شیخ کی طرف مُنھ رہے۔

## شیخ کا اِتّباع

(۴) (شیخ کے اتّباعِ کامل کے ذکر میں فرمایا) لکھنوتی (بنگال) سے ایک وقت شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں ایک شخص نے جھم تلی (ایک قسم کا کپڑا) بھیجا۔ خادم نے شیخ کے لیے قطع کرانا چاہا۔ شیخ نے فرمایا کہ میں نے کبھی شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کو جھم تلی کا کپڑا پہنے نہیں دیکھا، میں کیسے پہنوں؟ شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کا ایک دوست (مرید) حاضر تھا، کہا: "شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ نے جھم تلی کپڑا پہنا ہے۔" شیخ نے فرمایا: "تم ذمّہ دار ہو۔ اگر پہنا ہے، میرے لیے قطع کراؤ۔"

## گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

(۵) ایک شخص شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آیا اور آپ کا دامنِ مبارک پکڑ کے عرض کرنے لگا کہ میرا

---

[۱] ۵۶۰ھ ۶۶۱ھ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ ہیں۔ حضرت بابا فرید صاحبؒ کے ہم عصر تھے۔ (حالات اخبار الاخیار: صفحات ۲۶-۲۸)

بیل گم ہوگیا ہے، آپ دیجیے۔ شیخ نے فرمایا: "فلاں ویرانے میں ہے۔ جا، لے لے۔" وہ شخص گیا اور جہاں پتا دیا تھا وہیں پایا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ سے پوچھا: آپ نے کیسے بتا دیا؟ فرمایا:

"جب اس نے میرا دامن پکڑا میں حق کی طرف رجوع ہوا اور کہا: خداوندا! جو تو مجھ سے کہلوائے گا میں کہہ دوں گا۔"

**تاثیرِ زبان**

(۶) ایک شخص کا گھوڑا گم ہوگیا، وہ شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: میرا گھوڑا دیجیے۔ شیخ نے فرمایا: ایک گھوڑے کے بدلے دو لے۔ عرض کیا: نہیں! وہی میرا گھوڑا دیجیے۔ شیخ نے ستّر تک بڑھایا۔ یعنی ایک گھوڑے کے بدلے ستّر گھوڑے لے۔ اس نے کہا: وہی میرا گھوڑا دیجیے۔ پھر فرمایا: اچھا وُہی گھوڑا تم کو مل جائے گا۔

چند ہی روز کے بعد وہ گھوڑا مل گیا۔ اور شیخ الاسلام کی زبانِ مبارک کی برکت سے ایک مہینے میں اس کے پاس اور ستّر گھوڑے ہوگئے۔

**کشفِ احوال**

(۷) ایک دفعہ سیاہ پوش درویشوں کی جماعت شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آئی۔ شیخ نے خادم سے فرمایا: "ان کے سرگروہ کو فلاں حجرے میں اُتار دو اور حجرے کو باہر سے قفل لگا دو اور دوسرے درویشوں کو جماعت خانے میں اُتار دو۔ درویشوں کو کھانا پانی دو اور سرگروہ کو مت دو۔" شیخ کا جیسا حکم ہوا، خادم نے تعمیل کی۔ تیسرے روز شیخ اس حجرے کے دروازے پر آئے اور فرمایا کہ "اے فلاں! اگر تُو مسلمان ہوتا ہے تو دروازہ کھولتا ہوں۔" وہ مسلمان ہوگیا۔ باہر نکل کر گدڑی اُتاری۔ گدڑی کے نیچے زنار تھی۔ کہنے لگا: "تیس برس ہوئے کہ میں خراسان و ہند کے لنگروں پھرتا ہوں۔ کسی نے مجھ کو پہچانا نہیں۔ مردِ کامل آپ تھے جو پہچان لیا۔

**فرقِ مراتب**

(۸) ایک دفعہ شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ نے حاکمِ مُلتان کو خط میں لکھا کہ "شرف الدولہ کو معلوم ہو۔" فرمایا کہ "شرف الدولہ ہی لکھا ہوں۔ شرف الدین نہیں لکھا، کیونکہ وہ دولت کو پہنچا اور مال و متاع پایا ہے لیکن یہ نہیں جانتا ہوں کہ وہ دین رکھتا ہے یا نہیں۔"

(۹) ایک دفعہ کسی شخص نے لونڈی خریدی اور شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں لایا اور عرض کی کہ اس کا نام مقرّر فرما دیجیے۔ شیخ نے فرمایا: "کیا نام رکھیں؟" عرض کیا: "بادام یا گلِ بادام"۔ شیخ نے فرمایا: "گلِ بادام کہاں سے ہوئی؟ لیکن اس کا نام گلچیں رکھو، کیونکہ اس مُلک میں باغ بہت ہیں اور ممکن ہے اس نے باغوں میں پھول چُنے ہوں۔"[۱]

**قبولیتِ شیخ**

(۱۰) ابتدائی زمانے میں شیخ نظام الدین قدّس سرّہ نے خواب دیکھا گویا کہ شیخ نے ایک مجلس میں جہاں بہت سے صوفی جمع ہیں، داخل ہو کر بیٹھنا چاہا۔ ایک صوفی نے شیخ کو آواز دی کہ آپ اس مجلس میں کیسے آئے؟ شیخ متحیّر ہوئے۔ اسی مجلس میں دیکھا کہ شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ تشریف لائے اور اس صوفی کو سلام کیا اور کہا: "اس کو ہم نے قبول کیا ہے۔" صوفی نے کہا: "اگر آپ نے قبول کیا ہے تو رہنے دو۔"

**الفقر فخری**

(۱۱) فرمایا: ایک دفعہ شیخ الاسلام فریدالدین نوّر اللہ مضجعہ کے یہاں کئی فاقے گذرے۔ شیخ الاسلام کے خدمتگار وغیرہ عاجز ہو گئے اور عرض کیا کہ آپ قطب ہو، فقر و فاقہ کی برداشت کر سکتے ہو۔ ہم بھوک کی تاب نہیں لا سکتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا: "(جو کوئی میرے پاس رہے) اس کو چاہیے کہ میرے ساتھ موافقت کرے اور جو شخص میرے ساتھ نہ رہنا چاہے، چلا جائے اور نکاح کر لے۔ ہمارے بچّوں کو ہمارے سامنے ڈال دے۔ اگر حق جلّ و علا جلائے گا جئیں گے، اگر مارے گا مر جائیں گے۔"

**باباصاحبؒ سماع میں**

(۱۲) (حضرت برہان الدین غریبؒ نے فرمایا:) شیخ کو صاحبِ سماع نہ ہونا چاہیے یعنی سماع میں پہلے نہ اُٹھنا چاہیے۔ جب شیخ کو رقّت یا حال وارد ہو تو کوئی ایک شخص پہلے اُٹھے تاکہ شیخ اس کا مُتابع ہو جاوے ..... جس وقت شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کو حال غالب ہوتا، محمود نام کا ایک مرید تھا، شیخ اس سے فرماتے: "محمود! تُو زندہ ہے؟" یعنی اُٹھ۔ محمود کھڑا ہوتا۔ پھر شیخ

---

[۱] مجھے شبہ ہے کہ آخری جملے میں مُترجم سے کچھ سہو ہوا ہے۔ اصل فارسی عبارت جب تک سامنے نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے۔

وجد فرماتے۔

**زبانِ مبارک کا اثر**

(۱۳) ایک دفعہ ایک شخص شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہٗ کے پاس میوہ لایا اور عرض کیا کہ ہمیشہ میں خود (اس کی قلم) باندھتا ہوں مگر یہ کھٹا ہی ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام نے اس (میوے) کو ہاتھ میں لیا اور فرمایا: "اے میوے! اس کے بعد کھٹا مت ہو۔" پھر جب کبھی میوہ آتا میٹھا آتا اور کھٹا نہ ہوتا تھا۔

## حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے واقعات

احسن الاقوال میں بابا صاحبؒ کا تو ان ہی تیرہ روایتوں میں تذکرہ ہے لیکن حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے حالات و کرامات و ملفوظات سے متعلق روایات تقریباً ہر صفحے پر ہیں۔ ان کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) (حضرت برہان الدین غریبؒ) فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص درویش کے پاس مُہم یا حاجت بر آنے کی نیّت سے کوئی چیز یا خوردہ، یا روپیہ لائے، اگر وہ کام پورا ہونے والا ہو تو درویش ان چیزوں کو قبول کرے ورنہ ان کا لینا حرام ہوگا۔ اس بات پر دلیل یہ ہے کہ .... ایک وقت چند مسافر ہمارے خواجہ شیخ الاسلام نظام الحق والدّین قدّس اللہ سرّہ العزیز کے جماعت خانے میں اُترے تھے۔ ایک آدمی نے گھوڑا خرید کیا اور ایک تنکہ چاندی کا شیخ الاسلام نظام الحق کی خدمت میں (بطور شکرانہ) لایا۔ آپ آرام فرماتے تھے۔ مسافروں نے کہا کہ شیخ آرام فرماتے ہیں، یہ تنکہ ہم کو دے دو تاکہ ہم تکبیر کہیں اور حضرت شیخ الاسلام بھی تکبیر کہیں گے۔ اس آدمی نے دے دیا اور چلا گیا۔ اور چند روز کے بعد وہ گھوڑا گم ہو گیا۔ وہ شخص شیخ الاسلام کی خدمت میں آیا اور کیفیت عرض کی۔ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ "مُسافروں سے کہو کہ اس کے گھوڑے کا جواب دیں۔"[1]

**نیاز لانے والے کا حق**

(۲) (حضرت برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: درویش کے پاس کوئی شخص کچھ چیز لایا ہو اور پھر معلوم ہو جائے کہ اس کو

[1] احسن الاقوال، ص ۷

کوئی مُہم درپیش ہے تو درویش کو اس کے کام میں مشغول ہونا چاہیے خواہ وہ خبر کرے یا نہ کرے۔

اس کے ثبوت میں فرمایا کہ ایک آدمی کسی روز چاندی کا تنکہ (حضرت شیخ نظام الدینؒ کی) خدمت میں لایا تھا، تھوڑی مدّت کے بعد وہ بیمار ہوگیا۔ حضرت شیخ نے اس کی بیماری کی خبر سُن کر فرمایا کہ "وہ چاندی کا تنکہ میرے دل میں کھٹکتا تھا۔ اب اس کے لیے دعا کرنا چاہیے تاکہ وہ صحت پاوے۔"[1]

(۳) ایک وقت شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدّس سرّہٗ کے روضۂ مبارک کا مجاور شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آیا اور کہا: "ہر شخص میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے اور کوئی چیز دے جاتا ہے میں دُعا کرنا نہیں جانتا ہوں۔ آپ کی خدمت میں اطلاع دیتا ہوں کہ کیا کروں؟" شیخ الاسلام نے فرمایا: "جو شخص تیرے حق میں مہربانی کرے تو فقط جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا کہہ دیجیو۔ اس کا کوئی حق تجھ پر نہ رہے گا۔"[2]

## سفر میں جانے کے آداب

(۴) (حضرت برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: جب مرید کسی جگہ سے آئے پہلے اپنے شیخ کو دیکھے، پھر گھر میں جائے اور جو کہیں جاوے شیخ کی نظر کے سامنے سے روانہ ہو جائے.... مولانا نصیر الدین (چراغ دہلیؒ) ادام اللہ برکاتہٗ کو شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نے رخصت کیا، آپ ہمارے سامنے ہی روانہ ہوگئے اور مکان میں کہلا بھیجا کہ میرا گھوڑا فلاں جگہ لاؤ۔ یعنی گھر میں نہ گئے۔[3]

## دعوت کے آداب

(۵) (حضرت برہان الدین غریبؒ) فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص درویش کو دعوت دے، درویش اپنے ساتھ دوسرے آدمیوں کو نہ لے جائے۔ لیکن جب صاحبِ دعوت نے کہا ہو کہ اپنے ہمراہ خادموں اور اہلِ تعریف کو لیتے آؤ.... ورنہ اکیلا جاوے۔ ایک وقت کسی نے شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کو دعوت دی۔ جب شیخ اس کے مکان کو جا رہے تھے، راستے میں ایک دوست کو آتے دیکھا، پوچھا: کہاں جاتے ہو؟ کہا: فلاں شخص نے مجھ کو اجازت دی ہے۔ شیخ نے فرمایا: اس نے

---

[1] احسن الاقوال: ص ۸ [2] ایضاً: ص ۹-۱۰ [3] ایضاً: ص ۱۱

مجھے دعوت (کا اختیار) دیا ہے جس کو میں بُلاؤں وہ آوے اسے دوسرے آدمی کو بُلانا جائز نہیں۔[۱]

## شیخ سے رخصت ہونے کے آداب

(۶) (حضرت برہان الدین غریبؒ) فرماتے تھے کہ پیر کی ناخوشی اور غصّہ کے وقت مرید کو رخصت نہ ہونا چاہیے۔ اگر رخصت ہوگا پیر کی ناخوشی اس میں اثر کرے گی..... میرے بھائی.... خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی کو سلطان نے کسی مُہم پر روانہ کیا۔ وہ حضرت شیخ (برہان الدینؒ) کے پاس رخصت ہونے آئے۔ اتفاقاً اس مجلس میں شیخ کسی دوست پر گرم مزاج ہوگئے تھے۔ اس اثنار میں خواجہ رکن الدین رخصت کے لیے کھڑے ہوئے۔ فرمایا: "میں اس وقت ناخوش ہوں۔ تم تھوڑی دیر جماعت خانے میں ٹھہرو تاکہ میری ناخوشی دفع ہوجائے۔" خواجہ رکن الدینؒ جماعت خانے میں آئے۔ کچھ دیر بعد شیخ نے خواجہ رکن الدین کو بُلایا اور پیراہن مبارک دے کر خوشی کے ساتھ رخصت کیا۔[۲]

## اشاروں میں تربیت

(۷) شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نے فرمایا ہے: کَلَامُنَا اِشَارَۃٌ فَاِذَا صَارَ عِبَارَۃً صَارَ جَفَاً۔ (ہماری تعلیم اشاروں میں ہے۔ جب وہ عبارت میں آتی ہے تو درشت ہوتی ہے۔)[۳]

## مہمان کی راحت کا خیال

(۸) خدمت شیخ (برہان الدین غریبؒ) فرماتے تھے: جو مسافر کسی خانقاہ میں اُترے، خادم پر واجب ہے کہ یہ دو جگہ بتادے: ایک پانی کی جگہ، دوسرے پیشاب پاخانے کی جگہ[۴]

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۱۱ [۲] ایضاً: ص ۱۲ [۳] ایضاً: ص ۱۲

[۴] حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے حالات میں پڑھا تھا کہ جب کوئی مسافر مولانا کی خانقاہ میں آتا تھا تو خادم کو حضرت کا یہ حکم تھا کہ اسے سب سے پہلے پانی کی جگہ بتادو اور پھر بیت الخلا، کا راستہ دکھادو۔ میرا خیال تھا کہ یہ مولانا تھانویؒ کی جزرس طبیعت کا اجتہاد تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اجنبی گھر میں مہمان کے لیے یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ نیا آدمی تکلّف میں اپنی حاجت کو ضبط کیے رہتا ہے۔ اور درجۂ مجبوری میں میزبان سے اظہار کرتا ہے لیکن احسن الاقوال سے معلوم ہوا کہ حضرت برہان الدین غریبؒ کا ملفوظ ہے۔ وہ حضرت نظام الدین اولیارؒ کے تربیت یافتہ تھے اور ان کی خانقاہ کا نظام بھی وہی تھا جو دہلی میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے جماعت خانے کا تھا اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ حضرت نظام الدین اولیارؒ کا بھی ایسا ہی عمل رہا ہوگا۔

## زیارت کے آداب

(۹) کوئی مسافر خانقاہ میں ٹھہرے، وہ جب بازار کو جاوے تو خالی ہاتھ درویش کے پاس نہ آئے۔ ترکاری بھاجی وغیرہ کچھ بھی ہاتھ میں لے کر آئے .... ملک قرآن جب شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرّہٗ کی خدمت میں آتا اور خانقاہ میں ایک دو روز رہتا تو جتنی بار شیخ کے پاس جاتا ضرور کوئی چیز ہاتھ میں لے کر جاتا۔[۱]

(۱۰) جو شخص خوانچہ یا پیالہ یا پاندان اور مثل اس کے درویش کے پاس لے جاوے تو خالی نہ لے جاوے۔ اس کے مناسب چیز ڈال کرلے جاوے .... ایک وقت شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرّہٗ غیاث پور جارہے تھے، راستے میں ایک دوست کو دیکھا کہ خوانچہ آپ کے مطبخ کے لیے لے جارہا ہے۔ فرمایا کہ "درویشوں کے پاس خالی نہ جانا چاہیے، دو پیسے کی روٹیاں (ریوڑیاں ؟) لے اور خوانچے میں رکھ کرلے جا"۔[۲]

## چاقو یا سوئی

(۱۱) فرماتے تھے کہ درویش کے پاس صرف چھری یا اُسترہ نہ لانا چاہیے۔ اگر لائیں تو اس کے ساتھ سُوئی بھی رکھیں کیونکہ چھری، اُسترہ کاٹنے کا ہتھیار ہے اور سُوئی سینے اور جوڑنے کا اوزار[۳]۔ اگر فقط چھری ہو تو اس کے ساتھ گوشت بھی لائیں اور سُوئی کے ساتھ تاگا لانا چاہیے۔[۴]

## شیخ کے اخلاق گواہ ہوتے ہیں

(۱۲) فرمایا: بعض آدمی کہتے ہیں: ہم تیس برس سے شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرّہ کے مرید ہیں۔ دُعاگو (حضرت برہان الدین غریبؒ) کہتا ہے: اگر تم مرید ہو گواہ لاؤ یعنی شیخ کے اخلاق کیا سیکھے ہو؟ اگر ان کو خلال دیں تو خلال کرنا نہیں جانتے۔

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۱۳ [۲] ایضاً: ص ۱۳

[۳] حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات میں اس روایت کا کثرت سے حوالہ دیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا تھا: "مجھے چاقو نہیں چاہیے سُوئی لاؤ۔ میں کاٹتا نہیں ہوں جوڑتا ہوں۔" احسن الاقوال کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ان شگونوں سے ہے جنھیں خانقاہی زندگی میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ لیکن آج کل اسے صوفیا کے "سیکولر نظریات" کی تائید میں بڑی کثرت سے حوالے میں پیش کیا جاتا ہے۔

[۴] احسن الاقوال: ص ۱۵

### شادم از زندگی خویش

(۱۳) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کے دستِ مبارک میں خواجہ برہان الدین غریبؒ نے آئینہ دیا۔ آپ نے ایک سفید بال اپنی ڈاڑھی مبارک میں دیکھا، فرمایا: "الحمد للہ! ہم نے شیخ الاسلام فرید الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں اپنے کالے بال سفید کیے۔"[۱]

### ادب

(۱۴) خواجہ قطب الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ جس وقت شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ العزیز کی زیارت کو آتے، شیخ کے گنبدِ مبارک پر نظر پڑتے ہی فورًا گھوڑے سے اُتر جاتے اور زمین بوس ہوتے اور وہاں سے پیدل زیارت کو جاتے۔[۲]

### زیارت کے آداب

(۱۵) (خواجہ برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا کہ میں ایک دفعہ دہلی سے شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی ملاقات کی نیّت سے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک دوست نے مجھ کو پکڑ لیا، مجبور کیا کہ ناشتہ کیجیے۔ مجبورًا اس کی موافقتِ خاطر کے لیے ناشتہ کیا گیا۔ جب وہاں سے روانہ ہوا، غیاث پور کا راستہ بھول گیا۔ ان دنوں وہ راستہ لُوٹا جاتا تھا۔ جتنا پھرتا تھا راستہ نہیں ملتا تھا۔ آخر جان اور کپڑوں کا خوف ہونے لگا۔ دل میں سوچا کہ اس راستے سے کئی مرتبہ آیا اور گیا ہوں، اب کی مرتبہ کس وجہ سے راستہ بھول گیا ہوں۔ معلوم ہوا کہ مکان سے شیخ کی نیّت سے نکلا تھا اور راستے میں دوسری چیز میں مشغول ہوگیا۔ یہ اس کی شامت تھی۔ اسی وقت عہد کر لیا کہ پھر ایسا نہ کروں گا۔ چند قدم چلا، دیکھا کہ غیاث پور نظر آرہا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچ کر یہ بات عرض کی اور معذرت چاہی۔ شیخ الاسلام نے فرمایا: "ہاں یہی نتیجہ ہونا ہے۔ ایسا نہ کرنا چاہیے۔"[۳]

(۱۶) جب مولانا شمس الدین یحییٰ[۴] رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۲۵ [۲] ایضاً: ص ۲۶ [۳] ایضاً: ص ۲۷

[۴] حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم فاضل تھے۔ مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔ درگاہ حضرتِ محبوب الٰہیؒ کے "چبوترۂ یاراں" میں مدفون ہیں۔ حالات دیکھو: سیر الاولیاء: ۲۲۳-۲۳۶ اخبار الاخیار: ۹۷-۹۸

خدمت میں حاضر ہوتے تو تمام راستے دست بستہ ہو کر آتے۔ ان سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کہا: میں آخر شیخ کے سامنے آتا ہوں۔ جب میں گھر سے شیخ کی ملاقات کی نیّت کر کے چلتا ہوں تو شیخ کی مجھ پر نظر ہوتی ہے۔ بھلا پھر میں شیخ کی نظر میں بے ادب کیسے چلوں؟ [1]

**حج**

(۱۷) ایک دفعہ ایک دوست شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں حج کے واسطے جانا چاہتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ "تم جو دہلی سے غیاث پور تک آتے ہو تو اس کو حج سے کم سمجھتے ہو؟" [2]

**محلوق ہونے کی نیّت**

(۱۸) پہلے روز بیعت کے بعد دُعا گو (خواجہ برہان الدین غریبؒ) کو شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نے حفظِ ایمان (کے نفل) اور اوّابین پڑھنے کا حکم دیا تھا۔۔۔۔ جس وقت دُعا گو شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں پہنچا تو محلوق ہونا چاہا۔ شیخ الاسلام نے فرمایا: کس نیّت سے محلوق ہو گے؟ دُعا گو نے عرض کیا: محلوق ہونے کی نیّت نہیں جانتا ہوں۔ فرمایا: جب کوئی محلوق ہونا چاہے تو نیّت کرے کہ شیاطین کے گھروں کو توڑتا ہوں کیونکہ ہر بال کی جڑ شیطان کا مقام ہے۔

۔۔۔۔ جس وقت ہمارے خواجہ شیخ الاسلام نظام الدین شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہما کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ نے پوچھا: حلق کرانے کی نیّت کیا کرو گے؟ ہمارے خواجہ نے عرض کیا: آپ میری نیّت ہیں۔ شیخ الاسلام نے یہ حدیث پڑھی: اِنَّ الشَّیْطَانَ تَحْتَ کُلِّ شَعْرَۃٍ. (ہر بال کے نیچے شیطان ہے) [3]

**فرمانِ شیخ کی تعمیل**

(۱۹) شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ کی مجلسِ مبارک میں ایک دوست کی ایسے وقت میں طلبی ہوئی کہ اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس دوست نے ایک شخص کو جتا دیا کہ فلاں مقام پر دفن کر دینا اور خود شیخ کی خدمت میں چلا گیا۔ دوسرے روز اس کا خسر جھگڑنے لگا کہ یہ کیسے جائز ہوگا کہ تیری کئی سال کی ہم خوابہ اور رفیق انتقال کرے اور تو اس کے شریکِ حال نہ رہے۔ اس

---

[1] احسن الاقوال: ص ۲۸ [2] ایضاً: ص ۲۸ [3] ایضاً: ص ۲۹

دوست نے کہا: (یہ سچ ہے مگر) مجھ کو شیخ کی فرماں برداری اس سے بڑھ کر تھی۔"[۱]

## اتباعِ شیخ

(۲۰) (برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: ایک روز میں تنگ آستین کی بارانی پہن کر شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں گیا۔ شیخ نے اس طریقہ سے مجھ کو تنبیہ فرمائی کہ "کیا تمہارا شیخ تنگ بارانی پہنتا ہے؟"

کسی زمانے میں ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ حوض قتلغ خاں پر اشراق کی نماز ادا فرما رہے تھے۔ چند درویش آپ کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ یہ شیخ بہاء الدین" کے سلسلے کا درویش معلوم ہوتا ہے۔ یعنی تعلق شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے رکھتا ہے۔ ایک نے پوچھا: تم کو کیسے معلوم ہوا؟ کہا: "دستار اسی خاندان کے طرز پر بندھی ہے۔" جب شیخ الاسلام نماز سے فارغ ہوئے فوراً دستار اُتار لی اور فرمایا: "مجھ کو ایسی طرز پر دستار باندھنی چاہیے کہ لوگ مجھے دوسرے خاندان سے نسبت نہ دیں۔"[۲]

(۲۱) فرمایا: ایک شخص شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ کی خدمت میں آیا اور بیعت کی۔ شیخ نے فرمایا: دربانی اختیار کر۔ اس نے عرض کیا: میں حج کی طرف جاؤں گا۔ شیخ نے فرمایا: تُو جانے۔ پھر کسی نے اس شخص کا نام نہ سُنا کہ کہاں گیا اور کیا ہوا۔ اگر وہ شیخ کے فرمان کے مطابق دربانی پیشہ کرتا تو اس کو کیا کیا نعمتیں نصیب ہوتیں مناسب اس کے فرمایا کہ "خدا بچائے کہ درویش کسی کو کہے کہ تُو جانے۔ کیونکہ اس کو اسی پر چھوڑتے ہیں۔"[۳]

## خرقۂ سعادت

(۲۲) جب تک شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ صدرِ حیات میں تھے دُعاگو (خواجہ برہان الدین غریبؒ) جو کپڑے پاتا تھا حفاظت سے رکھتا تھا۔ جب شیخ نے اس جہان سے رحلت فرمائی، دُعاگو نے سب کپڑوں کو جمع کر کے اپنے لیے خرقہ سلوایا۔ جس وقت حق کی طرف جاؤں گا اس کو اپنے ساتھ

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۳۱ [۲] ایضاً: ص ۳۱ [۳] ایضاً: ص ۳۲

لے جاؤں گا۔[1]

## عصا کی حمایت

(۲۳) جس وقت دُعا، گو (خواجہ برہان الدین غریبؒ) دہلی سے آتا تھا ایک چارپائی میرے لیے بطور ڈولہ تیاّر کی گئی تھی۔ دُعا، گو نے چارپائی کے ایک طرف شیخ کا عصا بندھوایا تھا۔ تمام راستے دُعا، گو کا بدرقہ وہی عصا تھا اور اسی عصا کی پناہ میں دُعا، گو آتا تھا۔ جتنے دن کہ دُعا، گو راستے میں تھا یاد نہیں آتا ہے کہ دُعا، گو کا پانْو اس عصا کو لگا ہو یا جس طرف عصا بندھا تھا اس طرف سے ڈولے میں سوار ہوا ہوں (یعنی اولا نگھنے بیں آیا ہو) اچھی طرح یاد نہیں آتا ہے۔[2]

(۲۴) ایک دفعہ خواجہ قطب الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ سے جامۂ خواب ملا۔ کسی وقت اس بستر پر نہ سوتے ہمیشہ چھت پر بندھا رکھتے اور اس کے نیچے سوتے۔[3]

## شیطان سے اخلاق

(۲۵) ایک روز شیخ نظام الدین قدّس سرّہ نماز میں مشغول تھے۔ شیطان نے آپ کے گوشِ مبارک کو کھجلانا شروع کیا۔ (بعد نماز) شیخ نے سرِ مُبارک پیچھے موڑ کر فرمایا: "اے جواں مرد! بس کر اپنے کو کہاں تک تکلیف دے گا۔" یعنی ایسے شیطان کے ساتھ بھی اخلاق سے پیش آئے اور جواں مرد کہا۔[4]

## فریاد رس

(۲۶) فرمایا: شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کے مریدوں میں سے ایک دوست جہاز کے کنارے بیٹھا تھا، نیند نے غلبہ کیا، جہاز سے دریا میں گر پڑا۔ گرنے کے ساتھ ہی شیخ الاسلام کا نام لیا۔ شیخ دریا میں ظاہر ہوئے اور فرمایا: جَاءَ الْغِیَاثُ لَا تَخَفْ یعنی مت ڈر فریاد رس آگیا۔ اور اس مرید کو پکڑ کر جہاز میں ڈالا۔[5]

---

[1] احسن الاقوال: ص ۳۳ [2] ایضاً: ص ۳۴ [3] ایضاً: ص ۳۳ [4] ایضاً: ص ۳۸

[5] ایضاً: ص ۳۸

## بے ادبی کی سزا

(۲۷) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نے امیر خسرو کے لیے سفارشی رقعہ کیلو کھڑی کے کوتوال کو لکھا۔ امیر خسرو نے کوتوال کو رقعہ دیا۔ اس وقت وہ پانی کے کنارے بیٹھا تھا، رقعہ پڑھا اور پانی میں ڈال دیا۔ امیر خسرو نے یہ بات حضرتِ شیخ سے بیان کی۔ شیخ نے فرمایا: "اس نے خود کو پانی میں ڈالا ہے"۔ دوسرے روز سلطان اس کوتوال پر غصہ ہوا اور اس کو قلعے کے اوپر سے پانی میں ڈلوادیا۔[1]

## باباصاحبؒ کا عرس

(۲۸) (خواجہ برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: جب شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کا عرس ہوجاتا، شیخ الاسلام قدّس سرّہ دریافت فرماتے کہ اس مجلس میں فلاں دوست تھا؟ اگر کہتے کہ نہیں تھا۔ شیخ پوچھتے: کھانا اس کو پہنچا؟ اگر کہتے کہ نہیں پہنچا، شیخ اس پر فرماتے کہ "(افسوس) بے چارہ اس دولت سے محروم رہا"۔ پھر فرمایا: "شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہ کے عرس مبارک کا کھانا جو ہم کو ملتا تھا میں اس کو خشک کر کے حفاظت سے رکھتا۔ اگر کوئی بیمار آتا تھوڑا کھانا اس میں سے دیتا۔ اس کی برکت سے وہ صحت پاتا"۔[2]

## شیخ کا تصرّف

(۲۹) جب خضر خاں شیخ الاسلام قدّس سرّہ کی خدمت میں داخلِ بیعت ہوا۔ بیعت کے بعد بُرے احباب نے شراب پینے پر مجبور کیا یہاں تک کہ مجلس آراستہ کی اور خضر خاں کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ دیا۔ خضر خاں نے پینا چاہا۔ حضرت شیخ الاسلام کو مجلس میں دیکھا کہ انگشت مُبارک دانتوں میں پکڑے ہیں (منع فرماتے ہیں)۔ خضر خاں نے پیالہ صراحی پر مار کر توڑ ڈالا اور اس مجلس سے سلامت اُٹھا....[3]

## موے مُبارک

(۳۰) فرماتے تھے کہ ایک دوست نے شیخ الاسلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک تار مخدوم کی ڈاڑھی مبارک سے جدا ہو کر فرش پر گر پڑا ہے، اگر حکم ہو تو لے لوں۔ فرمایا: لے لو۔

---

[1] احسن الاقوال؛ ص ۳۹ [2] ایضاً: ص ۴۰ [3] ایضاً: ص ۴۰

## ہمارے بایزید

(۳۱) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ کے پاس خواجہ بایزید قدّس سرّہ کی بزرگی کا ذکر ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا: ہم بھی ایک بایزید رکھتے ہیں۔ ایک دوست نے پوچھا: کہاں ہے؟ — فرمایا: جماعت خانے میں ہے۔ خواجہ اقبالؒ (خادم) جلدی سے جماعت خانے میں آئے۔ اس وقت دُعا گو (مولانا برہان الدین غریبؒ) جماعت خانے میں آیا تھا۔ دوسرا کوئی شخص نہ تھا۔ یہ بات اقبالؒ نے دعا گو سے کہی کہ "آپ کے بارے میں شیخ الاسلام نے اس طرح خطاب ارشاد فرمایا ہے۔" [۱]

## حکم عدولی کی سزا

(۳۲) ایک دفعہ مولانا مُنتجب الدین قدّس سرّہ دعا گو کے سامنے کھانا لائے۔ ان سے کہا گیا کہ آج میرا روزہ ہے۔ فرمایا: افطار کیجیے۔ روزہ پھر بھی رکھ سکتے ہو۔ افطار نہ کیا گیا۔ اسی روز شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ کی خدمت میں گیا۔ شیخ نے فرمایا: "مولانا برہان الدین کے سامنے رکھو۔" شیخ کے سامنے لامحالہ افطار کیا۔ جب وہاں سے واپس ہوا جس شخص سے مُلاقات ہوتی تھی اور اس سے کہتا تھا کہ آؤ عصر کی نماز جماعت سے پڑھیں گے۔ وہ کہتا تھا: میں نے پڑھ لی ہے۔ اس شامت کے سبب سے کہ مولانا مُنتجب الدین قدّس سرّہٗ کا حکم رد کیا، روزہ بھی افطار ہوا اور عصر کی جماعت بھی نہ ملی۔ [۲]

## ذرّۂ دردے

(۳۳) شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ کی زبانِ مبارک سے سُنا ہے کہ ایک دفعہ مہتر عیسیٰ علیہ السلام راستے سے جاتے تھے۔ ایک جوان پیش آیا اور کہا: اے عیسیٰؑ! دُعا کرو کہ حق جلّ و علا شربتِ محبّت کا ایک قطرہ میرے حلق میں ٹپکا دے۔ مہتر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تُو تاب نہ لا سکے گا۔ اس نے بہت الحاح اور عاجزی کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی اور چلے گئے۔ چند روز کے بعد اسی راستے سے مہتر عیسیٰ علیہ السلام کا گذر ہوا۔ دیکھا کہ وہ جوان اسی جگہ متحیّر ہے اور آنکھوں سے پانی جاری

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۴۱ [۲] ایضاً: ص ۴۲

ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے سلام کیا، اس نے مُنھ پھیر لیا۔ پھر حضرت عیسیٰؑ نے اس طرف جاکر سلام کیا، پھر جوان نے مُنھ پھیر لیا۔ اسی وقت حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور کہا: ”اے عیسیٰ! حق جل وعلا فرماتا ہے کہ وہ ہماری محبّت میں غرق ہے، اس کو معاف رکھیے“۔

حضرت شیخ نے فرمایا: اس موقع پر دُعاء گو نے شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ اس زمانے کے عیسیٰ ہیں اور دُعاء گو وہی سائلِ (محبّت حق) ہے۔ شیخ نے فرمایا: ”تم نے اچھی چیز مانگی اور اچھے وقت مانگی“ —— پھر یہ بیت زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائی:

از دوست اگر نشانت باید بشنو — آتش بہ ہمہ بزن و برخیز و برو

پھر یہ بیت پڑھی:

آنکس کہ ترا ندید ہیچ ندید — وانکس کہ ترا نیافت ہیچ نیافت

اور یہ دہرہ بھی فرمایا:

دیس بھلاویں ہس راتی سکل سوئے — بہت بُرا یہ جیونا یوں بھی جیوے نہ کوئے

پھر یہ رباعی پڑھی:

پیوستہ خرابات زرندان خوش باد — در خرمن زُہد زاہدان آتش باد

از خرقہ زہد خیز دوز در داند در(؟) — پس خرقۂ من فدائے دردی کش باد

## محبّتِ حق

(۳۴) فرمایا: شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی زبانِ مبارک سے سُنا ہوں: ”مُسبّعات عشر کے بعد جو کوئی سات مرتبہ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مُحِبًّا لَکَ وَ اَمِتْنِیْ مُحِبًّا لَکَ وَاحْشُرْنِیْ تَحْتَ اَقْدَامِ کِلَابِ اَحِبَّائِکَ۔ (اے اللہ! مجھے اپنی محبّت میں زندہ رکھ اور اپنی محبّت میں مار۔ اور اپنے عاشقوں کے کُتّوں کے زیر قدم میرا حشر کیجیو) حق تعالیٰ اس کو اپنی دولتِ محبّت سے مخصوص کرے گا۔

## فتوح کے آداب

(۳۵) (حضرت برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: جس وقت دُعاء گو کو شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نے اجازت (خلافت) دی یہ الفاظ فرمائے کہ ”اے خلفِ شایستہ! مرید کرو“۔ اور فتوح کے بارے میں فرمایا:

لا ردّ و لا کدّ و لا حدّ رہنا یعنی اگر کوئی شخص کچھ لاوے ردّ نہ کرو۔ اور (نہ لاوے تو) کدّ بھی نہ کرو یعنی کسی سے (لانے کی) طمع نہ رکھو اور کوئی چیز تھوڑی لاوے تو اس لیے ردّ نہ کرو کہ زیادہ لاوے۔ اور تعیّن کر کے کوئی چیز قبول نہ کرو....."

(۳۶) فتوح کے صَرف کی شرط: جیسے فتوح پہنچے ویسے ہی جاری رکھے یعنی خرچ کرتا رہے اور شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہٗ سے نقل کرتے ہیں کہ "دس لیتے جاؤ اور ایک ایک دیتے جاؤ۔" اس کی تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ مثلاً ایک شخص دس درہم لایا۔ اگر درویش سب درہم ایک ہی کو دے دے گا تو دوسرے شخص کو جو اس کے برابر (بعد) آئے گا، کیا دے گا؟ پس دس درہم دس آدمیوں کو دیوے اور جو فتوح ملے جمع نہ رکھے۔ اگر جمع رکھے گا، اس کی شامت سے دوسری فتوح نہ ملے گی۔[۱]

**ناقص توکّل**

(۳۷) ایک دفعہ ایک مسافر شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کے نزدیک آیا۔ چند روز کے بعد رخصت ہوا اور دہلی میں قرابت والوں کی ملاقات کو گیا۔ رشتہ داروں کے قریب ایک مسجد تھی، اس میں اس نیّت سے توکّل کر کے بیٹھا کہ رشتہ داروں کے گھر سے روٹی پانی پہنچے گا۔ کئی روز رہا، کسی نے خبر نہ لی۔ آخر پھر شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ اگر کوئی آدمی توکّل کرے اور پہلے روز نہ ملے تو کیا کرے؟ شیخ نے فرمایا کہ دوسرے روز تک صبر کرے۔ عرض کیا: اگر دوسرے روز بھی نہ ملے۔ تو فرمایا: تیسرے روز تک صبر کرے۔ عرض کیا: اگر تیسرے روز بھی نہ ملے۔ فرمایا: پھر اس کا پورا توکّل خدا پر نہ ہوگا کیونکہ جن لوگوں کی نظر خدا پر ہوتی ہے حق جلّ وعلا ان کو ضائع نہیں جانے دیتا۔"[۲]

**غنیِ شاکر**

(۳۸) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ سے سوال کیا کہ فقیرِ صابر اچھا یا غنیِ شاکر؟ شیخ نے فرمایا: "فقیرِ صابر اچھا۔ لیکن غنیِ شاکر بھی اچھا ہے، اس لیے کہ وہ کوئی چیز دیتا ہے اور معلوم نہیں کہ اگر فقیر غنی ہو جائے تو کوئی چیز دے سکے گا یا نہیں۔ البتّہ غنیِ شاکر کوئی چیز (کسی کو) دے دیتا ہے۔"[۳]

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۴۹ [۲] ایضاً: ص ۵۰ [۳] ایضاً: ص ۵۵

## خاندانِ نظامیہ کی خصوصیات

(۳۹) فرمایا: شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ ہمارے خاندان میں یہ دو۲ باتیں ہیں: مخالفت ہوائے نفس، ایصال منفعت للغیر (دوسرے کو فائدہ پہنچانا)۔ پھر فرمایا:

اے کہ مردانِ خدا از سر جان می خیزند
مردِ آن نیست کہ او از سرِنان نتوان خاست

اس کے مناسب یہ دوہرہ بھی فرمایا:

مای رہیا پتر جی جیہا کریہہ
آپ وہی پر ایکاری انت ندیہ کنیہہ[۱]

## صدقہ

(۴۰) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرہ بیمار تھے۔ ہر شخص روٹیاں وغیرہ صدقے کے لیے لاتا تھا، شیخ لیٹ جاتے تھے۔ روٹیاں وغیرہ سر سے پانو تک اُتار کر (صدقہ) دیتے تھے[۲]۔

## حفظِ ایمان

(۴۱) (حضرت برہان الدین غریبؒ نے) فرمایا: حفظ ایمان کا دوگانہ جو مغرب کی سنتوں کے بعد ہے، فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں اخلاص سات مرتبہ اور فلق ایک مرتبہ۔ دوسری میں اخلاص سات مرتبہ، والنّاس ایک مرتبہ پڑھے۔ سلام کے بعد تین یا سات مرتبہ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ ثَبِّتْنِیْ عَلَی الْاِیْمَانِ. کہے۔ شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرہ نے فرمایا ہے: جو شخص یہ دوگانہ ہمیشہ پڑھے گا ان شاء اللہ تعالیٰ ایمان سلامت لے جائے گا[۳]۔

## گُمشدہ کی بازیابی

(۴۲) جس شخص کی کوئی چیز، غلام، گھوڑا یا بیل، چاندی وغیرہ کی جنس سے گم ہو جاوے، اگر وہ بلاناغہ چند روز یہ ورد پڑھے:

"یَا جَامِعَ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ یَا هَادِیَ الْمُضِلِّیْنَ اردد عَلَیَّ ضَالَّتِیْ." وہ گم شدہ چیز مل جاوے ..... ایک شخص کا گھوڑا گم ہوگیا۔ اس نے شیخ الاسلام نظام الدین قدس سرہ کی خدمت میں خبر کی۔ آپ نے یہ ورد تعلیم فرمایا۔ وہ شخص دس سال تک یہ ورد پڑھتا رہا۔ دس برس کے بعد گھوڑا پایا[۴]۔

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۵۵ [۲] ایضاً: ص ۵۷ [۳] ایضاً: ص .
[۴] ایضاً: ص ۶۸

**محفلِ سماع**

(۴۳) ایک دفعہ شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کے یہاں سماع تھا اور یار لوگ سماع میں مشغول تھے۔ حضرت شیخ (برہان الدین غریبؒ) باورچی خانے کی طرف آئے اور فرمایا: ہم کو پیاس بہت لگی ہے۔ ایک دوست (مرید) نے شربت کا پیالہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا: "اے جواں مرد درویش خونِ جگر پی رہے ہیں میں شربت کیسے پیوں؟"[۱]

**وجد**

(۴۴) اگر دیکھیں کہ محفل (سماع) میں کسی کو وجد نہیں آتا ہے تو تواجُد کریں، زبردستی وجد میں آئیں شاید حال اور وجد پیدا ہو جائے۔ اور شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ نقل کرتے ہیں کہ اگر کسی کو سماع میں وجد نہ پیدا ہو تو چند بار کہے: یَاوَاجِدُ یَاوَاجِدُ یَاوَاجِدُ حق تعالیٰ اس کو وجد عطا کرے۔[۲]

**جمع و پریشانی**

(۴۵) ایک دفعہ سماع میں حضرت شیخ الاسلام نظام الدین قدّس سرّہ کی دستار کا پھیر کھُل گیا۔ حضرت شیخ الاسلام نے دستار کو درست کر لیا۔ یہ خبر مُدّعیوں کو پہنچی۔ کہنے لگے: اگر شیخ کو حال تھا تو دستار کا کنارہ کیسے درست کر لیا؟ اگر حال نہ تھا تو وجد کیوں کرتے تھے؟ یہ خبر شیخ الاسلام کو پہنچی کہ مدّعی ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا: اگر فقیر کی دستار کا کور سماع میں (بحالتِ وجد) کھُل جاوے اور فقیر جمع نہ کرے تو اس شہر کی پریشانی کا باعث ہے اور ہم نے پریشان ہونا جائز نہ رکھا۔[۳]

یہ سب وہ روایات ہیں جن میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا حوالہ آیا ہے یا اس میں آپ کا کوئی ملفوظِ مبارک ہے یا کسی واقعہ سے متعلق ہیں۔ ہم نے ان کو اسی ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ جس ترتیب سے احسن الاقوال میں پائی جاتی ہیں۔

اصل کتاب احسن الاقوال فارسی زبان میں ہے اور اس کے قلمی نسخے الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ صرف ایک بار احسن الاقوال المعروف با فضل المقال مطبع جہانگیر صفوی بمبئی سے ۱۳۴۲ھ میں چھپا تھا۔ یہ ۲۶ × ۲۰ سائز کے ۸۲ صفحات کا

---

[۱] احسن الاقوال: ص ۷۱ [۲] ایضاً: صفحات ۷۲-۷۱ [۳] ایضاً: ص ۷۲

رسالہ ہے۔ اس کے مترجم مولوی عبدالمجید خلد آباد ضلع گلبرگہ کے باشندے تھے۔ ترجمہ میں دکھنی بولی کا بہت اثر تھا اور اکثر تذکیر و تانیث کے محل استعمال میں غلطی تھی۔ ہم نے ایسے موقع پر عبارت کو محاورۂ اُردو کے مطابق بنادیا ہے۔

احسن الاقوال اس لحاظ سے ایک اہم ماخذ ہے کہ اس میں حضرت نظام الدین اولیارؒ سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہم عصر شہادت ہے۔ احسن الاقوال ۷۳۸ھ میں مرتب ہوئی اور یہی حضرت برہان الدین غریبؒ کا سالِ وفات بھی ہے۔

کتاب کے شروع میں ایک مختصر مقدمہ مترجم کے قلم سے ہے جس میں اختصار کے ساتھ حضرت برہان الدین غریبؒ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس کی عبارت میں تعقید اور ابہام پایا جاتا ہے۔ بعض بیانات غلط بھی ہیں۔ مثلاً حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"کئی مرتبہ آپ اپنے شیخ (حضرت نظام الدین اولیارؒ) کے ہمراہ شیخ کبیر قطب عالم خواجہ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ کے شرف صحبت سے مشرف ہوئے۔"

(مقدمہ: ص ۵)

یہ اس لیے غلط ہے کہ ایک تو خود حضرت نظام الدینؒ صرف تین بار اجودھن میں اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ دوسرے حضرت برہان الدین غریبؒ ۶۵۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور بابا فریدؒ کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تیسرے انھوں نے ۶۹۳ھ میں حضرت نظام الدین اولیارؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے جب حضرت باباصاحبؒ کے وصال کو ۲۹-۳۰ سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔

کتاب کے متن میں البتہ ایسی باتیں نہیں ہیں جو اسے مشتبہ ثابت کریں بلکہ وہ ہیں جن کا انتساب ہر طرح ان بزرگ صوفیار سے مناسب اور موزوں ہو سکتا ہے۔ صرف ایک موقع پر ایک روایت قصص الانبیار کے انداز کی آگئی ہے۔ لکھا ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس برس تک ایک چور کی تلاش میں تھے اور نہ پاتے تھے لیکن ایک دن ایک جگہ سوتا تھا اس کو پکڑ لیا اور پوچھا کہ چالیس برس

سے تیری تلاش میں ہوں تو کیا کرتا تھا جو سلامت رہتا تھا۔ اس نے کہا: جس وقت میں گھر سے باہر نکلتا۔ ایک روٹی صدقہ دے دیتا تھا اس کی برکت سے سلامت رہتا تھا۔ آج صدقہ نہیں دیا، اس لیے گرفتار ہوا۔"

(ص ۵۷)

جہاں تک قصّہ کے مقصد کا تعلّق ہے وہ صرف یہ ہے کہ صدقہ بلاؤں کو رد کرتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے لیکن اس میں مبالغہ نے خلاف واقعہ ہونے کا رنگ پیدا کر دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی عمر خود چالیس برس کی نہیں ہوئی چہ جائیکہ وہ کسی چور کی تلاش میں چالیس برس رہے ہوں۔

ایک اور موقع پر بھی مبالغہ آمیز بیان ہے:

"حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا ہر رات کو چار سو رکعت نماز اور ہزار بار درود شریف پڑھا کرتیں۔ حضرت رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اے عائشہ! تو اتنی کیوں تکلیف کرتی ہے۔ وتر کے بعد دوگانہ تشفیع الوتر پڑھ۔ حق تعالیٰ تجھ کو چار سو رکعت کا ثواب نصیب کرے گا۔ اور اس دوگانے کے بعد یہ درود شریف ایک مرتبہ پڑھ ہزار درود کا تجھ کو ثواب ملے گا۔" (ص ۶۰)

اس روایت کا مقصد بھی وتر کے بعد دو نفل نماز کے ثواب کو ثابت کرتا ہے۔

احسن الاقوال میں ہندی الفاظ کتنے استعمال ہوئے ہیں اس کا اندازہ تو اصل فارسی کتاب کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے لیکن ترجمے میں تین دوہرے ہندی کے ضرور نقل ہوئے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ہندی زبان و ادب سے کتنی گہری واقفیت حاصل کی تھی۔

احسن الاقوال کے گہرے مطالعے سے چشتی خانقاہوں کے اخلاقی نظام اور تعلیمات کا بھی بہت واضح تصوّر سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اصلاحِ اخلاق میں کس حد تک کوشاں رہتے تھے۔ اس خصوصیت میں یہ مختصر سی تالیف بہت سے ضخیم مجموعوں پر بھاری ہے۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سوانح نگاروں نے ابھی تک اس کتاب کو جو ایک اہم اور معاصر دستاویز ہے، استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کے اشاروں میں بعض قیمتی باتیں مل جاتی ہیں جن سے دوسرے مآخذ کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

# دُرَرِ نظامی

## حضرت بابا فریدؒ اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے حالات کا ایک ماخذ

حضرت نظام الدین اولیا، محبوبِ الٰہیؒ (ف ۷۲۵ھ) کے ملفوظات کا سب سے اہم اور مستند مجموعہ فوائد الفواد ہی ہے جس کے جامع حضرت امیر حسن علا سجزی دہلوی ہیں۔ اس میں شعبان ۷۰۷ھ سے شعبان ۷۲۲ھ تک ۱۸۸ مجلسوں کا حال قلم بند ہوا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے حالات و ملفوظات پر مشتمل کتابیں تالیف ہوئی ہیں جن میں سے اکثر اب ناپید ہو چکی ہیں۔

فوائد الفواد کا تفصیلی اور تحلیلی مطالعہ پیش کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہے۔[1] دوسری اہم تالیف جس سے حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے دوسرے بزرگوں کا حال معلوم ہوتا ہے، خیر المجالس ہے۔ یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ (ف ۷۵۷ھ/۱۳۵۲ء) کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور ضمناً اس میں بہت کچھ معلومات حضرت فرید الدین گنج شکرؒ (ف ۶۶۴ھ) اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (ف ۶۳۴ھ) کے بارے میں آگئی ہیں۔ خیر المجالس کا سنہ تالیف ۶۵۵ھ، ۶۵۶ھ ہے۔ اس کی تکمیل کے

---

[1] بشرطِ توفیق، ارادہ ہے کہ فوائد الفواد کا مفصل تجزیہ اور مطالعہ بھی پیش کیا جائے۔

تقریباً ایک ہی سال کے بعد حضرت چراغ دہلویؒ کا وصال ہوا ہے[۱]

تیسری اہم کتاب احسن الاقوال ہے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور اس کا زمانہ تالیف ۷۳۸ھ ہے۔ اسی سال حضرت برہان الدینؒ کا انتقال ہوا ہے[۲]

سب سے اہم اور مفصّل کتاب سیّد امیر خورد کرمانی کی تالیف سیر الاولیاء ہے جو خیر المجالس کے بعد (غالباً ۷۵۸ھ) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے[۳]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات پر مشتمل اتنے مجموعے مرتّب ہوئے:

(۱) فوائد الفواد: مرتّبہ امیر حسن علاء سجزی دہلوی[۴] اس کا فارسی متن اب تک غالباً پانچ بار چھپا ہے۔ حال ہی میں (۱۹۶۶ء) جناب محمد لطیف ملک نے لاہور سے اس کا بہت عمدہ ایڈیشن چھاپا ہے۔

(۲) انوار المجالس: مرتّبہ خواجہ محمد بن خواجہ سیّد بدر الدین اسحقؒ۔[۵]

(۳) تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار: مرتّبہ عزیز الدین صوفی[۶] یہ نسخہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی نظر مبارک سے بھی گذرا تھا۔

(۴) مجموع الفوائد: مرتّبہ عبدالعزیز ابن ابوبکر مصلّٰی بردار، خواہر زادہ سلطان المشائخ[۷]

(۵) ملفوظات المشائخ: مرتّبہ خواجہ شمس الدین دھاری[۸]

---

[۱] خیر المجالس کا فارسی متن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ عرصہ ہوا مولوی حیدر علی رام پوری کے صاحبزادے مولانا احمد علی سیماب (مترجم: تزک جہانگیری) نے کیا تھا۔ اس کا نیا ایڈیشن حال ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

[۲] احسن الاقوال کے بارے میں ایک مطالعہ اسی کتاب میں شامل ہے۔

[۳] مؤلف سیر الاولیاء نے کہیں اس کا سالِ اتمام نہیں بتایا ہے۔ لیکن اس میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا سنہ وفات (۷۵۷ھ) درج ہے۔ اس سے پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے یہ قیاس کیا ہے کہ سیر الاولیاء کی تکمیل اس سے ایک دو سال بعد ہوئی ہوگی۔

[۴] سیر الاولیاء: ص ۳۰۸ [۵] ایضاً: ص ۲۰۰ نیز ص ۴۷۹ [۶] ایضاً: ص ۲۰۲ [۷] ایضاً: ص ۲۰۷

[۸] ایضاً: ص ۳۱۸

(۶) خلاصۃ اللطائف : مرتبہ مولانا علی بن محمود جاندار[۱]

(۷) دُرَرِ نظامی : مولانا علی بن محمود جاندار ۔

اس فہرست میں صرف اوّل و آخر کی دو کتابیں دستبرد زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں۔

## دُرَرِ نظامی

دُرَرِ نظامی کا فارسی متن ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں بتایا جاتا ہے[۲] لیکن اس کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے[۳]۔ اس کی ترتیب مجالس کے اعتبار سے نہیں ہے، نہ اس میں کوئی تاریخ درج ہوئی ہے بلکہ پوری کتاب کو ۳۰ ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کی تفصیل یہ ہے :

باب اوّل : پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث کا بیان

باب دوم : علم اور علماء کے بیان میں

باب سوم : توحید اور معرفت کے بیان میں

باب چہارم : توبہ کے بیان میں

باب پنجم : اخلاص کے بیان میں

باب ششم : محبّت اور عشق کے بیان میں

باب ہفتم : دیدار باری تعالیٰ کا بیان

باب ہشتم : نماز کا بیان

باب نہم : زکوٰۃ اور صدقہ کا بیان

باب دہم : روزے کا بیان

---

[۱] سیر الاولیاء : ص ۳۴۹ ؛ اخبار الاخیار : ص ۹۴-۹۵

[۲] پروفیسر محمد حبیب : حضرت نظام الدین اولیاءؒ حیات اور تعلیمات۔ نظام خطبات ۱۹۷۰ء، ص ۴

[۳] کتب خانہ نذیریہ۔ اُردو بازار۔ دہلی۔ سنہ ندارد۔

باب یازدہم: حج اور سفر کا بیان

باب دوازدہم: قرآن شریف کے فضائل

باب سیزدہم: ادعیہ و اوراد کا بیان

باب چہاردہم: بیعت اور اصل خرقہ

باب پانزدہم: آداب کے بیان میں

باب شانزدہم: مراقبہ اور مشغولیِ باطن

باب ہفدہم: صحبت کا بیان

باب نوزدہم: توکّل، وجہ حلال اور خوف و رجار کا بیان

باب بستم: ترکِ دنیا اور زُہد و تقویٰ

باب بست و یکم: عزلت اور گوشہ نشینی

باب بست و دوم: اخلاق و لطائف کا بیان

باب بست و سوم: تواضع، تکبّر، تحمّل

باب بست و چہارم: کراماتِ اولیار کا بیان

باب بست و پنجم: اخفائے کرامت کا بیان

باب بست و ششم: ضیافت، آدابِ طعام، بذل و ایثار کا بیان

باب بست و ہفتم: سماع کے بیان میں

باب بست و ہشتم: متفرّقات

باب بست و نہم: مرض کی فضیلت کے بیان میں

باب سی ام: وصالِ بزرگاں کے بیان میں

اس طرح تیس ابواب میں باعتبار موضوع حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے ملفوظات و ارشادات جمع ہوئے ہیں اور ان کا بیشتر حصّہ وہ ہے جو فوائد الفواد اور سیر الاولیار میں بھی موجود ہے۔ کمتر روایات ایسی ہیں جو دُررِ نظامیہ کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔

# خلاصۃ اللطائف

دُررِ نظامی کے مولف کی ایک اور تالیف خلاصۃ اللطائف کا حوالہ سیر الاولیاء میں ملتا ہے۔ غالباً یہ بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حالات و ملفوظات پر مشتمل تھی اور عربی زبان میں تھی۔ مولف سیر الاولیاء نے اس کا ایک اقتباس دیا ہے:[1]

"مولانا علی شاہ جاندار در خلاصۃ اللطائف آوردہ است:

رَأَیْتُ شَیْخِیْ وَمَخْدُوْمِیْ سُلْطَانَ الْمَشَائِخ نِظَامَ الْحَقِّ وَالدِّیْن قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز فِی الْمُرَاقَبَۃِ فَاِذَا اَرَدْتُّ اَنْ اَدْخُلَ فِیْ بَعْضِ الْاَوْقَاتِ فِیْ مَجْلِسِہٖ مَرَّۃً. رَأَیْتُ جَالِسًا سَاکِنًا حسن الْاِجْتِمَاع لَا یَتَحَرَّکُ مِنْ ظَاہِرِہٖ شَیْءٌ وَّہُوَ فَاتِحٌ عَیْنَیْہِ. قَدْ اَخْبَرْنَا فَلَا یَعْرِفُنِیْ فَقَالَ لِیْ: مَنْ اَنْتَ؟ فَاِذَا رَأَیْتُہٗ فِیْ ہٰذِہٖ الْحَالَۃِ اَرَدْتُّ اَنْ اَرْجِعَ الْقَہْقَرٰی فَمَسَحَ عَیْنَیْہِ فَعَرَفَنِیْ فَقَالَ اِجْلِسْ. فَجَلَسْتُ فَتَکَلَّمَ مَعِیْ وَہُوَ یُدَوِّرُ عَیْنَیْہِ کَاَنَّہٗ سَکْرَانُ. ثُمَّ قَالَ لِیْ: بِمَ تَشْتَغِلُ فِیْ بَیْتِکَ؟ قُلْتُ بِمَا اَمَرَنِیْ مَخْدُوْمِیْ.

"مولانا علی شاہ جاندار نے خلاصۃ اللطائف میں لکھا ہے:

"میں نے اپنے شیخ اور مخدوم سلطان المشائخ نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کو (حالتِ) مراقبہ میں دیکھا جب میں نے ایک بار کسی وقت ان کی مجلس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ وہ بہت اچھے طریقہ سے بالکل ساکن بیٹھے ہیں اور بظاہر بالکل جنبش (بدن میں) نہیں ہے اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہم نے انھیں اطلاع دی مگر وہ مجھے نہیں پہچانے اور فرمایا: تم کون ہو؟ جب میں نے انھیں اس حالت میں دیکھا تو چاہا کہ اُلٹے پاؤں واپس ہوجاؤں۔ آپ نے اپنی دونوں آنکھیں (ہاتھ سے) مَلیں اور مجھے پہچان کر فرمایا: بیٹھو! میں بیٹھ گیا۔ پھر آپ ہم کلام ہوئے اور آپ کی آنکھیں اس طرح چڑھی ہوئی تھیں جیسے نشے میں ہوں۔ پھر فرمانے لگے: تم گھر میں کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: جو کچھ مخدوم نے حکم دیا ہے (وہ شغل کرتا ہوں)۔

---

[1] یہی مفہوم دُررِ نظامی (باب ۱۶) ص ۱۴۹ میں بیان ہوا ہے۔

قَالَ اشْتَغِلْ بِاللّٰہِ. ثُمَّ قَالَ یَنْبَغِیْ لِلْفَقِیْرِ اَنْ یَّتَصَوَّرَ فِیْ قَلْبِہٖ خَاشِعًا اَنَا جَالِسٌ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَیُدَاوِمُ. ثُمَّ قَالَ لِیْ: ثُمَّ وَاجْلِسْ مَعَ الْاَصْحَابِ اَنَا مَشْغُوْلٌ"۔[۱]

فرمایا: اللہ سے مشغولی پیدا کرو۔ پھر فرمایا: فقیر کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے دل میں تصوّر یہ کرے کہ میں خدا اور رسول صلعم کے سامنے بیٹھا ہوں اور اس (شغل) کی مداومت کرے۔ پھر فرمایا: جاؤ! باہر جاکر اصحاب کے ساتھ بیٹھو! میں اس وقت مشغول ہوں۔"

یہ اقتباس حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے بھی نقل کیا ہے[۲] اور غالباً ان کا ماخذ سیر الاولیاء ہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خلاصۃ اللطائف کی تالیف سیر الاولیاء سے قبل ہو چکی تھی۔ لیکن اس میں دُررِ نظامی کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں سیر الاولیاء سے اقتباسات ہوئے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ دُررِ نظامی کی تالیف ۷۵۸ھ کے بعد کسی وقت ہوئی ہوگی۔

## مولانا علی بن محمود جاندار

کتاب کے مولّف کا نام سیر الاولیاء میں مولانا علی شاہ جاندار آیا ہے[۳] شیخ عبدالحق محدّثؒ نے "جانداد" لکھا ہے مگر یہ کاتب کا تصرّف معلوم ہوتا ہے[۴] خود دُررِ نظامی کے دیباچہ میں انھوں نے اپنا نام علی بن محمود جاندار بتایا ہے[۵]۔ "جاندار" عہد سلاطین کا ایک عہدہ ہے[۶] یا تو یہ خود اس عہدے پر فائز رہے ہوں گے یا یہ ان کے والد کی نسبت سے بھی ہو سکتا ہے[۷]

مولانا جاندار نے ۷۰۸ھ میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے بیعت کی تھی[۸] معلوم ہوتا ہے کہ قاضی محی الدین کاشانیؒ (ف ۷۲۰ھ) سے ان کے دوستانہ مراسم تھے اور یہ اکثر ان کے ساتھ حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوتے تھے۔

---

۱؎ سیر الاولیاء: ص ۳۴۹ ۲؎ اخبار الاخیار: ص ۹۴-۹۵ ۳؎ سیر الاولیاء: ص ۳۴۹
۴؎ اخبار الاخیار: ص ۹۴ ۵؎ دُررِ نظامی (اُردو ترجمہ) ص ۱۸
۶؎ "جان" بمعنی سلاح۔ بادشاہ کے حفاظتی دستہ (باڈی گارڈ) کو "جاندار" کہا جاتا تھا۔ (طبقاتِ ناصری)
۷؎ دُررِ نظامی: صفحات ۱۰۵-۱۰۶ سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ علی بن محمود جاندار ملازمت سلطانی سے وابستہ تھے اور اسے چھوڑنا بھی چاہتے تھے مگر مقروض ہونے کے باعث ترک کرنا ممکن نہ تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے انھیں ایک وظیفہ بتایا جسے یہ پڑھتے رہے اور جب قرض ادا ہوگیا تو ملازمت ترک کردی۔
۸؎ دُررِ نظامی: ص ۱۲۳

حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے مرضِ وفات میں انھوں نے ایک غلام کو جس کا نام شادی تھا بطور صدقہ آزاد کیا تھا۔[۱] حضرت کے آخری وقت کی کیفیت بھی انھوں نے قلم بند کی ہے جو اگرچہ زیادہ مفصّل نہیں ہے لیکن سیرالاولیا، کی تفصیلات پر کچھ اضافہ کرتی ہے:

"حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: کیا سبب ہے کہ لوگ میرے پاس قوّالوں کو نہیں لاتے ہیں۔ میں نے کہا: حضور! یہ خیال ہے کہ بیماری کے باعث ذات اقدس پر ضعف طاری ہے، سماع کے سننے سے اور زیادہ نہ ہو۔ فرمایا: نہیں! سماع کے اندر مجھ میں بہت قوّت ہوجاتی ہے جو اور کسی وقت نہیں ہوتی۔ اس بیماری میں جب میں حاضر ہوتا اکثر زبانِ مبارک سے شیخ سیف الدین باخرزی کی یہ بیت سنتا:

خیر بادا گفتم اے جان! اگرچہ نیست
جان خود را گفتن آسان خیر باد"[۲]

دُررِ نظامی، ہی میں مولّف یعنی مولانا علی بن محمود کے بارے میں متفرق سوانحی تفصیلات مل جاتی ہیں مثلاً ان کی شادی ہوئی تھی[۳] ایک فرزند جس کا نام ابوالقاسم بتایا ہے[۴] ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہوگیا تھا۔ مولانا علی شاہ سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے[۵] ان کی تعلیم رسم زمانہ کے مطابق اچھی طرح ہوئی تھی اور وہ فارسی وعربی زبان کے علاوہ کُتبِ حدیث وتفسیر وغیرہ پر عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ عربی میں ایک تصنیف "خلاصۃ اللّطائف" بھی تھی جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ ان ملفوظات میں جہاں انھوں نے جابجا علمی نکات پیش کیے ہیں یا اپنے بعض شُبہات کا اظہار کیا ہے، ان سے آپ کی علمیّت وقابلیت کا اچھا تاثّر قائم ہوتا ہے[۶]

---

[۱] دُررِ نظامی: ص ۲۶۸ [۲] ایضاً: صفحات ۲۶۹-۲۷۰ [۳] ایضاً: ص ۲۸

[۴] ایضاً: ص ۲۷ [۵] ایضاً: ص ۱۰۶

[۶] مثلاً انھوں نے رؤیت باری تعالیٰ کے موضوع پر جو گفتگو حضرت شیخؒ کی مجلس میں کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔ دُررِ نظامی (باب ۷) صفحات ۷۸-۷۹

# دُرَرِ نظامی اور فوائدالفواد

جیساکہ ہم نے ابتدا ہیں اشارۃً عرض کیا ہے کہ دُرَرِ نظامی میں بیشتر وہی مواد ہے جو فوائدالفواد بیں ملتاہے اور بہ مشکل دس فیصد ایسا مواد ہوگا جو فوائدالفواد میں نہیں ہے اور اس سے بھی کمتر وہ جو کسی بھی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتا۔ بس فرق یہی ہے کہ امیر حسن سجزی نے حضرت کے ملفوظات کو مجلس وار اور تاریخی ترتیب سے قلم بند کیا ہے اور مؤلّف دُرَرِ نظامی نے اسی مواد کو تیس مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے لیکن کتاب میں کہیں بھی فوائدالفواد یا سیرالاولیاء کا حوالہ نہیں آیا ہے۔ نہ موخرالذکر دونوں کتابوں میں دُرَرِ نظامی کا نام ملتاہے۔ مولانا جاندار سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اتنی کثرت سے جس کتاب کا مواد استعمال کریں اس کا نام بھی نہ لیں یا اسے قصداً نظرانداز کر دیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ ۷۰۷ھ سے ۷۲۰ھ تک جس زمانے میں فوائدالفواد قلم بند ہوئی ہے، یہ وہی زمانہ ہے جب مولانا علی بن محمود جاندار حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں حاضر رہے ہیں اور آپ سے بیعت کا شرف حاصل کیا ہے۔ اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ جن مجلسوں کے ملفوظات امیر حسن دہلوی نے لکھے ہیں، ان میں خود مولانا جاندار بھی حاضر رہے ہوں اور وہ بھی حضور کے ملفوظات بطور یادداشت قلم بند کرتے رہے ہوں۔ بعد کو انھوں نے ان ملفوظات کو بہ ترتیب موضوعات یک جا کرلیا ہو۔ مگر فوائدالفواد میں کہیں ان کے حاضر رہنے کا حوالہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا محی الدین کاشانیؒ (ف ۷۲۰ھ) کا نام ایک جگہ آیا ہے، یہ ۲۲ صفر ۷۱۳ھ کی مجلس ہے۔[۱]

دُرَرِ نظامی اور فوائدالفواد کی جو روایات مشترک ہیں ان میں اکثر تطابق ہے۔ الفاظ اور ان کی ترتیب بھی ایک ہے۔ اگرچہ ہمارے سامنے دُرَرِ نظامی کا فارسی متن موجود نہیں ہے لیکن اُردو ترجمہ کا مقابلہ فوائدالفواد کے فارسی متن سے کرنے پر بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ فارسی عبارت بہت زیادہ مختلف نہ رہی ہوگی۔ مگر بعض مقامات پر فوائدالفواد کا متن نسبتاً

---

۱؎ فوائدالفواد : ص ۱۶۸

ناقص اور دُررِ نظامی کا اس کے مقابلے میں بہتر ہے۔ مثلاً فوائد الفواد میں ہے کہ :

(۱) حضرت نظام الدین ؒ نے فرمایا کہ ایک بار انھوں نے دیکھا۔ حضرت بابا فرید ؒ اپنے حجرے میں بار بار سجدہ کرتے تھے اور یہ مصرع پڑھتے تھے :

از بہر تو میرم ز برائے توزیم [۱]

مگر دُررِ نظامی میں ہے کہ آپ برہنہ سر تشریف رکھتے تھے اور یہ رباعی پڑھتے تھے :

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے توزیم    خاکے شوم و بزیر پائے توزیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی    از بہر تو میرم ز برائے توزیم

اس موقع پر حضرت محبوب الٰہی ؒ حجرے میں تشریف لے گئے تو بابا صاحب ؒ نے فرمایا : مانگو کیا مانگتے ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے "ایک دینی چیز" طلب کی۔ قاضی محی الدین کاشانی ؒ نے اس پر سوال کر لیا کہ حضور نے کیا طلب فرمایا تھا؟ تب محبوب الٰہی نے بتایا کہ اس وقت میں نے "استقامت" مانگی تھی [۲] یہ تفصیل سیر الاولیاء میں ہے مگر فوائد الفواد میں نہیں ہے۔

(۲) دُررِ نظامی سے حضرت نظام الدین اولیاء ؒ کے ایک سفر اجودھن کی تاریخ قطعیت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ آپ ۲۶ ر رمضان ۶۶۰ھ کو بابا صاحب ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اسی سال آپ کو خلافت نامہ عطا ہوا تھا [۳]

(۳) بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بابا صاحب ؒ کے برادر خورد حضرت شیخ نجیب الدین متوکل ؒ کا انتقال بابا صاحب ؒ کے وصال سے چند ماہ قبل ہوا تھا۔ مگر دُررِ نظامی سے حضرت شیخ نجیب الدین متوکل ؒ کے انتقال کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ۹ ر رمضان ۶۶۰ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا تھا [۴] جب کہ بابا صاحب ؒ ۵ ر محرم ۶۶۴ھ کو محبوبِ حقیقی سے واصل ہوئے ہیں۔

---

[۱] فوائد الفواد : ص ۳۴۲    [۲] دُررِ نظامی (باب ۲۷) : ص ۲۳۶ ؛ سیر الاولیاء : ص ۱۲۴

[۳] دُررِ نظامی : ص ۱۲۶ ۔ سیر الاولیاء میں بعض سنہ صریحاً غلط ہیں۔ ان پر تفصیل سے بحث علیحدہ مضمون میں کی گئی ہے۔ اس موقع پر بھی سیر الاولیاء میں ۶۶۹ھ درج ہے حالانکہ ۶۶۴ھ میں بابا صاحب ؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔

[۴] دُررِ نظامی : ص ۱۲۷۔ یہاں بھی سیر الاولیاء میں دیا ہوا سنہ غلط ہے۔

(۴) دُررِ نظامی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باباصاحبؒ نے اپنی حیات مبارک کے آخری ۲۷ سال اجودھن میں بسر کیے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انھوں نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا ہے۔ اس طرح آپ کے پاک پٹن تشریف لانے کا زمانہ ۶۳۷ھ ہوتا ہے[۱] اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے انتقال کے وقت (۶۳۴ھ) آپ ہانسی میں تشریف فرما تھے اور قطب صاحبؒ کے انتقال سے پانچویں روز (۱۹ر ربیع الاوّل) دہلی تشریف لائے تھے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کرکے (۲۶ر ربیع الاوّل ۶۳۴ھ) پھر ہانسی تشریف لے گئے تھے۔ اس طرح آپ نے ۶۳۴ھ سے ۶۳۷ھ تک کا زمانہ ہانسی ہی میں بسر کیا ہوگا۔

(۵) محمد بولاق مؤلف روضہ اقطاب نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی زندگی ہی میں (چند ماہ قبل) انتقال کیا تھا۔ لیکن مؤلف دُررِ نظامی نے حضرت خواجہ معین الدینؒ کے آخری سفر دہلی کا حال لکھا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ:

"حضرت خواجہ معین الدینؒ ہنوز اجمیر نہ پہنچے تھے کہ دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدینؒ نے انتقال فرمایا۔"[۲]

(۶) اجودھن سے واپسی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ساتھ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی اور شمس الدین دبیر وغیرہ تھے۔ اس سفر کا حال فوائد الفواد میں بھی ملتا ہے مگر مولانا جاندار نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے[۳]

(۷) باباصاحبؒ کے ایک مرید اور خلیفہ خواجہ فخرالدین صفاہانی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں رہتے تھے۔ ان کا تذکرہ فوائد الفواد میں نہیں ہے۔ دُررِ نظامی میں موجود ہے[۴] اور یہی سیرالاولیاء میں بھی پایا جاتا ہے[۵]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۲۵) : ص ۲۲۰ [۲] ایضاً (باب ۲۴) : ص ۲۱۰

[۳] ایضاً (باب ۱۶) : ص ۱۵۳ ؛ فوائد الفواد : ص ۲۲۰

[۴] دُررِ نظامی : ص ۱۳۸ ؛ سیرالاولیاء : صفحات ۳۴۵-۳۴۶

[۵] سیرالاولیاء : ص ۳۴۵

(۸) سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی حضرت محبوب الٰہیؒ سے کد رکھتا تھا۔ یہ خود شیخ ضیاء الدین رومیؒ کا مرید تھا۔ موخر الذکر کا انتقال ہوا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ مجلسِ سوم میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سلطان مبارک شاہ بھی موجود تھا۔ مشہور یہ ہے کہ اس نے آپ کے سلام کا جواب تک نہیں دیا[۱] یہی غالباً ضیاء الدین برنی نے بھی لکھا ہے۔ لیکن دُررِ نظامی سے اس ملاقات کا تھوڑا سا حال معلوم ہوتا ہے:

"فرمایا کہ جس مجلس میں سلطان قطب الدین سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے اس کے آگے یہ حدیث پڑھی تھی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے:
مَا مِنْ صَاحِبٍ يَصْحَبُ صَاحِبَهٗ وَلَوْ سَاعَةً مِّنْ لَّيْلٍ اِلَّا سَأَلَهُ اللّٰهُ مِنْ صُحْبَتِهٖ هَلْ اَدّٰى فِيْهَا حَقَّ اللّٰهِ اَمْ لَا۔ یعنی جو شخص کسی کی صحبت میں ایک گھڑی بھی بیٹھے گا، خدا اس سے پوچھے گا کہ اس صحبت میں خدا کا حق بھی ادا کیا یا نہیں"۔[۲]

(۹) دُررِ نظامی میں ملک نظام الدین کوتوال کا قصّہ درج ہے جسے ہم نے آگے نمبر (۴۴) کے تحت نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ فوائد الفواد میں کچھ تغیّر کے ساتھ درج ہوا ہے۔ اور دونوں روایتوں کو ایک ساتھ پڑھیں تو پوری صورت حال روشن ہوتی ہے

نظام الدین کوتوال جس کا اس روایت میں حوالہ ہے عہد بلبن کے امراء میں سے تھا اور معزالدین کیقباد کے آخری زمانے میں (۶۸۸ھ) زہر خورانی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کا حال ضیاء الدین برنی کے ہاں تفصیل سے درج ہے۔

(۱۰) فوائد الفواد کی ۲۷ر شعبان ۷۱۵ھ کی محفل میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ آپ نے کن حالات میں دہلی کو اپنے مستقل قیام کے لیے انتخاب کیا۔ یہ سب تفصیل دُررِ نظامی میں بھی ہے۔ فوائد الفواد میں ہے:

"تا بزرگے کہ از اُستاد من بود در شہر وفات کرد۔ من با دل خود راست گرفتم کہ فردا کہ از وفات او سوم خواہد بود من بزیارت او بردم"۔[۳]

---

[۱] اخبار الاخیار: ص ۷۳؛ روضۃ الاقطاب: ص ۸۰ [۲] دُررِ نظامی: ص ۱۶۰
[۳] فوائد الفواد: ص ۲۴۳

اور دُررِ نظامی میں اُستاد کا نام مولانا امین الدین محدث[۱] درج ہوا ہے جو فوائد الفواد میں نہیں ہے۔ سیر العارفین میں جمالی دہلوی نے انھیں امین الدین تبریزی لکھا ہے۔

(۱۱) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جس محفلِ سماع میں انتقال فرمایا ہے، اس کا بیان فوائد الفواد میں ہے[۲] اور دُررِ نظامی میں کئی جگہ ہے[۳] اور اس میں تاریخ انتقال واضح طور پر ۱۴ ربیع الاوّل ۶۳۳ھ درج ہے جو فوائد الفواد میں نہیں ہے۔

فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت بدر الدین غزنویؒ کو اور ایک بزرگ جن کا مزار قطب صاحبؒ کے پائین مزار ہے، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا جانشین بننے کی خواہش تھی[۴] دُررِ نظامی میں دوسرا نام خواجہ شماجی (تماجی؟) دیا ہوا ہے[۵] یہ نام فوائد الفواد یا سیر الاولیاء میں نہیں ہے۔ مولّف جواہر فریدی نے ان خواجہ احمد کو قطب صاحبؒ کا فرزند لکھا ہے۔

(۱۳) حضرت شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانیؒ کی وفات کا واقعہ فوائد الفواد میں موجود ہے[۶] یہی سیر الاولیاء، راحت القلوب اور دوسری کتابوں میں بھی آیا ہے۔ مگر دُررِ نظامی میں اتنا اضافہ ہے کہ "اسی رات چھت سے نیچے گر کر انتقال فرمایا"[۷]

(۱۴) سیر الاولیاء[۸] وغیرہ میں حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے مرض وفات کا حال موجود ہے اور اس میں یہ ہے کہ اس زمانے میں آپ اکثر "می رویم و می رویم" پڑھا کرتے تھے ——— علی بن محمود جاندار مولّف دُررِ نظامی بھی حضور کی وفات کے وقت موجود تھے اور انھوں نے صدقے میں ایک غلام بھی آزاد کیا تھا۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ حضور محبوبِ الٰہیؒ آخری ایّام میں اکثر شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

خیر بادا گفتم اے جان گرچہ نیست
جان خود را گفتن آسان خیر باد[۹]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۲۱): ص ۲۴۶ [۲] فوائد الفواد: ص ۱۸۸
[۳] دُررِ نظامی: صفحات ۲۳۹-۲۶۵ وغیرہ [۴] فوائد الفواد: ص ۳۱۵ [۵] دُررِ نظامی: ص ۱۲۴
[۶] فوائد الفواد: ص ۳۷۴ [۷] دُررِ نظامی (باب ۳۰): ص ۲۶۸ [۸] سیر الاولیاء: ص ۱۵۳
[۹] دُررِ نظامی (باب ۳۰): ص ۲۶۷

اسی کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قصیدے کے اشعار ہیں اور ان کے مصنف حضرت شیخ سیف الدین باخرزیؒ ہیں۔ شیخ سیف الدین باخرزیؒ کے دیوان فارسی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں موجود ہے۔

(۱۵) فوائد الفواد میں ہے کہ قاضی منہاج سراج نے ایک وعظ میں کہا: متواتر حدیثیں صرف چھ ہیں۔ تین احادیث انھوں نے سُنائیں اور باقی تین کو کہا کہ اس وقت یاد نہیں۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کیوں یاد نہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے بھی یہ تین احادیث مجھ سے سُنی ہیں ورنہ تم بھی ان سے بے خبر تھے[۱]۔ مگر دُررِ نظامی میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے جیسے حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے فرمایا ہو کہ باقی تین احادیث وہ بھول گئے ہیں[۲]۔

## قرض کی ممانعت

(۱) فرمایا کہ حضرت شیخ الاسلام فرید الحق والدینؒ فرماتے تھے کہ جو اس درویش (یعنی بابا صاحبؒ) کا مرید ہو وہ قرض نہ لیا کرے۔ اس کے بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ارشاد کیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْکُفْرِ وَالدَّیْنِ. قِیْلَ اَتَعْدِلُ بَیْنَهُمَا. قَالَ نَعَمْ.

یعنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم کفر اور قرض سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ کسی نے عرض کیا کہ آپ ان دونوں کو برابر سمجھتے ہیں؟ فرمایا: ہاں![۳]

## غیر خدا پر تکیہ

(۲) ایک دفعہ حضرت شیخ الاسلام خواجہ فرید الدینؒ بیمار تھے۔ عصا ہاتھ میں لے کر چند قدم چلے، پھر عصا کو ہاتھ سے پھینک دیا۔ اور چہرۂ مبارک پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ "مجھ کو عصا پر سہارا کرنے کے سبب عتاب ہوا کہ ہمارے سوائے غیر پر تکیہ کرتا ہے"[۴]۔

## حق دار کو اس کا حق دیا جائے

(۳) فرمایا: جب میں نے شیخ فرید الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر انابت حاصل کی تو کئی بار آپ نے فرمایا کہ دشمنوں کو خوش کرنا چاہیے اور حق داروں کو ان کا حق پہنچانے کی بہت تاکید فرمائی۔ مجھ کو

---

[۱] فوائد الفواد: ص ۳۹۶ [۲] دُررِ نظامی: ص ۳۰ [۳] ایضاً (باب ۱): صفحات ۲۵-۲۶
[۴] ایضاً (باب ۱): ۲۶-۲۷؛ سیر الاولیاء: ص ۸۱

یاد آیا کہ ایک شخص کے بیس جیتل قرض مجھ کو دینے ہیں اور ایک شخص سے میں نے عاریۃً ایک کتاب لی تھی، وہ میرے پاس سے گم ہوگئی ہے۔ اب جو میں دہلی پہنچوں گا تو ان دونوں کو راضی کروں گا۔[۱]

**خدا تجھے درد دے**

(۴) حضرت شیخ الاسلام فریدالدین قدّس سرّہٗ ایک کو بارہا فرماتے تھے کہ خدا تجھ کو درد دے۔ وہ شخص حیران ہوتا تھا کہ یہ کیا دُعا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ہاں وہ یہ دُعا تھی۔[۲]

**ایتمر اور ایتگر**

(۵) دہلی میں ایک ترک نے مسجد تیار کی اور اس کی امامت پر حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو مقرر فرمایا اور ایک مکان بھی آپ کے واسطے تیار کیا۔ اور انھیں دنوں میں اس ترک نے ایک لاکھ جیتل خرچ کرکے اپنی لڑکی کی شادی بھی کردی۔ شیخ نجیب الدین نے ایک روز بات چیت میں اس ترک سے فرمایا کہ کامل مومن وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی محبت مال و اولاد کی محبت پر غالب ہو۔ تم اگر ایک لاکھ جیتل راہِ خدا میں خرچ کرو جب اس مرتبہ پر پہنچو۔ ترک یہ بات سُن کر سخت ناراض ہوا اور امامت و مکان آپ سے لے لیا۔ اس کے بعد شیخ نجیب الدین متوکلؒ جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ واقعہ عرض کیا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ ارشاد کرتا ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَآ اَوْ مِثْلِہَا[۳]

"اس بات پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔ اگر یہ جاتی رہی تو خداوند تعالیٰ اس سے بہتر بھیجے گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چند روز کے بعد ایک شخص ملک بزرگ ایتگر نام یہاں پہنچا اور اس نے اس خاندان کی بہت خدمت کی اور ان کی خدمت گاری سے منسوب ہوا۔[۴]

---

۱۔ دُررِ نظامی (باب ۴) : ص ۵۸ ؛ فوائد الفواد : ص ۲۳۹ ؛ سیرالاولیاء : صفحات ۳۳۰-۳۳۱

۲۔ دُررِ نظامی (باب ۶) : ص ۶۵ ؛ فوائد الفواد : ص ۲۲۷

۳۔ سورۂ البقرہ ، ع ۱۲

۴۔ دُررِ نظامی (باب ۶) : صفحات ۶۹-۷۰ ؛ فوائد الفواد : ص ۱۳۴ ؛ سیرالاولیاء : ص ۸۷
طبقاتِ ناصری (ص ۲۳۶) میں ملک نصیرالدین ایتمر کا نام آیا ہے۔ اس کا انتقال ۶۲۵ھ کے بعد ہوا ہے۔

## نمازِ نفل کی جماعت

(۶) فرمایا: نفل نماز بھی جماعت سے پڑھنی آئی ہے۔ مشائخ اور بزرگانِ پیشیں نے ادا کی ہے۔ ایک دفعہ شب برات آئی تو شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ نے مجھ سے ارشاد کیا کہ اس رات میں جو نماز آئی ہے تم امامت کر کے پڑھاؤ۔ چنانچہ ایسا کیا گیا[1]

## زکوٰۃ کی قسمیں

(۷) شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ روحہٗ ارشاد فرماتے تھے کہ زکوٰۃ تین قسم کی ہے: زکوٰۃِ شریعت، زکوٰۃِ طریقت، زکوٰۃِ حقیقت۔ زکوٰۃِ شریعت دو سو درہم میں سے پانچ درہم ہیں اور زکوٰۃِ طریقت یہ ہے کہ پانچ درہم خود رکھ لے باقی راہِ خدا میں دے دے اور زکوٰۃِ حقیقت یہ ہے کہ سب دے دے، کچھ نہ رکھے[2]

## شیخ کا افطار

(۸) فرمایا: حضرت شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہٗ اکثر شربت سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ آدھا یا دو تہائی پیالہ آپ کو دیا جاتا اور حاضرینِ مجلس کو بھی اسی قدر تقسیم کیا جاتا۔ اور نماز سے پہلے دو روٹیاں بھی چپڑی ہوئی آتیں، ان میں سے ایک روٹی کے ٹکڑے کر کے حاضرین کو تقسیم فرماتے اور ایک روٹی خود نوش فرماتے، پھر مغرب کے بعد عشاء کی نماز تک یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ پھر کھانا حاضر کیا جاتا۔ اس کو نوش فرما کر پھر دوسرے دن کے افطار تک کچھ نہ کھاتے۔

فرمایا: حضرت شیخ الاسلام کئی باتیں ایسی کرتے تھے جنھیں میں نہیں کر سکتا ہوں۔ سحری کو آپ کچھ نوش نہ فرماتے، پھر مغرب کے بعد سے عشاء کی نماز تک یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ پھر کھانا حاضر کیا جاتا، اس کو نوش فرما کر پھر دوسرے دن کے افطار تک کچھ نہ کھاتے[3]

## شہرت طلبی سے احتراز

(۹) فرمایا کہ میں نے حضرت شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہٗ سے سُنا ہے، فرماتے تھے کہ میں نے اپنی تمام عمر میں شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی انار اللہ مرقدہٗ کے سامنے ایک جرأت کی جو یہ تھی کہ میں نے حضرت سے

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۸): ص ۸۳؛ فوائدالفواد: ص ۱۵۰

[2] دُررِ نظامی (باب ۹): ص ۹۲؛ فوائدالفواد: ص ۱۷۸

[3] دُررِ نظامی (باب ۱۰): ص ۹۸؛ فوائدالفواد: ص ۸۶؛ سیرالاولیاء: ص ۶۵

چلّہ کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا: ضرورت نہیں ہے۔ ان باتوں سے شہرت ہوتی ہے۔ ہمارے پیروں کا یہی طریقہ ہے یعنی چلّہ نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور میرے سر پر موجود ہیں یعنی میری شہرت نہ ہوگی، نہ میری یہ نیّت ہے۔ حضرت شیخ خاموش ہو رہے اور میں اس کے بعد تمام عمر پچھتایا کہ ایسی بات کیوں مُنھ سے نکالی جو آپ کے خلاف منشار تھی۔[۱]

## سفر کا وظیفہ

(۱۰) فرمایا: اس سے پہلے جب میں دہلی سے اجودھن حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں جاتا، یہ تین اسماء پڑھتا تھا: یَا حَافِظُ یَا نَاصِرُ یَا مُعِیْنُ۔ اور یہ دعاء میں نے کسی سے نہیں سُنی تھی، خود ہی خداوند تعالیٰ سے طلب امداد و اعانت کے واسطے پڑھتا تھا۔ خیر ایک مدّت کے بعد یہی اسماء ایک دوست نے مجھ کو لکھ کر دیے:

یَا حَافِظُ یَا نَاصِرُ یَا مُعِیْنُ بِحَقِّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[۲]

## حفظ قرآن

(۱۱) شیخ الاسلام حضرت فریدالدین مسعودؒ فرماتے تھے کہ جس کو قرآن یاد کرنا ہو وہ پہلے سورۂ یوسف یاد کرے۔ اس کی برکت سے خداوند تعالیٰ اس کو تمام قرآن شریف نصیب فرمائے گا۔[۳]

## بغیر اسباب کے عیش

(۱۲) فرمایا کہ ایک دفعہ خواب میں جناب شیخ شیوخ العالم حضرت فریدالدین نے مجھ کو حکم فرمایا کہ ہر روز سَو مرتبہ:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

پڑھ لیا کرو۔ جب میں بیدار ہوا تو اس کی مواظبت شروع کی اور دل میں خیال کیا کہ اس فرمان کے اندر ضرور کچھ حکمت ہے۔ چند روز کے بعد ایک کتاب میں دیکھا کہ جو شخص یہ دُعاء پڑھے بغیر اسباب کے خوش گذارے۔ میں نے جان لیا کہ حضرت شیخ فریدالدین قدّس سرّہ کا یہی مقصد تھا۔[۴]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۱۰): صفحات ۹۹-۱۰۰؛ فوائدالفواد: صفحات ۴۲-۴۳

[۲] دُررِ نظامی (باب ۱۱): ص ۱۰۱؛ فوائدالفواد: ۳۲۸

[۳] دُررِ نظامی (باب ۱۲): صفحات ۱۰۲-۱۰۳؛ فوائدالفواد: ص ۳۲۸

[۴] دُررِ نظامی (باب ۱۳): ص ۱۰۹؛ فوائدالفواد: ص ۱۶۲

## مُسبّعات عشر

(۱۳) فرمایا: شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کا ارشاد ہے کہ مسبّعات عشر کے بعد یہ دُعا بھی پڑھے: تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ چھ بار[1]۔ بندہ سے سیّد قطب الدین حسین نے بیان کیا کہ میں نے بھی حضرت شیخؒ کی زبان سے اسی طرح سُنا ہے کہ مسبّعات عشر کے بعد اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ بِرَفْعَتِكَ یَا نَافِعُ یَا رَافِعُ چھ بار پڑھے۔

## دولتِ وقت

(۱۴) شیخ فریدالدین قدّس اللہ روحہ نے فرمایا ہے کہ بدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اسی طرح سحری کا وقت غنیمت ہے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السّلام نے جو فرمایا ہے:
سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ[2] یعنی عنقریب میں تمہارے واسطے اپنے رب سے دُعائے مغفرت کروں گا تو یہاں بھی سحر کا وقت مُراد ہے۔ اُس وقت آپ نے کھڑے ہو کر دُعا مانگی اور آپ کے فرزندوں نے آمین کہی تو خداوند تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ میں نے تم کو بخش دیا اور سب کو نبی بنایا[3]

## زندہ کی بیعت

(۱۵) حضرت شیخ الاسلام خواجہ فریدالدینؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدّس اللہ سرّہ کے مزار شریف کے پائین جا کر محلوق ہوئے۔ یہ خبر حضرت خواجہ فریدالدین قدّس اللہ سرّہ کو پہنچی۔ آپ نے فرمایا کہ شیخ قطب الدینؒ میرے خواجہ اور مخدوم ہیں مگر وہ بیعت درست ہے جو زندہ کے ہاتھ پر ہو[4]

## درخت سایہ دار

(۱۶) فرمایا: میں اجودھن گیا اور حضرت شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کی قدمبوسی بجا لا کر بیعت و حلق کے واسطے عرض کیا۔ حضرت شیخؒ نے اسی وقت مرید کیا اور فرمایا: آج میں نے ایک درخت لگایا ہے جس کے

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۱۳): ص ۱۱۷؛ سیرالاولیاء: ص ۳۷۷ [2] سورۂ یوسف: آیۃ ۹۸

[3] دُررِ نظامی (باب ۱۳): صفحات ۱۱۷-۱۱۸

[4] ایضاً (باب ۱۴): ص ۱۱۹؛ فوائد الفواد: ص ۱۳۲

سایے میں بہت سے بندگانِ خدا آرام کریں گے۔ بعد ازاں شام کے وقت فرمایا کہ اس متعلّم غریب کے واسطے چارپائی بچھاؤ۔ جب میں جماعت خانے میں گیا تو دیکھا کہ چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ ایسے بڑے بڑے بزرگان تو فرشِ خاک پر لیٹتے ہیں میں غریب چارپائی پر نہ سوؤں گا۔ یہ خبر مولانا بدرالدین صاحب اسحٰق کو پہنچی۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ اپنا کہا کروگے یا اپنے شیخ "کا؟ میں نے کہا کہ میں تو حضرت شیخ ہی کا فرمان بجالاؤں گا۔[1]

**بیعت کا طریقہ**

(۱۷) فرمایا: حضرت شیخ الاسلام خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں جو شخص مرید ہونے کو حاضر ہوتا تو آپ پہلے اس سے فاتحہ اور اخلاص اور اٰمَنَ الرَّسُوْلُ اور شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ.... تا .... عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔[2] پڑھواتے اور یہ کہلواتے کہ تو نے اس ضعیف اور اس کے خواجگان اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بیعت کی اور عہد کیا کہ ہاتھ، پیر اور آنکھ کو محفوظ رکھے گا اور شریعت کا پابند رہے گا۔ اور جب خرقہ پہناتے، یہ فرماتے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔[3]

**دونوں طرف سے نعمت**

(۱۸) فرمایا: خواجہ معین الدین چشتیؒ اور خواجہ فریدالدین مسعودؒ ایک حجرے میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ نے خواجہ قطب الدینؒ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اس جوان کو مجاہدہ کراتے کراتے جلادوگے۔ اس کو کچھ بخشش کرو۔ پھر حضرت معین الدینؒ کھڑے ہوگئے اور حضرت فریدالدینؒ سے فرمایا کہ اُٹھو! کھڑے ہو! میں تم پر بخشش کرتا ہوں۔

چنانچہ خواجہ معین الدینؒ دائیں اور خواجہ قطب الدینؒ بائیں طرف کھڑے ہوئے۔ اور حضرت خواجہ فریدالدینؒ پر از حد بخشش و عنایت فرمائی اور خلیفہ کیا۔[4]

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۱۴): ص ۱۲۱

[2] سورۂ آل عمران: آیات ۱۷-۱۸

[3] دُررِ نظامی (باب ۱۴): صفحات ۱۲۱-۱۲۲

[4] دُررِ نظامی (باب ۱۴): صفحات ۱۲۳-۱۲۴؛ سیرالاولیاء: ص ۷۲

## قُطب صاحبؒ کی جانشینی

(۱۹) فرمایا: حضرت شیخ فریدالدینؒ دو ہفتہ کے بعد حضرت خواجہ قطب الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور شیخ بدرالدین غزنویؒ و خواجہ تماجی (حضرت کے فرزند) کو یہ تمنّا تھی کہ حضرت کے بعد حضرت کی جگہ بیٹھیں مگر حضرت نے آخری وقت یہ وصیّت فرمائی کہ جامہ اور عصا اور مُصلّٰی اور نعلین چوبیں فریدالدین مسعود اجودھنیؒ کو دے دینا۔ حضرت شیخ فریدالدینؒ اس وقت ہانسی میں تھے اور اسی شب آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ قطب الدینؒ آپ کو بُلاتے ہیں۔ چنانچہ آپ صبح ہی روانہ ہوئے اور چوتھے روز دہلی پہنچ گئے۔ قاضی حمیدالدین ناگوری نے وہ تمام تبرّکات آپ کے حوالے کیے اور آپ نے شکریہ کا دوگانہ ادا کر کے وہ جامہ زیب تن فرمایا اور سات روز حضرت خواجہ کے مکان میں رہ کر پھر ہانسی چلے گئے۔ اور ہانسی جانے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت خواجہ کے مکان میں ایک شخص انتظامِ طعام پر مقرّر تھے۔ انھوں نے دروازے پر ایک شخص سرہنگ نامی کو دربان مقرّر کیا تھا[1]۔ ایک روز حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں ایک شخص ہانسی سے آیا اور دربان نے اس کو اندر جانے نہ دیا۔ کئی بار ایسا ہوا۔ آخر ایک روز حضرت بابا صاحبؒ باہر تشریف لے گئے تو یہ شخص آپ کے قدموں میں گِر کر زار زار رونے لگا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا سبب ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے کئی بار خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر دربان نے جانے نہ دیا۔ آپ نے دربان سے فرمایا کہ تجھ کو کس نے نصب کیا ہے؟ دربان نے کہا کہ ان شخص نے جو کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: پیرانِ چشت کے مکان میں دربان کا کیا کام ہے؟ میں پھر ہانسی میں جاتا ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت خواجہ نے تو آپ کے لیے یہی مقام فرمایا ہے۔ آپ دوسری جگہ کیوں جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: شیخ نے جو نعمت مجھ کو عنایت فرمائی ہے، وہ جیسی کہ شہر

---

[1] یہاں مؤلف دُررِ نظامی سے غلطی ہوئی ہے یا مُترجم کا سہو ہے۔ سرہنگا نامی شخص کو حضرت بابا صاحبؒ اپنے ساتھ ہانسی سے لائے تھے۔ وہی تین دن تک بابا صاحبؒ سے ملنے کی کوشش کرتا رہا مگر دربان نے باریاب نہ ہونے دیا اور اسی کی شکایت پر آپ نے ہانسی تشریف لے جانے کا فیصلہ کیا۔

میں ہے ویسی ہی جنگل میں ہے۔ اس کے بعد آپ ہانسی تشریف لے گئے۔[۱]

**تعلیم دعا**

(۲۰) فرمایا: حضرت شیخ فریدالدینؒ نے مجھ کو یہ دعا تعلیم کی اور فرمایا کہ اس کو یاد کرلو تو پھر میں تم کو اپنا خلیفہ بناؤں گا:

"اَللّٰھُمَّ یَا دَائِمَ الْفَضْلِ عَلَی الْبَرِیَّۃِ وَیَا بَاسِطَ الْیَدَیْنِ بِالْعَطِیَّۃِ وَیَا صَاحِبَ الْمَوَاھِبِ السَّنِیَّۃِ وَیَا دَافِعَ الْبَلَاءِ وَالْبَلِیَّۃِ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَیْرِ الْوَرٰی السَّجِیَّۃِ وَعَلٰی اٰلِہِ الْبَرَرَۃِ النَّقِیَّۃِ وَاغْفِرْ لَنَا وَلِلْوَالِدَیْنِ وَلِجَمِیْعِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ رَبَّنَا تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ بِفَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔"

میں نے یہ دعا یاد کرلی اور شہر میں روز پڑھتا رہا۔ پھر چھبیسویں ماہِ رمضان ۶۶۰ھ میں جو حاضرِ خدمت ہوا تو فرمایا کہ تم کو یاد ہے؟ میں نے وعدہ کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں! فرمایا کہ خداوند کریم تم کو نیک بخت کرے اور اپنی مرضی کے عمل نصیب فرمائے: اَسْعَدَکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ وَرَزَقَکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّعَمَلًا مَّقْبُوْلًا۔ اور فرمایا کہ تم ایسے درخت بنوگے کہ تمہارے سایے میں خلقِ خدا آرام کرے گی۔ اور فرمایا کہ مجاہدہ کرنا چاہیے تاکہ استعداد حاصل ہو۔ بعد ازاں مولانا بدرالدین اسحٰقؒ سے ارشاد کیا کہ کاغذ لاکر اجازت نامہ لکھ دو۔ انھوں نے اجازت نامہ تیار کیا۔ حضور نے دستِ خاص سے اجازت نامہ اور خلعت مجھ کو عنایت فرماکر ارشاد کیا کہ ہانسی میں مولانا جمال الدینؒ کو اور دہلی میں قاضی منتجب الدینؒ کو دکھا دینا۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ کا نام نہیں لیا، جس کے سبب سے مجھ کو خیال ہوا کہ شاید حضرت ان سے ناخوش ہیں۔ پھر جب میں دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ نویں ماہِ رمضان شریف کو شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے انتقال فرمایا۔[۲]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۱۴): صفحات ۱۲۵-۱۲۶؛ فوائد الفواد: صفحات ۳۱۵-۳۱۶؛ سیر الاولیاء: صفحات ۷۲-۷۳؛ روضۂ اقطاب: ص ۶۹

[۲] سیر الاولیاء (ص ۱۱۶) میں خلافت ملنے کی تاریخ ۱۳ رمضان ۶۶۹ھ ملتی ہے لیکن یہ غلط ہے اور دُررِ نظامی کی روایت یعنی ۶۶۰ھ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تفصیلی بحث دوسرے موقع پر ہوگی۔

حضرت کے فرمان کے مطابق جب میں ہانسی پہنچا اور شیخ جمال الدین ہانسوی کو اجازت نامہ دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ بیت پڑھی :

خدائے جہان را فراوان سپاس  که گوہر سپردہ بگوہر شناس

اور چند روز میری مہمانی اور ضیافت کر کے رخصت کیا۔[۵۱]

**بے طلب خلافت**

(۲۱) فرمایا کہ جس روز حضرت خواجہ فریدالدینؒ نے مجھ کو خلیفہ کیا ہے میں نے عرض کیا کہ میں ایک متعلم شخص ہوں۔ یہ کام مجھ سے کیوں کر ہوگا؟ فرمایا: تم سے خوب ہوگا اور جو شخص خود خلافت طلب کر کے لیتا ہے، اس سے واقعی یہ کام درست نہیں ہوتا۔[۵۲]

**ظہیرالدین سقّا**

(۲۲) شیخ ظہیرالدین سقّا میرے پاس آئے اور کہا: میں بھی مرید کرتا ہوں۔ میں نے کہا: آپ کو شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اجازت دے دی ہے؟ انھوں نے کہا: خیر! میں خاموش ہو رہا۔ بعد ازاں فرمایا: اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود شیخ الاسلام نے ان کو اجازت دی تھی۔[۵۳]

**فخرالدین صفاہانیؒ**

(۲۳) فرمایا کہ خواجہ فخرالدین صفاہانیؒ شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے ایک شخص داؤد نام کو حضرت کی خدمت میں بھیج کر عرض کرایا کہ مجھ سے بہت لوگ مرید ہونا چاہتے ہیں، خلافت عطا فرمائی جائے۔ میں اس وقت خدمت شریف میں حاضر تھا۔ فرمایا کہ یہ کام حق کا ہے، آرزو کا نہیں ہے۔ جو اس کے قابل ہوتا ہے، اس کو بغیر مانگے مل جاتی ہے۔ الغرض تیسری بار انھوں نے پھر عرض کرایا۔ حضور

---

۵۱ دُررِ نظامی (باب ۱۴) : صفحات ۱۲۶-۱۲۷

۵۲ ایضاً (باب ۱۴) : صفحات ۱۲۷-۱۲۸

۵۳ ایضاً (باب ۱۴) : ص ۱۲۸ ؛ سیرالاولیا: ص ۳۴۵ (یہاں یا تو دُررِ نظامی کے مترجم نے غلطی کی ہے یا کوئی تحریف ہوئی ہے۔ سیرالاولیا میں ہے کہ ظہیرالدین سقّا نے شکایت کی کہ جو میرا مرید ہوتا ہے وہی بعد کو میرے سامنے شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے باقاعدہ اجازت رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں، اس پر حضرت محبوب الٰہیؒ نے دل میں سوچا کہ جسے شیخ کی طرف سے اجازت نہ ہو، اس کے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔)

نے مجھ سے فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ مخدوم حاکم ہیں۔ یہ شخص بظاہر درویش معلوم ہوتے ہیں۔ تب حضور نے ان کو خلافت عنایت کی۔ مولانا بدرالدین اسحٰق ؒ سے اجازت نامہ لکھوا کر بھجوا دیا۔ پھر دہلی میں جوان فخرالدین سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس مجلس کی تکلیف بیان کرنی شروع کی جس میں حضرت شیخ سے ان کی خلافت کے واسطے التماس کیا تھا۔ ان کو سخت دشوار معلوم ہوا۔ میں نے دل میں کہا کہ ان کی نسبت شیخ نے جو کچھ فرمایا، وہی حق تھا اور میں غلطی پر تھا[۱]۔

## قسمت کا حصہ

(۲۴) فرمایا: حضرت شیخ الاسلام خواجہ فریدالدین ؒ کے ایک مرید یوسف نام کے تھے۔ ایک دفعہ نہایت افسوس کے ساتھ حضرت کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ میں برسوں سے یہاں پڑا ہوا ہوں، حضرت میرے اوپر کچھ کرم نہیں فرماتے اور لوگ چند ہی روز میں بہت سی نعمتیں لے کر چلے جاتے ہیں۔ غرضیکہ اسی قسم کی بہت سی باتیں کیں۔ حضرت نے ان کے جواب میں ارشاد کیا کہ اس میں میری تقصیر نہیں ہے تمہاری استعداد اور قابلیت بھی ہونی ضروری ہے اور نیز جب خدا ہی نہ دے تو میں کیا کروں؟ یوسف اسی طرح شکایت کرتے رہے کہ اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا سامنے آیا اور وہیں اینٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ حضرت نے اس بچے سے کہا کہ میرے واسطے ایک اینٹ اٹھا لا۔ لڑکا ایک اینٹ بہت عمدہ اٹھا لایا، پھر آپ نے فرمایا کہ ایک اور اینٹ ان یار کے واسطے اٹھا لا۔ لڑکا ایک عمدہ اینٹ ان کے واسطے بھی لے آیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک اینٹ ان کے واسطے بھی لاؤ۔ لڑکے نے آدھی اینٹ لا کر شیخ یوسف کے آگے رکھ دی۔ حضرت نے فرمایا: لو اب اس بات کو میں کیا کروں، تمہارے نصیب ہی میں اسی قدر ہے تو پھر مجھ پر کیا الزام"[۲]۔

## خواجہ عبدالرحمٰن

(۲۵) حضرت شیخ فریدالدین ؒ یہی فوائد بیان فرما رہے تھے کہ ایک درویش گیلان کی طرف سے حاضر خدمت ہوا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ تم بغداد میں خواجہ عبدالرحمٰن ؒ سے بھی ملے؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! بڑے بزرگ تھے۔

---

[۱] دُرِ نظامی (باب ۱۴): صفحات ۱۲۸-۱۲۹ [۲] ایضاً (باب ۱۴): صفحات ۱۲۹-۱۳۰ ؛ فوائد الفواد: ص ۵۲

ایک سال ہوا کہ انتقال فرمایا ہے۔[1]

**صحرا میں عبادت**

(۲۶) فرمایا کہ حضرت شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہ کبھی ڈولے میں سوار ہو کر صحرا میں تشریف لے جاتے اور درخت کے سایے میں بیٹھ کر یادِ حق میں مشغول ہوتے۔ عصا اور نعلین چوبیں مجھ کو مرحمت فرماتے۔ میں ڈولے کے سامنے سے اُلٹے پیروں واپس ہوتا اور گر پڑتا۔ حضرت فرماتے کہ سیدھے جاؤ سیدھے۔[2]

**عصائے پیر**

(۲۷) فرمایا: حضرت شیخ فریدالدین جب زیادہ بیمار ہوئے اور ماہِ رمضان آیا تو آپ افطار فرماتے تھے (یعنی روزہ قضا کرتے تھے) ایک روز یاراں آپ کو خربوزے کی پھانکیں کر کے کھلا رہے تھے کہ ایک قاش آپ نے مجھ کو عنایت کی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ حضرت کی عنایت کی ہوئی نعمت مجھ کو کہاں نصیب ہے اور اس کو کھالوں۔ قریب تھا کہ اس کو کھا جاؤں کہ حضرت نے فرمایا کہ تم نہ کھاؤ، تم کو شرعی رخصت نہیں ہے۔[3]

**متابعتِ کاملہ**

(۲۸) فرمایا: ایک دفعہ حضرت شیخ فریدالدین کے ہاتھ میں ایک دُعا تھی۔ فرمایا: اس دعا کو کون یاد کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا: حکم ہو تو میں یاد کرلوں۔ حضرت نے وہ دعا مجھ کو دے دی۔ میں نے عرض کیا: ایک بار حضور کے سامنے پڑھ بھی لوں۔ فرمایا: بہتر ہے۔ میں نے پڑھی تو ایک جگہ آپ نے اعراب میں اصلاح فرمائی حالانکہ جس طرح میں نے پڑھا تھا اس کے بھی معنی تھے۔ پھر میں نے دوبارہ حضرت کو سُنائی اور اسی طرح پڑھی جس طرح آپ نے بتائی تھی۔ پھر جب میں خدمت شریف سے باہر آیا تو مولانا بدرالدین اسحٰقؒ نے کہا کہ تم نے خوب کیا جو اعراب حضرت کے فرمان کے مطابق پڑھا۔ میں نے کہا: اگر سیبویہ جو اس علم کا بانی ہے اور دیگر علماء جنھوں نے یہ قواعد بنائے ہیں مجھ سے کہیں کہ خلافِ فرمودۂ شیخ پڑھو تو میں ہرگز نہ پڑھوں۔ مولانا نے کہا: جیسا کہ تم حضرت شیخ کا ادب ملحوظ رکھتے ہو ہم میں سے کسی

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۱۴): ص ۱۳۰۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہاں طباعت کی غلطی یا مترجم کا سہو ہے۔ یہ ملفوظ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہے اور شروع میں آپ ہی کا نام ہونا چاہیے۔

[2] دُررِ نظامی (باب ۱۵): ص ۱۳۷ [3] ایضاً (باب ۱۵): صفحات ۱۳۹-۱۴۰ ؛ سیر الاولیاء: ص ۳۳۷

کو بیشتر نہیں ہے۔[۱]

## شیخ کی رنجش کا قصہ

(۲۹) فرمایا: ایک دفعہ بلا قصد مجھ سے حضرت شیخ کی خدمت میں جرأت ہوگئی تھی اور وہ یوں ہوا تھا کہ ایک روز کتاب عوارف المعارف آپ کے آگے رکھی تھی اور آپ اس کے فوائد بیان فرما رہے تھے مگر چونکہ اس نسخہ کا خط باریک اور کچھ سقیم بھی تھا، اس کے پڑھنے میں قدرے توقّف واقع ہوتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ نجیب الدین متوکّل کے پاس میں نے صحیح نسخہ دیکھا ہے۔ میری یہ بات خاطر مبارک میں گراں گذری اور دو تین بار فرمایا کہ اس درویش میں سقیم نسخہ کو صحیح کرنے کی قوت نہیں ہے؟ میں نہ سمجھا کہ میری نسبت یہ ارشاد ہے۔ مولانا بدرالدین نے فرمایا کہ تمہاری نسبت فرما رہے ہیں۔ میں یہ سنتے ہی کھڑا ہوا اور سر برہنہ کر کے قدموں میں رکھ دیا اور عرض کیا: نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْہَا میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ مخدوم کی کتاب سقیم ہے۔ غرضکہ ہر چند میں نے معذرت کی مگر اثر بے رضائی اسی طرح قائم رہا۔ تب وہاں سے اٹھ کر کنوئیں پر پہنچا اور قصد کیا کہ اس کے اندر گر پڑوں۔ پھر سوچا کہ یہ بدنامی مرنے سے نہ جائے گی۔ حضرت شیخ کی خدمت ہی میں واپس چلا۔ حضرت شیخ کے ایک فرزند شہاب الدین نامؒ میرے بڑے دوست تھے۔ انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ میری سفارش کی۔ تب حضرت نے خواجہ محمد کو میری خبر کے واسطے بھیجا۔ میں نے حاضر ہو کر قدم بوسی کی۔ حضرت خوش ہوئے اور بہت مرحمت فرمائی اور فرمایا: میں یہ سب باتیں تمہاری تکمیل کے واسطے کرتا ہوں۔ پھر خلعت خاص سے مشرّف فرمایا۔[۲]

## امانت سے احتراز

(۳۰) فرمایا: مرید کو چاہیے کہ کسی کی امانت قبول نہ کرے اور مجھ کو چونکہ حضرت شیخ کی اجازت نہیں ہے، اس سبب سے میں کسی کی امانت نہیں رکھتا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ میں ایک امانت اپنے ساتھ لایا ہوں اور رات کو آپ کی دہلیز خانے میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو اجازت نہ دی۔ فرمایا: شیخ الاسلام حضرت شیخ فریدالدین قدّس اللہ روحہ فرماتے تھے: جو امانت رکھے گا وہ میرا مرید نہیں ہے۔[۳]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۱۵)، صفحات ۱۳۹-۱۴۰؛ سیرالاولیاء: ص ۳۳۷ [۲] دررِ نظامی (باب ۱۵): ص ۱۴۰؛ فوائدالفواد: صفحات ۴۱-۴۲
سیرالاولیاء: ص ۳۳۶ [۳] دُررِ نظامی (باب ۱۵): صفحات ۱۴۰-۱۴۱؛ سیرالاولیاء: صفحات ۱۸۶-۱۸۷؛ فوائدالفواد: ص ۴۳

## مراقبہ کی نشست

(۳۱) فرمایا کہ مراقبہ کے واسطے درویش قبلہ رُو زانو ے حرمت کے ساتھ بیٹھے۔ بندہ (علی بن محمود جاندار) نے عرض کیا کہ مرصاد العباد میں لکھا ہے کہ مراقبہ میں مشغول ہونے کے واسطے چار زانو بیٹھے۔ حضرت نے فرمایا: میں اس طرح بھی بیٹھتا ہوں مگر جو ذوق اس طرح حاصل ہوتا ہے اس طرح نہیں ہوتا اور زانو کھڑا کر کے اس پر سر رکھ کر بھی مراقبہ کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام فریدالدینؒ اور اور مولانا بدرالدین اسحٰقؒ اسی طرح بیٹھتے تھے۔[1]

## مولوی صاحب کا طعنہ

(۳۲) فرمایا: اجودھن میں ایک طالب علم نے مجھ کو طعنہ دیا کہ تم طالب علموں سے نکل کر ایسے بدحال ہو گئے اور مشائخ کی نسبت بھی کچھ کہا۔ میں نے تحمّل کیا۔ پھر میں حضرت شیخ فریدالدین قدّس سرّہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مکاشفہ سے تمام حال معلوم کر کے فرمایا کہ اگر کوئی طالب علم کسی طالب علم کو طعنہ دے تو اس کے جواب میں عین القضاۃ کی یہ بیت پڑھ دے:

نہ ہم رہی تو مرا، راہ خویش گیر برو ترا سعادتے بادا مرا نگوں ساری[2]

## اجودھن سے واپسی کا سفر

(۳۳) فرمایا کہ ایک دفعہ مجھ کو اور شیخ جمال الدین ہانسویؒ اور خواجہ شمس الدین دبیرؒ اور دیگر عزیزان کو ایک ساتھ حضرت شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت سے رخصت ہونے کا اتّفاق ہوا تو شیخ جمال الدینؒ نے وصیّت کی درخواست کی۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب مرید کو شیخ رخصت کرتے ہیں تو خود وصیّت فرماتے ہیں ورنہ مرید شیخ سے وصیّت کی درخواست کرتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا: اس کو خوش رکھنا۔ چنانچہ شیخ جمال الدینؒ اس وصیّت کے سبب سے مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے اور ہم ایک دوسرے کی ہمراہی سے بہت خوش تھے اور خواجہ شمس الدینؒ معدنِ لطافت وکانِ ظرافت ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں تک کہ ہم موضع اگروہ کے قریب پہنچے۔ یہاں کا حاکم شیخ جمال الدینؒ کے یاران (مریدوں) سے تھا۔ ہمارے استقبال

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۱۵): ص ۱۴۲ [2] ایضاً (باب ۱۶): ص ۱۴۶ [3] ایضاً (باب ۱۶): ص ۱۵۲

کو آیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ تکلّف سے مہمانی کی۔ بعد ازاں شیخ جمال الدینؒ نے فرمایا کہ اب ہم کو اجازت دو۔ اس نے عرض کیا کہ اجازت جب ہوگی جب مینھ برسے گا، کیونکہ ان دنوں بارش نہ ہونے سے قحط کا اندیشہ ہے۔ شیخ نے زبان سے کچھ نہ فرمایا مگر دل میں توجّہ کی، چنانچہ رات ہی کو اس قدر مینھ برسا کہ تمام مُلک سیراب ہوگیا۔

صبح کو سب یاراں کی سواری کے واسطے گھوڑے حاضر کیے گئے۔ میرا گھوڑا نہایت سرکش و بدلگام تھا۔ تمام یاراں تو آگے چلے گئے اور میں اکیلا جنگل میں رہ گیا۔ گھوڑے نے مجھ کو تکلیف پہنچائی۔ میں اس پر سے گر کر بے ہوش ہوگیا۔ مگر اس بے ہوشی میں بھی شیخ کی یاد میرے دل میں تھی اور جب میں ہوش میں آیا تو میری زبان پر حضرت کا نام جاری تھا۔ میں نے خدا کا شکر کیا اور قوی اُمّید ہوئی کہ آخری وقت بھی حضور کا نام میری زبان پر ہوگا اور یہ تمام ثمرہ مراقبۂ شیخ کا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی نَعْمَائِہٖ۔

یار قدیم راستی می بردی (؟). داد تو مقیم راستی بردی (؟)

سبحان اللہ! اس وقت کا میں کیا بیان کروں کہ کیا تھا[۱]

## شیخ سے پہلا تعارف

(۳۴) فرمایا: میں بارہ سال کی عمر میں علم لُغت پڑھتا تھا۔ ایک شخص ابوبکر قوال میرے اُستاد کے پاس مُلتان کی طرف سے آیا اور بیان کرنے لگا کہ میں نے شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو سماع سُنایا اور یہ قول پڑھا:

لَقَدْ لسعت حیۃ الھوی کبدی فلاطَبِیب لھا وَلَا رَاق

اِلَّا الْحَبِیب الَّذِیْ شغفت بِہٖ عِنْدَہٗ رُقیتی وَتِریاقی

بعد ازاں شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مناقب بیان کرنا شروع کیے کہ اس قدر عبادت کرتے اور اوراد پڑھتے ہیں۔ مگر ان باتوں نے میرے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ قوال کہنے لگا کہ پھر میں اجودھن گیا۔ وہاں ایک ایسے بادشاہ دیکھے کہ جن کی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ الغرض جب میں نے حضرت شیخ شیوخ العالم کا نام نامی سُنا تو خود بخود ایک محبّت دل میں پیدا ہوئی اور ایسی بڑھی

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۱۶) صفحات ۱۵۳-۱۵۴؛ فوائد الفواد: ص ۲۲۰؛ سیر الاولیاء: ص ۱۸۰

کہ ہر فرض کے بعد دس بار شیخ فرید الدینؒ اور دس بار مولانا فرید الدین صاحبؒ پڑھتا تھا اور پھر میرے یاروں کو بھی اس محبّت کی خبر ہوئی تو جب وہ مجھ سے کوئی بات دریافت کرتے یا مجھ کو قسم دیتے تو مجھ سے کہتے کہ شیخ فرید الدینؒ کی محبّت کی قسم کھاؤ۔

القصّہ جب میں بدایوں سے دہلی کو روانہ ہوا تو ایک بوڑھا عزیز، عوض نام میرے ساتھ ہو لیا۔ جہاں کہیں خوف و خطر کا موقع ہوتا، وہ کہتا کہ " اے پیر حاضر باش ما در پناہ تو می رویم"۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے پیر کون ہیں؟ کہا کہ شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدّس سرّہ۔ فرمایا: اس وقت میرا ذوق و شوق اک گونہ موکدّ ہو گیا۔[1]

## یا شیخ فرید الدین

(۳۵) فرمایا: ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک زنگی سیاہ مہیب صورت میرے پیچھے دوڑا اور میری ہلاکت کا قصد کیا۔ میں بھاگا۔ یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے عاجز ہوا اور زنگی پیچھے تھا، تب مجھ کو حضرت شیخ یاد آئے اور میں نے فریاد کی کہ "یا شیخ فرید الدین!" زنگی کھڑا ہو گیا اور "قدس اللہ سرّہ" کہا، پھر اُلٹا چلا گیا۔ الحمد للہ کہ میں نے اس کے شر سے خلاصی پائی۔[2]

## حاضر باش!

(۳۶) فرمایا: ایک شخص محمد نیشاپوری شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید الدینؒ کے مرید تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ہندوؤں[3] کے مُلک میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ راستے میں جا رہا تھا اور کوئی ہتھیار بھی میرے پاس نہ تھا کہ ایک ہندو تلوار کھینچ کر میرے آگے آیا۔ میں دوڑا اور میں نے کہا: "یا شیخ حاضر باش!" کہ فوراً ہندو کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور تھر تھر کانپنے لگا کہ مجھ کو امان دو۔ میں نے کہا: تجھ کو امان دی اور اس کی تلوار بھی اُٹھا کر اس کے حوالے کی۔ وہ اپنے رستے چلا گیا اور میں اپنی راہ چلا آیا۔[4]

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۱۶): صفحات ۱۵۴-۱۵۵؛ فوائد الفواد: صفحات ۲۵۲-۲۵۳

[2] دُررِ نظامی (باب ۱۶): صفحات ۱۵۵-۱۵۶

[3] "ہندو" فارسی قدیم میں ڈاکو اور لٹیرے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا ہندو بمعنی باشندۂ ہند سے کچھ علاقہ نہیں۔ یہاں مترجم نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ "میں ڈاکوؤں کے علاقے میں رہتا تھا"۔

[4] دُررِ نظامی (باب ۱۶): ص ۱۵۶؛ فوائد الفواد: ص ۱۲۹

## شیخ کی صحبت

(۳۷) فرمایا: شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ سرّہ کسی کو چلّہ نشینی کا حکم نہ فرماتے بلکہ یہ فرماتے کہ اگر تم اس درویش کی صحبت کو چلّہ نشینی سے کم سمجھتے ہو تو چلّہ میں بیٹھو۔[۱]

## قرض کی ممانعت

(۳۸) فرمایا: شیخ فریدالدین قدّس سرّہ کبھی قرض نہ کرتے، جو کچھ آتا فوراً خرچ فرماتے ورنہ صبر کرتے۔ آخر کچھ نہ کچھ غیب سے موجود ہو جاتا۔ اور فرماتے: جو شخص اس فقیر کا مرید ہو اس کو قرض نہ لینا چاہیے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضور! میں کاتب ہوں، وقت بے وقت کاغذ و سیاہی کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ فرمایا کہ تمہارے واسطے تین درہم لینے کی اجازت ہے۔[۲]

## قطب صاحبؒ کا حال

(۳۹) کسی نے شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ سرّہ سے دریافت کیا کہ حضرت شیخ الاسلام شیخ قطب الدین بختیار قدس اللہ سرّہ کے پاس پیالہ اور دسترخوان تھا؟ فرمایا: نہیں! حضرت نہایت تجرید کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک بقال آپ کے ہمسایہ میں رہتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی تو قرض لے لیتے اور بقال سے فرمادیا تھا کہ جب تمہارے تین سو درہم ہوجائیں تو پھر قرض نہ دینا اور جب آپ کی خدمت میں فتوح آتی تو قرض ادا کر دیتے۔ آخر آپ نے قرض لینا بھی چھوڑ دیا۔ ایک کاک آپ کے مصلے کے نیچے سے برآمد ہوتا اور سب گھر کے لوگ اس کو ہی نوش کرتے۔ بقال یہ سمجھا کہ حضرت مجھ سے ناخوش ہیں جو قرض منگوانا چھوڑ دیا۔ آخر اس نے اپنی بیوی کو حضرت کے گھر میں بھیجا اور حضرت کی اہل خانہ نے کاک کا واقعہ اس کے سامنے بیان فرمادیا۔ دوسرے روز کاک پیدا نہ ہوا۔ حضور نے اہل خانہ سے فرمایا کہ تم نے کسی سے ذکر کیا تھا؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! بقال کی بیوی آئی تھی۔ میں نے اس کے آگے ذکر کر دیا...[۳]

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۱۶): ص ۱۶۱

[۲] ایضاً (باب ۱۸): ص ۱۶۴

[۳] ایضاً (باب ۱۸): صفحات ۱۶۴-۱۶۵؛ سیرالاولیاء: صفحات ۴۸-۴۹

## باباصاحبؒ کابستر

(۴۰) فرمایا: ایک استراحت کے وقت جو میں شیخ فریدالدین قدس اللہ سرّہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ جس کمبل پر آپ دن کو تشریف رکھتے تھے وہی پلنگ پر بچھا ہے اور وہ پیروں تک نہیں پہنچتا وہاں چادر رکھی ہے کہ اگر چادر کو اوڑھیں تو وہ جگہ بغیر بستر کے رہ جائے اور حضرت شیخ الاسلام قطب الدین بختیار کاکیؒ کا عصا سرہانے رکھ لیتے اور جب اُٹھتے تو ہاتھ سے اس پر سہارا لیتے اور اس کو بوسہ دیتے۔ آخر وقت بھی ان کے ہاں از حد عسرت تھی۔ یہاں تک کہ ماہ رمضان میں بھی جو کھانا حاضرین کے واسطے آتا وہ ان کو کافی نہ ہوتا۔ میں نے ایک شب بھی سیر ہو کر نہ کھایا۔ اس کے علاوہ اور جو مجاہدے حضور نے کیے ہیں کس کی طاقت ہے کہ ان کو کر سکے۔[۱]

## درویش کی معاش

(۴۱) فرمایا: جو درویش طاعت و عبادت میں مصروف ہے بیت المال میں اس کا کچھ حق نہیں ہے۔ جو درویش کہ تعلیم و تعلّم یا درس و تدریس کا سلسلہ نہیں رکھتے جس میں مسلمانوں کا نفع ہے ان کو بیت المال سے کیا تعلق؟ درویشوں کی روٹی زنبیل گردانی سے ہونی چاہیے۔

بغداد میں اب تک درویشوں کی زنبیل پھرتی ہے اور اجودھن میں حضرت شیخ فریدالدینؒ کی زنبیل پھرتی تھی۔[۲]

## چاقو کا تحفہ

(۴۲) فرمایا: ایک شخص حضرت شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کی خدمت میں چھری لایا۔ آپ نے وہ اس کو واپس کر دی اور فرمایا: یہ قطع کرنے کا آلہ ہے، اس کو میرے پاس نہ لاؤ۔ میرے پاس سُوئی لاؤ کہ ملانے کا آلہ ہے۔[۳]

## ضمیر غائب میں

(۴۳) شیخ الاسلام حضرت فریدالدینؒ اپنا حال اس طرح بیان فرماتے تھے کہ "ایک درویش کا یہ حال تھا اور اس نے یہ کیا۔" میں سمجھ گیا تھا، جان لیتا تھا کہ حضرت اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔[۴]

---

[۱] دُررِنظامی (باب ۱۸): ص ۱۶۷؛ فوائدالفواد: ص ۸۷؛ سیرالاولیاء: صفحات ۶۵-۶۶

[۲] دُررِنظامی (باب ۱۹): ص ۱۷۳ [۳] ایضاً (باب ۱۹): ص ۱۷۳؛ فوائدالفواد: ص ۳۸۴

[۴] دُررِنظامی (باب ۲۰): ص ۱۷۶؛ فوائدالفواد: ص ۱۴۰؛ سیرالاولیاء: ص ۳۳۶

## دُنیا قدموں میں

(۴۴) فرمایا: شیخ فرید الدینؒ فرماتے تھے کہ جو شخص دُنیا کو ترک کرتا ہے خداوند تعالیٰ دُنیا اور دُنیا داروں کو اس کے پیروں میں لاڈالتا ہے۔ فرمایا: کبھی کبھی نظام الدین کوتوال اپنے ملازم کے ہاتھ میرے پاس کچھ بھیجا کرتے تھے جس کے سبب سے میرے یاروں کی زحمت رفع ہوتی۔ ایک مرتبہ جو تنگی واقع ہوئی تو مجھ کو اُن کا خیال آیا۔ اسی وقت میں نے توبہ کی کہ اب ان کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ ان کا ہدیہ جو آیا تو میں نے واپس کر دیا۔ انھوں نے میرے قدموں میں گر کر اصرار و الحاح شروع کیا اور وہ روپے بھی میرے قدموں میں پڑے تھے۔ مجھ کو اُسی وقت حضرت شیخ کا بھی فرمان یاد آیا کہ جو دُنیا کو ترک کرتا ہے خداوند تعالیٰ دُنیا اور دُنیا داروں کو اس کے قدموں میں لاڈالتا ہے۔[۱]

## دونوں جہان ہیچ

(۴۵) فرمایا: ابتدائے حال ہی میں مجھ کو کسی چیز کے جمع کرنے کا خیال نہ تھا اور میرا پیوند بھی ایسی جگہ ہوا کہ جن کی نظر میں دونوں جہان کچھ چیز نہ تھے۔[۲]

## ایک جوگی سے مُکالمہ

(۴۶) میں اجودھن شریف میں تھا کہ ایک جوگی حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے ہاں اصل کار کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: ہمارے ہاں آدمی کے دو عالم رکھے گئے ہیں: ایک عالمِ علوی جو سر سے ناف تک ہے۔ دوسرا عالمِ سفلی جو ناف سے لے کر پاؤں تک ہے۔ عالمِ علوی میں صدق و صفا اور اخلاقِ حسنہ ہیں اور عالمِ سفلی میں پاکی اور پارسائی ہے۔ فرمایا: حضرت فرماتے ہیں کہ مجھ کو جوگی کی یہ بات بہت پسند آئی۔[۳]

## بابا صاحبؒ کا تحمّل

(۴۷) فرمایا: شیخ فرید الدینؒ کا ایسا تحمل تھا جس کا بیان ممکن نہیں ہے۔ فرمایا: ایک دفعہ پانچ درویش حضرت شیخ فرید الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ پانچوں نہایت غضب ناک اور سخت کلام تھے۔ حضرت کے آگے سے اُٹھ کر کہنے لگے

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۲۰): صفحات ۱۷۷-۱۷۸؛ فوائد الفواد: ص ۲۱۵

[۲] دُررِ نظامی (باب ۲۰): ص ۱۸۱؛ فوائد الفواد: ص ۸۳

[۳] دُررِ نظامی (باب ۲۲): صفحات ۱۸۹-۱۹۰؛ فوائد الفواد: ص ۱۴۴

کہ ہم نے اس قدر سفر کیا مگر کوئی درویش نہ ملا۔ حضرت نے فرمایا: بیٹھو! میں تمہیں درویش دکھاتا ہوں۔ انھوں نے جلدی کی۔ حضرت نے فرمایا: اگر جاتے ہو تو جنگل کے راستے سے نہ جانا۔ انھوں نے حضرت کے فرمان پر کچھ التفات نہ کیا۔ تب حضرت نے ان کے پیچھے ایک آدمی بھیجا تاکہ دیکھے وہ کدھر جاتے ہیں۔ آدمی نے آکر عرض کیا کہ وہ بیابان کی طرف گئے ہیں۔ حضرت یہ سنتے ہی بہت روئے۔ پھر اس کے بعد خبر آئی کہ ان میں سے چار آدمی تو لُوہ سے ہلاک ہوئے اور پانچویں نے ایک کنوئیں پر پہنچ کر اس قدر پانی پیا کہ وہ بھی ہلاک ہو گیا۔[۱]

## درویشوں کا جھگڑا

(۴۸) فرمایا: میں شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر تھا کہ چند نوجوان جو خواجگانِ چشت ہی سے پیوند رکھتے تھے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے آپس میں کچھ جھگڑا ہے۔ حضرتؒ اپنے مریدوں میں سے کسی کو حکم دیں جو ہمارا جھگڑا سُن لیں۔ حضرت نے مجھ کو اور مولانا بدرالدین اسحٰقؒ کو حکم دیا کہ تم سنو۔ ہم ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے آپس میں گفتگو شروع کی۔ ایک نے کہا: میں نے آپ سے یہ عرض کیا تھا اور آپ نے یہ فرمایا۔ پھر میں نے یہ گذارش کی یا میری سمجھ میں نہیں آیا یا میں نے غلطی کی تھی۔ دوسرے نے بھی اسی طرح جواب دیے کہ میری خطا تھی، آپ حق پر ہیں۔ غرضیکہ ایسی عمدگی اور لطافت کے ساتھ تقریر کی کہ ہم دونوں پر گریہ طاری ہوا اور ہم نے کہا کہ ان کو خدا نے ہماری تعلیم کے واسطے بھیجا ہے کہ جھگڑے اس طرح فیصل کرنے چاہئیں کہ گردن کی رگ نہ ابھرے یعنی غصّہ کا اظہار نہ ہو۔[۲]

## تیر بہدف

(۴۹) فرمایا: جامع اجودھن میں ایک شخص قاضی کی طرف سے خطیب تھا۔ اس نے نماز میں ایسا غلط پڑھا کہ سب لوگوں نے نماز دُہرائی۔ اس پر قاضی عبداللہ نے جو اجودھن کے قاضی تھے، لوگوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور ان کے بیٹے محمد ابوالفضل نے جو ایک جنگجو شخص تھا، کہا کہ جا بجا سے یہ چند لوگ کام سے بھاگ بھاگ کر یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت مکان پر تشریف لائے تو یاراں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ بدزبانی کرے اور وہ تحمّل سے کام لے تو خیر ورنہ اگر وہ بھی جواب دے تو جائز ہے۔ حضرت کا

---

۱؎ دُررِ نظامی (باب ۲۳): صفحات ۱۹۷-۱۹۸؛ فوائدالفواد: ص ۴۲۶؛ سیرالاولیاء: ص ۸۶

۲؎ دُررِ نظامی (باب ۲۴): صفحات ۲۰۱-۲۰۲؛ فوائدالفواد: ص ۱۴۷

یہ فرمانا تھا کہ اسی وقت قاضی کے بیٹے پر فالج گرا۔ قاضی حضرت کی خدمت میں ایک سیر قند سفید اور ایک سیر روغن اور ایک سیر میدہ اور دس سیر شکر لے کر حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ عبداللہ! اٹھارہ برس سے میں تمہاری باتیں سُن کر صبر و تحمل کر رہا تھا۔ اب جو کچھ قرآن شریف کا حکم ہو میں اس کی فال لیتا ہوں۔ قرآن شریف کھولا تو اس میں یہ آیت برآمد ہوئی: اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ[1] حضرت نے فرمایا: بس یہی حکم ہے۔ ہر چند قاضی نے الحاح وزاری کی مگر آپ نے دعا نہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تیر نشانے پر پہنچ گیا۔ اور جو کچھ وہ لائے تھے سب واپس کیا۔ جب قاضی واپس گھر پہنچے تو بیٹے کو مُردہ پایا۔[2]

## عبداللہ رومی کا قصہ

(۵۰) فرمایا: غزنیں کے ایک شخص عبداللہ رومی نام شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں رہتے تھے، ایک عرصے کے بعد ان کو سفرِ مُلتان کا اتّفاق ہوا۔ حضرت سے عرض کیا کہ میں مُلتان جانا چاہتا ہوں۔ راستہ پر خوف و خطر ہے۔ حضرت میرے واسطے دُعا فرمائیں کہ میں بسلامت پہنچ جاؤں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہاں سے فلاں مقام تک جہاں ایک حوض ہے میری سرحد ہے اور اس حوض سے مُلتان تک شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی سرحد ہے۔ میری سرحد میں تم صحیح وسلامت پہنچ جاؤ گے۔ عبداللہ رومی کہتے ہیں کہ حضرت کا یہ کلام سُن کر میں روانہ ہوا اور اس حوض تک راستے میں مجھ کو کچھ اندیشہ نہ ہوا۔ جب میں حوض پر پہنچا، وضو کر کے دوگانہ پڑھا اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے استمداد کی کہ یا حضرت! اب میں آپ کی سرحد میں داخل ہوتا ہوں، یہاں تک تو حضرت شیخ فریدالدینؒ نے میری حفاظت کی، اب آپ کیجیے۔ پھر اس کے بعد روانہ ہوا اور صحیح وسلامت مُلتان پہنچ گیا۔ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں پہنچا تو میں کمبل و لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ شیطانی لباس کیوں پہنا ہے؟ اور بہت باتیں کیں۔ میں حیران ہوا کہ لوگ تو سونے چاندی کے خزانے رکھتے ہیں[3] ان کو کچھ نہیں کہتا اور میں نے ایک کمبل پہنا ہے تو اس پر یہ فرما رہے ہیں۔ کہتے

---

[1] سورۂ ھُود، آیت ۴۶

[2] دُررِ نظامی (باب ۲۴): صفحات ۲۰۴-۲۰۵ ؛ سیر الاولیاء: صفحات ۸۴-۸۵

[3] یہاں خود حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی طرف اشارہ تھا جن کے بارے میں مشہور ہے کہ نہایت مالدار تھے۔

ہیں کہ جب شیخ نے یہ دیکھا کہ میں جامے سے بالکل باہر ہو گیا ہوں۔ فرمایا: اس قدر خفا کیوں ہوتے ہو، حوض پر کا قصہ یاد کرو پھر بتاؤ میری کیا تقصیر ہے؟ [۱]

**اجودھن میں**

(۵۱) فرمایا: حضرت شیخ فریدالدینؒ ایک مدت ہانسی میں رہے۔ علم وافر تھا۔ اس پر عمل کیا۔ مشہور ہو گئے، تب وہاں سے اپنے آبا و اجداد کے مقام پر چلے گئے مگر چونکہ یہ جگہ مُلتان سے قریب تھی، یہاں بھی مشہور ہو گئے، تب خیال کیا کہ یہاں سے لاہور چلا جاؤں جو اس وقت ویران پڑا ہوا تھا اور وہاں پر دریا بھی ہے۔ آخر ستائیس سال آپ نے اجودھن میں گذارے اور وہیں وفات پائی۔ [۲]

(۵۲) فرمایا: شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ فرماتے تھے:

ہر کہ در بند نام و آوازہ است  خانہ او برونِ دروازہ است [۳]

**نیکی کا بدلہ**

(۵۳) فرمایا: ایک دفعہ میں حضرت شیخ فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ فرمانے لگے کہ ایک دفعہ میں نے کچھ گیہوں کے دانے چڑیوں کے آگے ڈالے اور دوسرے روز ایک شخص مجھ کو ایک من گیہوں اور ایک تنکہ نقد دے گیا۔ اس کے بعد حضرت نے یہ بیت پڑھی:

خورش دہ بہ کنجشک و کبک و حمام  کہ ناگہ ہمائے در اُفتد بدام [۴]

**بابا صاحبؒ عالمِ مشغولی میں**

(۵۴) فرمایا: شیخ فریدالحق والدّین قدس اللہ سرّہ کو میں نے دیکھا کہ حجرہ کے اندر سر برہنہ کیے ہوئے تشریف رکھتے ہیں، چہرہ متغیّر ہے اور زبانِ مبارک پر یہ بیت جاری ہے:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم  خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی  از بہر تو میرم ز برائے تو زیم

یہ بیت پڑھ کے سجدہ کیا، پھر سر اُٹھا کر وجد میں مشغول ہوئے اور اسی طرح کرتے رہے۔

---

[۱] دُررِ نظامی (باب ۲۴): صفحات ۲۱۳-۲۱۴؛ فوائد الفواد: صفحات ۲۳۵-۲۳۶

[۲] دُررِ نظامی (باب ۲۵): ص ۲۲۰ [۳] ایضاً: ص ۲۲۰

[۴] ایضاً (باب ۲۶): ص ۲۲۷؛ سیر الاولیاء: ص ۷۷

میں نے حجرے کے اندر جاکر پیروں میں سر رکھ دیا۔ فرمایا کہ مانگو! کیا مانگتے ہو؟ میں نے ایک دینی چیز مانگی جو حضرت نے مجھ کو عنایت فرمائی۔ پھر میں پشیمان ہوا کہ میں نے سماع کے اندر وفات ہونے کی فرمایش کیوں نہ کی۔

حضرت قاضی محی الدین کاشانی ؒ نے عرض کیا کہ مخدوم نے کون سی چیز طلب کی تھی؟ فرمایا: استقامت۔ [۱ھ]

### وقت کی قضا نہیں

(۵۵) فرمایا: ایک دفعہ حضرت شیخ فریدالدین نوّر اللہ مرقدہٗ پر ایک حال طاری تھا۔ حضرت نے ایک مرید کو آواز دی۔ وہ نماز میں مشغول تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سلام پھیر کر عرض کیا: لبّیک۔ حضرت نے فرمایا: اب وہ وقت گذر گیا:

گر وقت خوش است آن غنیمت میدار کان را چو نمازہا قضا نتوان کرد [۲ھ]

### ایک رُباعی

(۵۶) فرمایا: ایک دفعہ میں نے حضرت شیخ فریدالدین قدس اللہ روحہٗ کی خدمت میں عریضہ تحریر کیا اور اس کے اندر یہ رباعی تحریر کی:

زان روز کہ بندۂ تو دانند مرا بر مردمک دیدہ نشانند مرا
لطف عامت عنایتے فرمودہ است ورنہ کیم از کجا چہ دانند مرا

اس کے بعد جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ وہ رباعی جو تم نے لکھی تھی یاد کرلی ہے [۳ھ]

### زبان درکش

(۵۷) ایک روز حضرت نے یہ بیت پڑھنی شروع کی اور ہر بار چہرۂ مبارک میں ایک تغیّر پیدا ہوتا۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت آگیا۔ نہ معلوم کہ خاطر مبارک میں کیا تھا اور کون آپ سے یہ بیت پڑھواتا تھا:

نظامی این چہ اسرار است کز خاطر عیان کردی
کسے سرش نمی داند زبان درکش زبان درکش [۴ھ]

---

۱ھ دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ص ۲۳۶؛ فوائد الفواد: صفحات ۳۴۱-۳۴۲

۲ھ دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ۲۳۶؛ فوائد الفواد (ص ۲۹۲) میں ہے کہ خواجہ بدرالدین اسحٰق ؒ کو آواز دی تھی۔

۳ھ دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ص ۲۳۸؛ فوائد الفواد: ص ۳۰۱

۴ھ دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ص ۲۳۸؛ فوائد الفواد: ص ۱۷۴

## حالتِ سماع

(۵۸) فرمایا: ایک روز حضرت شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہٗ نے سماع سُننا چاہا۔ قوال حاضر نہ تھا۔ اسی وقت مولانا بدرالدین اسحٰقؒ عرائض کا خریطہ لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ نے فرمایا: کھڑے ہوکر پڑھو۔ انھوں نے قاضی حمیدالدین نوّراللہ مرقدہٗ کا مکتوب نکال کر پڑھنا شروع کیا جس میں لکھا تھا کہ "فقیرِ حقیر ضعیف نحیف محمد عطا کہ او بندہ پروردہٗ درویشان است واز سرو دیدہ خاک قدم ایشان"۔ حضرت پر ان الفاظ کے سنتے ہی ذوق وکیف طاری ہوا۔ اس کے بعد اس مکتوب میں یہ رباعی لکھی تھی:

آن عقل کجا کہ در کمالِ تو رسد　　آن روح کجا کہ در جمالِ تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال　　آن دیدہ کجا کہ در جمالِ تو رسد[1]

(۵۹) فرمایا: جب میں نے سماع میں کسی چیز کی تعریف یا صفت سنی، اس کو حضرت شیخ کے اوصاف و اخلاق پر حمل کیا۔ ایک دفعہ قوال نے یہ بیت پڑھی:

مخرام بدین صفت مبادا　　کز چشم بدت رسد گزندے

مجھ کو اس کے سنتے ہی حضرت کے اوصاف اور اخلاق یاد آئے اور میں ایسا بے خود ہوا کہ جس کا بیان ممکن نہیں ہے[2]

(۶۰) فرمایا: خواجہ خضر پارہ دوز حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ درویشوں نے سماع شروع کیا۔ جب مجلس گرم ہوئی حضرت کی طبیعت ناساز تھی، دونوں ہاتھ اُٹھا کر یہ بیت پڑھنے لگے:

کو صاحبِ درد تا نمایم　　صد گریہ ہزار زہر صد ریش[3]

## شیخ جمال ہانسویؒ کی وفات

(۶۱) فرمایا: میں حضرت شیخ شیوخ العالم کی زیارت کے واسطے روانہ ہوا۔ جب ہانسی میں پہنچا شیخ جمال الدین ہانسویؒ سے ملاقات ہوئی، وہ بیمار تھے۔ اس سبب سے میں چند روز ٹھہر گیا۔ آخر جب ان کا انتقال ہوگیا

---

[1] دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): صفحات ۲۴۰-۲۴۱؛ فوائدالفواد: ص ۲۵۴؛ سیرالاولیاء: ص ۵۰۲
[2] دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ص ۲۴۱؛ فوائدالفواد: ص ۱۶۶؛ سیرالاولیاء:
[3] دُرِرِ نظامی (باب ۲۷): ص ۲۴۱

توسوم کے بعد میں روانہ ہوکر حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ نے جمال الدین کا حال دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت چشم پر آب ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ ان کی نماز کی کیا کیفیت تھی؟ میں نے عرض کیا کہ تین روز کی نماز فوت ہوئی۔ حضرت خاموش ہو گئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰقؒ نے کہا: یہ اچھا نہ ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضرت تو خاموش ہو گئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰقؒ نے کہا: یہ اچھا نہ ہوا۔ انھوں نے ایسا کیوں کہا؟ پھر جب بدرالدین اسحٰق کا آخری وقت پہنچا تو آپ نے جماعت سے نماز ادا کی اور وظیفہ ختم کیا۔ پھر اشراق پڑھی اور وظیفہ میں مشغول ہوئے۔ پھر چاشت پڑھ کر سر بسجدہ ہوئے اور جاں بحق تسلیم کی۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بے شک ایسے شخص کی یہ بات کہنی بجا تھی۔[1]

**انار کا دانہ**

(۶۲) فرمایا: ابتدا میں شیخ فریدالدین انار اللہ مرقدہ نمازگاہ کھتوال میں جو آپ کے آبا و اجداد کا مقام تھا عبادت کرتے تھے۔ جب شیخ جلال الدین تبریزی وہاں پہنچے تو لوگوں سے دریافت کیا: یہاں کوئی درویش ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! قاضی صاحب کے فرزند شیخ مسعود خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہیں۔ شیخ جلال الدین تبریزی یہ سن کر آپ سے ملنے نمازگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک شخص نے انار پیش کیا۔ آپ اس کو لیے ہوئے بابا صاحب کے پاس آئے اور ملاقات کے بعد انار کے ٹکڑے کر کے آگے رکھ لیے' کھانا شروع کیا۔ بابا صاحب روزے سے تھے، اس سبب سے آپ نے نہ کھایا اور آپ کا ازار (پاجامہ) بوسیدہ تھا، آپ گھڑی گھڑی کُرتے سے اس کو ڈھکتے مگر ہوا کھول دیتی۔ شیخ جلال الدینؒ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا کہ بخارا میں ایک درویش نے پانچ سال تک طالب علمی کی ہے۔ تم اس بات سے کیوں شرم کرتے ہو؟ (درویش کہہ کر شیخ نے خود اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔) پھر شیخ جلال الدین تبریزی رخصت ہوئے تو بابا صاحبؒ کو افسوس ہوا کہ میں نے روزہ افطار کر کے کیوں نہ ان کے ساتھ انار نوش کیا اور ایک دانہ جو وہاں پڑا رہ گیا تھا، اسی کو اٹھا کر نوش

---

[1] درر نظامی (باب ۲۸) ص ۲۴۸؛ سیر الاولیاء: ص ۱۷۷ میں یہی واقعہ ہے مگر شیخ جمال ہانسویؒ کا نام نہیں لکھا۔ "بزرگے بود از خلفاے شیخ شیوخ العالم" لکھا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے نام حذف کر دیا ہو۔ کتابوں میں اس طرح کی تحریفیں ہمیشہ ہوتی آئی ہیں اور سیر الاولیاء میں تو یقیناً ہوئی ہیں۔

فرمالیا۔ اس کے بعد جب حضرت باباصاحبؒ حضرت خواجہ قطب الاقطاب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

"مسعود جو انار کا دانہ مقصود تھا وہ تم کو پہنچ گیا خاطر جمع رکھو۔" [1]

## ملک الفقراء والمساکین

(۶۳) فرمایا: ابتداء میں جب کہ میں باباصاحبؒ کا مرید بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک عورت کے پیچھے جا رہا ہوں۔ وہ عورت ایک مکان میں داخل ہوئی اور میں دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ اتنے میں میں نے سُنا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوا کہ ایسی پریشان حالت میں کس طرح حضورؐ کو مُنہ دکھاؤں۔ پھر اسی وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لے آئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا مَلِكَ الْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ ــــــ اور مجھ کو بغل میں لے لیا۔ جب میں بیدار ہوا تو دل میں خطرہ گذرا کہ لفظ "مساکین" کا "فقراء" سے بدل ہونا جائز ہے؟ پھر دل سے کہا کہ کاش میں علم نہ پڑھتا تاکہ رسولِ خدا کے فرمان پر اعتراض کا خطرہ نہ گذرتا۔ [2]

## حضرت محبوب الٰہی کے لیے باباصاحب کی دعاء

(۶۴) فرمایا: جس بیماری میں حضرت خواجہ فریدالدین قدس اللہ سرہ نے وصال فرمایا ہے، جب وہ شروع ہوئی تو آپ نے مجھ کو اور چند دیگر مریدان کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ فلاں حظیرۂ شہداء میں جا کر شب بیداری کرو اور میرے واسطے دعاء مانگو۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور کھانا بھی وہیں ساتھ لے گئے۔ رات بھر دعاء کی، پھر صبح کو حضرت کی خدمت میں

---

[1] دُررِ نظامی (باب ۲۸): ص ۲۵۳-۲۵۴ ؛ سیر الاولیاء: ص ۶۲-۶۳

[2] دُررِ نظامی (باب ۲۸): ص ۲۵۵

حاضر ہوئے اور صورت حال عرض کی۔ حضرت نے کچھ تامل کے بعد فرمایا کہ تمہاری دعا، نے میرے اندر کچھ اثر نہ کیا۔ علی بہاری عرض کرنے لگے کہ ہم لوگ ناقص ہیں اور حضرت شیخ کامل ہیں، پھر ناقصوں کی دعا، کامل کے حق میں کیا اثر کر سکتی ہے۔ حضرت کے گوش مبارک تک یہ بات نہ پہنچی تو میں نے اس کو دُہرایا۔ حضرت نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے خدا سے دعا، کی ہے کہ جو کچھ خدا سے چاہو تم کو عنایت کرے۔ پھر پانچویں تاریخ ماہ محرم انتقال فرمایا اور آخری وقت میری نسبت فرماتے تھے کہ وہ دہلی میں ہے۔ فرمایا: آخری وقت حضرت پر بے ہوشی غالب تھی۔ عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو دریافت کیا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ کسی نے عرض کیا کہ ہاں حضور، پڑھی ہے۔ فرمایا: ایک بار اور پڑھ لوں، کیا خبر ہے پھر کیا ہو؟ پھر تیسری اور پڑھی۔[1]

## باسعادت زمانہ

(۶۵) فرمایا کہ شیخ سیف الدینؒ کی وفات کے تین سال بعد شیخ بہاء الدینؒ نے اور ان کے تین سال بعد حضرت فرید الدینؒ نے انتقال فرمایا ہے۔ فرمایا: وہ زمانہ بڑا باسعادت تھا جس میں یہ بزرگوار موجود تھے:

شیخ ابو الغیث یمنی، سیف الدین باخرزی، شیخ فرید الدین، شیخ بہاء الدین، شیخ سعد الدین حمویہ قدس اللہ اسرارہم۔[2]

---

[1] درر نظامی (باب ۳۰): ص ۲۶۶-۲۶۷؛ فوائد الفواد: ص ۱۰۰؛ سیر الاولیاء: ص ۱۲۳-۱۲۴

[2] درر نظامی (باب ۳۰): ص ۲۶۸؛ فوائد الفواد: ص ۳۷۵

# حضرت امیر خسروؒ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے چہیتے مرید حضرت امیر خسرو سے کتنا گہرا قلبی تعلق تھا اس کے شواہد جمع کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ اب ضرب المثل بن چکا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ میں سب سے تنگ آ جاتا ہوں حتّٰی کہ خود اپنے وجود سے بھی۔ مگر اس "تُرک" سے تنگ نہیں آتا[1]۔ آپ نے حضرت امیر خسرو کو "ترک اللہ" کا لقب بھی مرحمت فرمایا[2]۔ قدیم شاعری میں 'ترک' کا لفظ کنایۃً محبوب کے معنوں میں آتا ہے اس لیے ترک اللہ کا بھی وہی مفہوم سمجھنا چاہیے جو "محبوبِ الٰہی" کا ہے۔

سیر الاولیا یا فوائد الفواد جیسی قدیم کتابوں سے یہ اندازہ تو نہیں ہوتا کہ حضرت امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد سے خلافت بھی حاصل تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ امیر خسرو آپ کے سب سے چہیتے مرید تھے۔ خلافت اس لیے نہ دی ہوگی کہ وہ دربار سے متعلق رہے اور حضرت نے انھیں کبھی اس تعلق سے روکا بھی نہیں۔ لیکن لطائف اشرفی میں امیر خسرو کو "از خُلّصِ خلفاء و مخصوصِ ندما" لکھا گیا ہے[3]۔

حضرت محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو کا تعارف کب ہوا اور اس کے اسباب

---

[1] سیر الاولیا امیر خورد کرمانی : مطبع محب ہند دہلی، ص ۳۱۲۔

[2] ایضاً : ص ۳۱۳۔ [3] لطائف اشرفی : جلد ۱، ص ۳۶۰ و جلد ۲، ص ۳۷۰۔

کیا تھے اور امیر خسرو نے کس زمانے میں بیعت کی، ان سب امور پر ابھی تک فیصلہ کن مواد نہیں ملا ہے۔ حضرت نظام الدین نے اپنی والدہ ماجدہ کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم اپنے وطن بدایوں میں حاصل کی اور پھر مزید تعلیم کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ دہلی کا پہلا سفر تنہا کیا تھا تاکہ یہاں حالات کا جائزہ لے سکیں۔ پھر دوسرے سفر میں اپنی والدہ ماجدہ، بیوہ بڑی بہن اور ان کے بچوں کو ساتھ لے کر آئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ اور ۲۰ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت امیر خسرو کے والد سے تعارف حاصل ہُوا۔

دیباچہ غرۃ الکمال کی رو سے امیر خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہوئی اور اسی سنہ کی تائید ان کی دوسری تصانیف سے بھی ہوتی ہے۔ جب امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود کا انتقال ہوا تو ان کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر سیف الدین محمود نے ۶۵۹ھ یا ۶۶۰ھ میں انتقال کیا۔ بعض روایات ہیں، جن کا مصدر مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے، یہ کہا گیا ہے کہ جب امیر خسرو اپنے والد کے ساتھ پہلی بار حضرت نظام الدین کی خدمت میں پہنچے تو دروازے ہی پر ٹھہر گئے اور والد کے ساتھ اندر نہیں گئے بلکہ ایک رباعی فی البدیہ لکھ کر بھیج دی:

تو آن شاہی کہ بر ایوانِ قصرت — کبوتر گر نشیند، باز گردد
فقیرے مستمندے بر در آمد — بیاید اندرون، یا باز گردد؟

حضرت نظام الدین نے بھی اس کا جواب فی البدیہ رباعی کی شکل میں دیا اور ایک پرچے پر یہ لکھ کر بھیج دیا:

بیاید اندرون مرد حقیقت — کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
گر ابلہ بود آن مرد نادان — ازان راہے کہ آمد باز گردد

سیر الاولیا میں ہے کہ حدِّ بلوغ کو پہنچنے کے بعد حضرت امیر خسرو نے سلطان المشائخ

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا: لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو۔ ص ۱۶۔

سے بیعت کی[1] اگر یہ رباعی والا قصہ صحیح ہے تو یہ ۶۶۰ھ سے قبل کا واقعہ ہوگا اور اس وقت امیر خسرو ۸-۹ سال سے زیادہ کے نہیں تھے جب کہ انھوں نے خود دیباچہ دیوان غرۃ الکمال میں لکھا ہے کہ بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شعر گوئی کا آغاز والد کے انتقال کے بعد ۶۶۲ھ کے آس پاس اور سلطان بلبن کی تخت نشینی سے قبل ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا سال وفات عام طور پر ۶۶۴ھ بیان کیا جاتا ہے۔ سیر الاولیا میں جو خلافت نامہ درج ہوا ہے[2] اس کی تاریخ کتابت ۶۶۹ھ بیان ہوئی ہے۔ مختلف شواہد کی روشنی میں صحیح یہی ہے کہ بابا صاحب کا انتقال ۶۷۰ھ میں ہوا۔ نیشنل میوزم دہلی میں محفوظ ایک قلمی نسخے کے آغاز میں کچھ مادہ ہائے تاریخ درج ہیں۔ ان میں حضرت بابا فرید کے انتقال کی تاریخ "کلید گنج شکر بود" سے برآمد کی گئی ہے جو ۶۶۹ھ ہوتی ہے۔[3]

بہر حال ہمیں اتنا معلوم ہے کہ حضرت بابا فرید نے اپنی زندگی کے آخری سال میں خلافت مرحمت فرمائی تھی۔ اپنے پیر و مرشد کی زندگی میں، اور ان سے اجازتِ بیعت حاصل کیے بغیر تو کسی کے مرید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بارے میں تو یہ بھی روایت ہے کہ جب تک سید بدر الدین اسحٰق دہلویؒ صدر حیات میں رہے، حضرت نظام الدینؒ نے از راہِ ادب کسی کو مرید نہیں کیا۔ اور بدر الدین اسحٰقؒ اپنے پیر و مرشد کے بعد ۶-۷ سال تک ضرور زندہ رہے۔ ان سب باتوں سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے حدِ بلوغ کو پہنچ کر یعنی ۶۷۰ھ کے بعد ہی حضرت نظام الدینؒ سے بیعت کی ہوگی۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی ۶۷۱ھ میں بیعت ہونا تسلیم کیا ہے۔ اس صورت میں یہ روایت غلط ہو جاتی ہے کہ امیر خسرو کے والد بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔

---

[1] سیر الاولیا، ص ۳۱۳۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۶۔

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے: "امیر خسرو۔ احوال و آثار" مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری میں میرا مضمون بہ عنوان "افضل الفوائد" ص ۳۴۵-۳۶۹۔

حضرت امیر خسرو کے دو بھائی اور تھے: حُسام الدین قتلغ خاں جنھوں نے ۶۹۸ھ میں اسی ہفتے میں انتقال کیا جس میں ان کی والدہ ماجدہ نے رحلت کی تھی، اور عزّالدین علی شاہ جو فوائد الفواد کی ۱۳ رمضان ۷۰۷ھ کی مجلس میں موجود ہیں۔[1] امیر حسن دہلوی نے لکھا ہے:

"عزّالدین علی شاہ سلّمہ اللہ تعالیٰ کہ یکے از مریدانِ خاص بود۔"

سیر العارفین مولّفہ جمالی دہلوی کی رو سے یہ امیر خسرو کے بڑے بھائی تھے[2] اور وحید مرزا نے امیر خسرو کو منجھلا بھائی بتایا ہے۔[3]

امیر خسرو کی اولاد میں ہمیں چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کے نام ملتے ہیں: غیاث الدین ملک احمد، محمد،[4] خضر اور مبارک ان کے بیٹے ہیں: عفیفہ اور میمونہ دو صاجزادیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب بھی سلسلہ نظامیہ میں بیعت تھے۔ امیر خسرو کے ایک پوتے، ہمیں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلسوں میں نظر آتے ہیں۔ انھیں "خسرو ثانی" کہا جاتا تھا۔ اس سے گمان ہے کہ شعر کہتے ہوں گے۔ حضرت سیّد محمد حسینی گیسو دراز سے ان کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک دن چراغ دہلیؒ کے مریدوں نے آپس میں یہ گفتگو کی کہ صوفیا کا قاعدہ ہے وہ زرد رنگ کی جوتی پہنتے ہیں مگر ہمارے شیخ (حضرت چراغ دہلی) لال رنگ کی پاپوش پہنتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟ چنانچہ بعض نے ایک عمدہ اور نفیس، بناوٹ کی زرد کفش خرید کر شیخ کو نذر کر دی۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے ایک پانو سجادے پر رکھا اور دوسرے پانو میں وہ جوتی پہن کر دیکھی، پھر اُسی وقت وہ زرد جوتی خسرو ثانی یعنی امیر خسرو کے پوتے کو مرحمت فرما دی کیوں کہ حضرت چراغ دہلی اپنے شیخ کے اتباع میں ہمیشہ لال رنگ کی جوتی پہنا

---

[1] فوائد الفواد مرتّبہ لطیف ملک: طبع لاہور، ص ۹۔ [2] جمالی دہلوی: سیر العارفین اردو ترجمہ: محمد ایوب قادری، ص ۸۷ اس میں نام اعز الدین علی شاہ لکھا ہے لیکن عزّالدین صحیح ہے۔

[3] وحید مرزا: لائف اینڈ ورکس، ص ۱۷۔ [4] ان کے بیٹے محمد کا انتقال امیر خسرو کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ محمد کا مرثیہ دیوان غرۃ الکمال میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک بیٹے حاجی نام کے تھے، ان کا مرثیہ دیوان نہایۃ الکمال میں ملتا ہے۔

کرتے تھے۔ "خسرو ثانی" مجلس سے باہر نکلے اور خواجہ گیسو دراز سے خوش ہو کر کہا کہ آج مجھے خدمتِ شیخ سے ایک کفشِ زرد مرحمت ہوئی ہے۔ حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ مشائخ سے کفش کا عطیہ ہونا دو باتوں میں سے ایک کی علامت ہوتا ہے یا تو تمھیں سیر و سلوک میں مراتبِ اعلا نصیب ہوں گے یا خود اس جہاں سے سفر کرو گے۔ ابھی اُن جوتیوں کا رنگ میلا بھی نہ ہوا تھا کہ خسرو ثانی اچانک بیمار ہوئے اور چند روز کی علالت کے بعد سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔[۱] یہ چراغ دہلی کی حیات کا واقعہ ہے یعنی خسرو ثانی کا انتقال ۷۵۷ھ سے قبل ہوا ہوگا۔

حضرت امیر خسرو کے نانا عماد الملک راوت عرض تھے جن کا انتقال ۶۷۱ھ میں ہوا۔ یہ بڑے کرّوفر کے امیر تھے۔ ان کی آبائی آن بان کا کچھ نقشہ برنی کی فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے۔[۲] دہلی میں منڈہ دروازے کے پُل کے پاس ہی ان کی بڑی حویلی تھی جس کے ایک حصّے میں حضرت نظام الدین اولیا بھی کچھ عرصے تک رہے تھے۔ غیاث پور میں تشریف آوری سے پہلے آپ نے دہلی چھوڑ کر پٹیالی میں رہنے کا ارادہ بھی کیا تھا کیوں کہ اس زمانے میں امیر خسرو وہیں تھے۔[۳]

امیر خورد کرمانی مولّف سیر الاولیا کا بیان ہے کہ یہ امیر خسرو کی شعر گوئی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ جو کچھ وہ کہتے تھے اسے بنظرِ اصلاح حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملاحظے میں پیش کرنے لگے۔ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ "تم صفاہانی طرز پر شعر کہا کرو، یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز۔"[۴] اس نصیحت کو امیر خسرو نے گرہ میں باندھ لیا اور خال و خط کی تعریف میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ اس فن کو حدِ کمال تک پہنچا دیا۔ اس مشورے سے خود حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اعلا تنقیدی شعور اور گہرے

---

[۱] جوامع الکلم (ملفوظات حضرت گیسو دراز): انتظامی پریس، حیدر آباد۔
[۲] برنی: تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ: ڈاکٹر معین الحق) طبع لاہور۔
[۳] فوائد الفواد (مرتّبہ لطیف ملک): طبع لاہور، ص ۲۴۲۔
[۴] سیر الاولیا: ص ۳۱۱۔

رچے ہوئے شعری ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے امیر خسرو کی صلاحیتوں کو ابتدا ہی میں صحیح راستے پر لگا دیا۔ انھوں نے اپنے دواوین غرۃ الکمال، وسط الحیاۃ اور نہایۃ الکمال شیخ کی خدمت میں پیش کیے۔ اپنی بیشتر تصانیف میں امیر خسرو نے حمد و نعت کے بعد پہلے اپنے پیر و مرشد کی مدح کی ہے، پھر بادشاہ وقت کی تعریف لکھی ہے۔ دیباچۂ دیوان غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں :

"بعد از توحیدِ احد، و محامد محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم انچہ بر بندہ فرض است خواندنِ دعاے شیخ کامل و مکمّل و مقتداے واصلِ مُوصل، و عنوان توقیع عنایتِ الٰہی، و مضمون نامہ اسرار نامتناہی است سُبحان شَیْخِیْ کہ آیتے است از مصحفِ مجید بلکہ نسختیست از منشورِ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی. شیخ عالم بلکہ شیخ الشیوخ عالم نظام الحق والدّین کہ نظمِ کارِ عالم بجواہر منظومِ سُبحۂ او بر بستہ است. زہے بیناے صادق نظر کہ مکنونات اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ را در سوادِ عینِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ تضمین فرمودہ است وخہے داناے رموزِ خداوند اکبر کہ مُغلقاتِ وَعِنْدَہٗ مَفَاتِیْحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ را در سبقِ ازل حل کردہ۔ دلِ رحیمش بہ صنعتِ تقریبِ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ مشغول. درونہ لطیفش بطرفِ ربّانی وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاظِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاضِرَۃٌ مخصوص. شاعر براے او چہ بیت سازد کہ بیت اللہ بیت او ست اَلْمَسْجِدُ بَیْتُ کُلِّ تَقِیٍّ وَّبَرٍّ. دران روز کہ ہمہ گفتار ہا را بسنجند وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ اِلْحَقُّ. امّید دارم کہ در میزان اقوالِ رکیکِ ما را اگر وزنے باشد از مدائح و محامد او باشد"۔[1]

---

[1] دیباچہ دیوان غرۃ الکمال، ص ۴-۵۔

ان کی تصانیف میں مثنوی قران السعدین اور مثنوی تغلق نامہ میں منقبت شیخ کے اشعار نہیں ہیں۔ تغلق نامہ تو نا مکمّل رہ گیا تھا، قران السعدین کے بارے میں، جو ۶۸۸ھ کی تصنیف ہے، یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ منقبت شیخ سے کیوں خالی ہے؟

مثنوی شیرین و خسرو ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی تھی، اس میں منقبت کے ۲۶ اشعار ہیں، چند یہ ہیں:

بسقفش کردہ جبریل آشیانہ ملک در صحنِ او کنجشک خانہ
دل از نورِ حضورش باد معمور جز این نورِ حضور از ہمتش دور

مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی ۶۹۸ھ کی تالیف ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کا روحانی فیض اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا اور اس نے سارے معاشرے میں نئی روح پھونک دی تھی۔ اس مثنوی میں منقبت کے ۱۵ اشعار اس عنوان کے ساتھ دیے ہیں:

مدح شیخ الطریقت نظام الحق والحقیقۃ محمدؐ، کہ عیسیٰ آخر الزمانش فرستادند تا دم جان بخشِ او اسلامِ محمدی از سرِ زندہ گردانید و عمرِ جاوید بخشید۔ متّعَ اللّٰہُ المُسلِمِینَ بِطُولِ بَقَائِہٖ:

چون گوہرِ مدحِ خواجہ سفتم از غیب شنیدم انچہ گفتم
اکنون قدرے دُرِ معانی ریزم بسرِ جُنیدِ ثانی
قطبِ زمن و پناہ ایمان سر جملۂ جملۂ کریمان
در شرع نظامِ دینِ احمد یعنی کہ نظامِ دینِ محمدؐ
در حجرۂ فقر پادشاہے در عالمِ دلِ جہان پناہے
بر خاک ز رحمت آسمانے بر چرخ ز دولت آستانے
شاہنشہِ بے سریر و بے تاج شاہانش بخاک پاے محتاج
.... بیناترِ جملہ پاک بینان بیدار ترینِ شب نشینان
.... مسند ز سپہر بر ترش باد خسرو چو ستارہ چاکرش باد

اس طرح مثنوی مطلع الانوار بھی ۶۹۸ھ کی تصنیف ہے، اس میں امیر خسرو نے شاہ وقت کی مدح سے پہلے ۴۸ اشعار اپنے پیر و مرشد کی منقبت میں لکھے ہیں:

شیخِ اُمم قطبِ حقیقت نظام / خضر و مسیح از دم یحییٰ العظام
عصمتیانِ حرم آسمان / جلوہ کناں در نظرش ہر زمان
چوں بہوا بُردہ دو دستِ دُعا / گشتہ ہر انگشت کلید سما
سکّۂ کارش بفروع و اصول / تابع قال اللہ و قال الرسول
زیرِ فلک قطب زمانہ ہموست / قطب دو گویند یگانہ ہموست
بر درِ او ہر کہ ارادت نمود / زندۂ جاوید شد ار مردہ بود
از پئے گمراہی جانہا رقیب / وز پئے بیماری دلہا طبیب
راہروے کو بطریق صفا / رفتہ قدم بر قدم مصطفےٰ
چوں دم الہام زدہ کامِ او / نائب وحی آمدہ الہام او
سر کہ بزیر قدمش گشت خاک / موے بمو از سرِ سودا ست پاک

مفتخر از وے بہ غلامی منم
خواجہ نظام است و نظامی منم

اگلے سال ۶۹۹ھ میں انھوں نے مثنوی آئینہ سکندری لکھی۔ اس میں بھی ۳۷ اشعار منقبت کے ہیں۔ چند یہ ہیں:

پناہِ جہاں، دینِ حق را نظام / رہِ قدس را پیشواے تمام
جہان زندہ از جانِ بیدارِ او / زمین روشن از روزِ بازارِ او
قدم گاہش از پایۂ عرش بیش / کفِ پایش از بوسۂ خلق ریش
زمین و فلک در ولایت حدش / ولے گوشۂ بوریا مسندش
گرہ مفلس و توشہ دان پُر ز دُر / شکم خالی و دل ز گنجینہ پُر
دم خُلق، او چوں صبا جان نواز / نوالش ہمہ وقت مہمان نواز
ز نظارۂ روے آن آفتاب / ہمہ پاک چشمان دو دیدہ پُر آب

بَرد بار خلق ار چہ بسیار تر کسے نیست از وے سبکبار تر

جہان زو ہمہ وقت پُر نور باد

زمین را درش بیتِ معمور باد

مثنوی دولرانی خضرخاں ۷۱۵ھ میں لکھی گئی۔ اس میں شاہ وقت کی مدح سے پہلے حضرت شیخ کی منقبت کے ۲۴ اشعار ہیں اور حسب معمول امیر خسروؒ نے قلب و روح کی گہرائی سے عقیدت کے موتی نچھاور کیے ہیں۔ یہ حضرت امیر کے بھی بڑھاپے کا زمانہ ہے اس لیے اپنے حسن خاتمہ کی دعا کرتے ہیں :

نظام الدین حق فرخندہ نامے کہ دینِ حق گرفت از وے نظامے

زعلمش در دو عالم روشنائی دو عالم، علم کسبی و عطائی

حدیثش چون خبر در امر و در نہی بیک پایہ فرود از پایۂ وحی

بصدر خضر و عیسیٰ مسند آرای خضر بوسیدہ دستش، خضر خان پای

بہر سو کز دمش بادے رسیدہ ہزاران کوہِ رنج از جا بریدہ

کلاہش را نیارم نام گیرم زہے بخت ار تہ کفشش بمیرم

خدایا آن گزیدہ بندۂ خاص کہ ہست الحمد للہ جفت اخلاص

بہ قربت ہم نشینِ مصطفیٰ باد

دران قرب ایستادش بہرِ ما باد

بعض منقبتی اشعار سے حضرت نظام الدین اولیا کے بارے میں دِل چسپ سوانحی اشارے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی انگوٹھی پر رَبِّ اغْفِرْ لِی وَهَبْ لِی مُلْكًا لَّا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِی[1] کندہ کیا ہوا تھا۔ یہ وہ قرآنی دعا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے مانگی تھی :

زیر نگین عرصۂ ملکِ جمش آیۂ "هَبْ لِی" رقمِ خاتمش

---

[1] پارہ ۲۳، رکوع ۳۔

ایک اور شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چہار ترکی چوگوشیہ کلاہ جو حضرت اپنے مریدوں کو مرحمت فرماتے تھے، اس کے بیچ میں ایک گول گھنڈی بھی لگی ہوتی تھی :

زافسرِ شاہان کُلہِ او فرہ     برکلہش ہاے ھُوَ اللّٰہُ گرہ

اسی طرح ایک شعر میں آپ کے عصا کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ بالکل سیدھی چھڑی استعمال فرماتے تھے یعنی اس کا سرا خم دار نہیں ہوتا تھا :

راست عصایش چو شہابے بروز     دیو کُش و بلکہ عزازیل سوز

ان چند کے علاوہ بھی ان منقبتی اشعار میں ایسے سوانحی اشارے موجود ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیا کے تذکرہ نگار کو مدد مل سکتی ہے۔

امیر خسرو کبھی کبھی منقبت کے اشعار لکھ کر اپنے مرشد کو سُنایا بھی کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے مدح کے کچھ اشعار اپنے شیخ کو سُنائے تو انھوں نے از راہِ لطف و قدر دانی فرمایا: "بولو! کیا صلہ چاہتے ہو؟" —— ان کے مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بھی اپنی مدح میں شمس دبیر کا قصیدہ سُنا تھا اور اس میں ایک جگہ اصلاح بھی دی تھی۔ آخر میں از راہِ مرحمت پوچھا تھا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ شمس دبیر نے اپنی تنگی معاش دُور ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ بابا صاحب نے دعا دی تھی اور اسی کا یہ ثمرہ تھا کہ شمس دبیر بادشاہ کے بیٹوں کا اتالیق مقرر ہُوا اور بلبن کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کیا۔ اسی طرح حضرت نظام الدینؒ نے بھی امیر خسرو سے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو؟ —— انھوں نے برجستہ کہا کہ :

"شیرینیِ سخن چاہتا ہوں۔ میرے کلام میں رس پیدا ہو جائے۔"

حضرت نے مسکرا کر فرمایا :

"جاؤ اندر میرے پلنگ کے نیچے ایک طشت میں کچھ شکر رکھی ہے، وہ اُٹھا لاؤ۔" یہ اُٹھا کر لائے تو حضرت نے حکم دیا کہ "اسے اپنے اوپر نثار کرو اور کچھ اس میں سے چکھ لو۔" [۱]

---

[۱] سیر الاولیا فارسی ، ص ۳۱۱-۳۱۲-

امیر خسرو نے ایسا ہی کیا۔ چنان چہ شیرینیِ کلام آج تک ہمارے کام و دہن کو لطف دے رہی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے انتقال کی تاریخ بھی "طوطی شکر مقال" سے برآمد ہوتی ہے۔

بعد میں امیر خسرو پشیمانی کے طور پر کہا کرتے تھے کہ اس وقت میں نے شیخ سے کوئی اور بڑی نعمت کیوں نہ طلب کی۔ ایک بار حضرت شیخ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب بھی امیر خسرو کو ذائقہ کرایا تھا۔[1] یہ شیخ کی کرامت ہی ہے کہ امیر نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں اتنا لکھا کہ اس سے اچھا خاصا چھوٹا موٹا کتب خانہ جمع ہو سکتا ہے۔ نظم و نثر دونوں میں طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ —— ان کے علاوہ ہندی، فارسی، ترکی، عربی زبانوں میں شعر کہے۔ موسیقی کے بول باندھے۔ کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوسخنے، چوبولے کہے —— خمسۂ نظامی گنجوی حضرت شیخ کو بہت پسند تھا اور وہ اسے پڑھوا کر سُنا کرتے تھے۔ امیر خسرو نے خمسۂ نظامی کا جواب، حضرت شیخ ہی کی فرمایش پر لکھا تھا۔

مولف سیر الاولیا کا بیان ہے کہ آپ نے قاضی معزالدین پائچہ کے ساتھ[2] صنائع و بدائع اور قواعدِ شعر میں کوئی رسالہ بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا اور اس کی تائید لطائف اشرفی ملفوظات حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانی سے بھی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود امیر خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اور دوسرے منقبتی اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ فن شعر میں بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے شاگرد ہیں۔

جب وہ کوئی نئی کتاب تصنیف کرتے تو سب سے پہلے اس کا نسخہ حضرت کی خدمت میں نذر کرتے۔ آپ اُسے دستِ مبارک میں لے کر فرماتے کہ "آؤ فاتحہ پڑھیں" —— پھر سورۂ الحمد پڑھ کر کتاب کی قبولیت و برکت کی دعا مانگتے۔ کبھی اِدھر اُدھر سے

---

[1] مثنوی نہ سپہر میں ہے:

من از وے لعابِ دہان یافتم     کہ زین گونہ آبِ دہان یافتم

[2] سیر الاولیا، ص ۳۱۱۔

دو چار ورق اُلٹ پلٹ کر اسی وقت کچھ ملاحظہ بھی فرماتے اور یہ حضرت شیخ کی دعاؤں کا اثر ہی ہے کہ اس عہد کی ہزاروں لاکھوں کتابیں ضائع ہوگئیں اور انقلابات وحوادثات نے بڑے بڑے کتب خانے تباہ کر دیے مگر حضرت امیر خسرو کی تصانیف آج تک بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔

شیخ یہ ضرور چاہتے تھے کہ امیر خسرو صرف شعرو شاعری کے مفتون ہو کر نہ رہ جائیں اس سے بھی بہتر اور اعلیٰ مقصد پر ان کی نظر رہے۔ چنان چہ قلم و نظم و نثر کے انتظام، دربارِ شاہی میں حاضری کے التزام اور لاؤ لشکر کے ساتھ دُور دراز کے علاقوں تک سیرو سیاحت کے باوجود امیر خسرو کبھی اپنی روحانی ترقّی سے غافل نہ رہتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے صحیح لکھا ہے کہ ہر چند وہ ملوک و امرا سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کا دل دوسری طرف ہی متوجّہ تھا اور اس کا ثبوت ان کی تصانیف کی برکات سے ملتا ہے۔ کیوں کہ اہلِ معصیت کے آثار میں برکت کم ہوتی ہے اور انھیں قبول خاطر نصیب نہیں ہوتا۔[۱]

امیر خسرو کے بے تکلّف دوست ضیاء الدین برنی نے بھی گواہی دی ہے کہ:

"اس تمام فضل و کمال اور فصاحت و بلاغت کے باوجود وہ مستقیم الحال صوفی بھی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصّہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا۔ وہ متعدّی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ شیخ کے خاص مریدوں میں تھے اور میں نے اتنا عقیدت مند کوئی اور مرید نہیں دیکھا۔ عشق و محبّتِ الٰہی سے ان کو پورا حصّہ ملا تھا۔ صاحب سماع اور صاحب وجد و حال تھے۔ گانے اور راگ وغیرہ ایجاد کرنے کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ موزوں اور لطیف طبیعت سے جس فن کو بھی نسبت ہے اس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے سرآمد روزگار

---

[۱] اخبار الاخبار، ص ۹۹ (مطبع مجتبائی، دہلی)۔

پیدا کیا تھا۔ ان کا وجود عدیم المثال تھا اور آخر زمانے میں ان کی شخصیت نوادر روزگار میں سے تھی۔"[1]

امیر خورد کا بیان ہے کہ امیر خسرو ہر شب نماز تہجد پڑھنے کے بعد قرآن شریف کے سات پارے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت شیخ نے دریافت فرمایا: "کھوترک! مشغولی کا کیا حال ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "حضرت! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آخر شب میں رونا بہت آتا ہے۔" حضرت نے فرمایا: "الحمد للہ! اب کچھ آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔"[2]

امیر خسرو دہلی سے باہر کبھی لشکر کے ساتھ جاتے تھے۔ پہلے وہ شہزادہ محمد خاں خلف سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ مُلتان گئے تھے اور وہاں پانچ سال تک رہے۔ اس وقت میر حسن علا سجزی دہلوی (جامع فوائد الفواد) بھی سلطان محمد خاں سے وابستہ تھے۔ یہاں ۲۹ ذی الحجہ ۶۸۳ھ کو منگولوں کے لشکر سے مقابلہ ہوا اور ناگاہ شہزادہ محمد خاں شہید ہو گیا۔ یہ بڑا باکمال، علم دوست، معارف پرور، شایستہ اور مکارم اخلاق سے آراستہ انسان تھا۔ امیر حسن دہلوی، امیر خسرو، ضیاء الدین برنی اور دوسرے موّرخین نے اس کی مرگِ ناگہاں پر گہرے جذبات رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور نظم و نثر میں مرثیے لکھے ہیں۔

امیر خسرو کو منگول سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور اپنے علاقے کی طرف لے کر چلے۔ یہ شدید گرمی کا موسم تھا۔ لُو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ مُلتان کے صحرا میں کیسا موسم ہوگا، اس کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ نمونہ دوزخ بنا ہُوا ہوگا۔ امیر خسرو اور ان سپاہیوں کو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد کہیں پانی نظر آیا۔ یہاں امیر خسرو نے اپنی خدا داد ذہانت سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ اب یہ سپاہی جھک کر پانی پئیں گے اور اس سے اپھر جائیں گے اس لیے انھوں نے صرف ۲-۳ گھونٹ پی کر اپنا حلق تر کر لیا اور منگول سپاہیوں نے

---

[1] برنی: تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۲۲ (اردو ترجمہ)۔

[2] سیر الاولیا: ۳۱۲۔

ڈگڈگا کر بیا۔ وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ امیر خسرو خود کو ان کی قید سے چھڑا کر فرار ہو گئے۔ مجمل فصیحی[1] میں اس گرفتاری کا ذکر ہے مگر یہ لکھا ہے کہ انھیں منگول گرفتار کر کے لے گئے تھے پھر ان کا کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا انجام ہوا۔ ۶۸۴ ہجری میں امیر خسرو دہلی واپس آچکے تھے۔

جب امیر خسرو دہلی سے باہر جاتے تھے تو حضرت نظام الدین اولیاؒ انھیں محبّت آمیز اور اشتیاق انگیز خطوط لکھتے تھے جن میں انھیں "ترک اللہ" کے نام سے ہی یاد فرماتے تھے۔ امیر خسرو نے ان خطوط کو بہت احتیاط سے رکھا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ انھیں میرے ساتھ دفن کیا جائے، ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن خدا ان متبرّک کاغذ کے پرزوں کے صدقے میں ہی مجھے بخش دے۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خطوط حضرت امیر خسرو کے ساتھ ہی مدفون ہوئے ہوں گے مگر ان میں سے بعض خطوط کے مطالب سیر الاولیا میں بھی جا بجا آگئے ہیں۔ ایک خط جو حضرت نے امیر خسرو کے نام بھیجا تھا اس میں یہ الفاظ تھے :

"بعد از محافظتِ جوارح از امور نا مرضیۂ شرع اجتناب نماید و در مراعاتِ اوقات ہم کوشد و عمرِ عزیز کہ سببِ تحصیلِ کلّی مرادات است غنیمت شمُرد، و روزگار را بطالت مصروف نگرداند و اگر در ضمیر انشراح یابد بر پئے انشراح رود کہ آن در طریقتِ اصلی معتبر است۔ در کُل کارہا استخارہ را تقدیم نماید"۔[2]

(اعضاے بدن کی حفاظت کے بعد شریعت کے ناپسندیدہ کاموں سے پرہیز کرو، اوقات کی پابندی کا خیال رکھو اور عمرِ عزیز کو جو تمام مرادوں کے حصول کا وسیلہ ہے غنیمت جانو اور اپنا وقت فضول نہ گنواؤ۔ اگر ضمیر میں انشراح پاؤ تو اس کی پیروی کرو کہ اصلی طریقت میں یہی معتبر ہے اور تمام کاموں میں استخارہ کو

---

[1] مجمل فصیحی (طبع تہران)۔ [2] اخبار الاخیار، ص ۹۹۔

مقدّم رکھو۔)

حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں امیر خسرو کی حاضری عموماً رات کو ہوتی تھی اور نماز عشا کے بعد جب حضرت استراحت فرماتے اور بستر میں لیٹ جاتے تو امیر خسرو پلنگ کی پٹّی پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت صرف مخصوص ترین حضرات، خاص خدّام اور حضرت کے قرابت دار ہی حجرے میں جا سکتے تھے۔ یہ بے تکلّف گفتگو کا وقت ہوتا تھا۔ لطیفے، چٹکلے، حکایتیں، دربار کے قصّے، نئی تازی خبریں اور ان پر تبصرے اس مجلس کے موضوعات ہوتے۔ امیر خسرو کی ساری عمر درباروں میں گذری تھی۔ علمِ مجلسی، آدابِ محفل اور فنِ گفتگو کے بادشاہ تھے۔ معمولی سی بات بھی کرتے تو اسے غیر معمولی بنا دیتے تھے۔

وہ جو حالیؔ نے غالبؔ کے لیے کہا ہے:

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلّف اور اس کی سیدھی بات
دِل میں کھُبتی تھی وہ اگر بہ مثل دِن کو دِن کہتا اور رات کو رات

یہی حال حضرت امیر خسرو کی شیرینی گفتار کا تھا۔ حضرت بھی پورے انبساطِ خاطر کے ساتھ ان کی باتوں میں دِل چسپی لیتے اور بار بار اُکساتے "ہاں ترک! پھر کیا ہُوا؟"

امیر خسرو نے متعدّد بادشاہوں کے دربار سے تعلّق رکھا اور ان میں سے بیشتر اپنے پیش رو بادشاہوں کو قتل کر کے تخت نشین ہوئے تھے مگر امیر کا دامن ہر طرح کی تہمت اور آلایش اور سازش سے پاک رہا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی سب سے نبھ گئی۔ اسی طرح خانقاہ میں بھی حضرت کے کسی خادم یا مرید کو حضرت امیر خسرو سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ امیر خسرو اپنے پیر بھائیوں کی سفارش کرتے اور ان کے کام آتے تھے۔ ایک دن عشا کے وقت خانقاہ میں آئے تو دیکھا کہ جماعت خانے میں علی بن محمود جاندار بیٹھے ہیں۔ ان سے علیک سلیک کے بعد از راہ خوش طبعی کہنے لگے:

"تم تو شطرنج کے بڑے رسیا تھے، رات دن بساط بچھائے بیٹھے رہتے تھے، اب کیا حال ہے؟"

علی بن محمود جاندار نے کہا: "سچ ہے بھائی! شطرنج سے میرے عشق کا یہ حال تھا کہ

اگر میں سفر حج میں بھی ہوتا تو شاید اسے ترک نہ کرتا مگر جب سے مرید ہوا ہوں اب اس کا دھیان بھی نہیں آتا۔"[1]

امیر نے خدمت شیخ میں پہنچ کر یہ مکالمہ سُنایا۔ حضرت کے پاس ایک انار رکھا تھا، وہ امیر خسرو کو مرحمت کیا اور فرمایا: جاؤ نیچے جا کر علی بن محمود کے ساتھ بیٹھ کر اسے کھالو۔

حضرت کے خلفا اور مریدین میں سے اگر کسی کو کچھ معروضہ پیش کرنا ہوتا تھا اور خود گذارش کرنے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی تو امیر خسرو کا توسّط اختیار کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں دو واقعات معلوم و مشہور ہیں۔

حضرت برہان الدین غریبؒ ہانسوی (متوفّٰی ۷۳۷ھ) خانقاہ میں مطبخ کے انچارج تھے، چوں کہ دُبلے پتلے تھے، جسم پر گوشت کم تھا، عمر بھی ستّر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ زمین میں بوریے پر بیٹھتے تھے تو ہڈّیوں کو زمین کی سختی ناگوار ہوتی تھی، اس لیے اپنا کمبل چوڑا کر کے گدّی سی بنا لیتے تھے اور اس پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن علی زنبیلی اور ملک نصرت نے، جو علاء الدین خلجی کے درباریوں میں سے تھے اور حضرت نظام الدینؒ کے مرید ہو گئے تھے، حضرت برہان الدین غریبؒ کی چغلی کھائی کہ وہ مشائخ کی طرح گدّی پر بیٹھتے ہیں۔ حضرت کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا اور اسی وقت خواجہ اقبال سے فرمایا:

"جاؤ برہان الدین غریبؒ سے کہہ دو کہ وہ ابھی اپنے گھر واپس چلے جائیں۔"

یہ فرمان سُن کر حضرت غریبؒ کا رنگ فق ہو گیا۔ تعمیل حکم میں وہاں سے نکلے اور مولانا ابراہیم طشت دار کے گھر پر آ گئے۔ یہاں دو دن تک رہے مگر شیخ کے معتوب کو کون پناہ دے سکتا تھا؟ انھوں نے بھی حضرت غریب سے معذرت کر لی کہ اگر شیخ کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے تمھیں پناہ دے رکھی ہے تو وہ کیا سوچیں گے۔ مناسب ہے کہ آپ شہر کو واپس چلے جائیں۔ اب یہ نہایت غمزدہ و رنجیدہ اپنے گھر آ کر بیٹھ گئے ——

---

[1] دُررِ نظامی (اردو ترجمہ): ص ۱۳۳۔

آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ دوست احباب جو تسلّی و تعزیت کے لیے آتے تھے، وہ ان کا بلکنا دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ امیر خسرو، حضرت غریب، اور چراغ دہلی میں بڑے مخلصانہ و دوستانہ تعلقات تھے۔ امیر خسرو مولانا غریب کے پاس گئے اور پھر خدمتِ شیخ میں جاکر ان کی طرف سے معذرت پیش کی مگر شیخ کی بے رضائی کا وہی عالم رہا۔ آخر دوستوں نے مل کر یہ طے کیا کہ امیر خسرو دستار گردن میں ڈال کر عذر تقصیر کے لیے خدمت شیخ میں جائیں۔ یہ مجرموں کی عذر خواہی کی علامت تھی۔ امیر خسرو کو اس طرح عذر خواہ دیکھ کر شیخ نے پوچھا: "ترک! یہ کیا ہے؟" تب انھوں نے مولانا غریب کے جرائم معاف کیے جانے کی درخواست پیش کی۔ آپ نے تبسّم فرمایا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ انھیں فوراً گھر سے بلوایا گیا۔ وہ آئے تو امیر خسرو اور مولانا غریب دونوں پھر گردن میں دستار ڈال کر صفِ نعال میں کھڑے ہوگئے۔ شیخ نے مولانا غریب کو معاف کر دیا اور انھیں تجدید بیعت سے مشرّف کیا۔[1] یہ سختی اس تربیت کے لیے تھی کہ خود ساختہ سجّادہ نشین بننے کی نقل اور شائبے سے بھی اچھی طرح ڈرا دیا جائے۔ آج ہمیں اس آئینے میں اپنا حال دیکھنا چاہیے کہ ہم کیسی بے غیرتی اور دیدہ دلیری کے ساتھ خود کو سجادہ نشین بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا ہے۔ انھوں نے حضرت امیر خسرو سے کہا کہ خدمت شیخ میں تمھارا اثر و رسوخ بہت ہے، کوئی مناسب وقت دیکھ کر میرا ایک معروضہ پیش کر دو کہ میں اودھ (موجودہ فیض آباد) میں رہتا ہوں اور خلق خدا کی آمد و رفت کی وجہ سے مجھے مشغولی باطن کا پورا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ اگر شیخ کی اجازت ہو تو میں کسی پہاڑ یا جنگل کی طرف نکل جاؤں اور پھر فراغ باطن کے ساتھ اللہ اللہ کروں۔ امیر خسرو نے ایک دن نمازِ عشا کے بعد خدمت شیخ میں یہ درخواست پیش کر دی۔ شیخ نے فرمایا:

"او را بگو ترا درمیان خلق می باید بود و جفا و قفائے خلق می باید کشید و مکافات آن بہ بذل و ایثار و عطا می باید کرد۔"[2]

(ان سے کہو کہ تمھیں خلقِ خدا کے سامنے رہ کر کڑوی کسیلی جھیلنی چاہیے اور اس کے بدلے میں

---

[1] سیر الاولیا (فارسی): ص ۲۸۹-۲۹۰ [2] سیر الاولیا: ص ۲۴۷۔

بذل و ایثار اور بخشش کرنا چاہیے۔)

پھر فرمایا کہ یہ نفس دھوکا دے رہا ہے۔ فراغ خاطر سے کسی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے بہانے سے آرام اور سکون کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ صحرا نشین ہونے کے بعد شہرت بھی ہو جاتی ہے، پھر خلق کا وہاں جمگھٹ ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا مقصد تو عوام کی اخلاقی زندگی کی اصلاح کرنا تھا۔ انفرادی نجات مطلوب نہیں تھی، اس لیے حضرت چراغ دہلیؒ کو اس خطرے پر اتنی تنبیہ کی گئی۔

امیر خسرو کے بارے میں حضرت شیخ نے وقتاً فوقتاً جو کلمات فرمائے یا لطف و مرحمت خاص کے جو واقعات پیش آئے وہ سب امیر نے قلم بند کر لیے تھے۔ یہ اچھا خاصا رسالہ بن گیا ہوگا۔ اس میں سے کچھ اقتباسات سیر الاولیا میں آ گئے ہیں لیکن وہ رسالہ اب نہیں ملتا۔ بہت ممکن ہے وہ بھی تبرکات کے ساتھ امیر خسرو کی قبر میں دفن کر دیا گیا ہو۔

ایک بار کسی نے حضرت نظام الدینؒ سے عرض کیا کہ امیر خسرو کے حال پر آپ کی جو عنایات ہیں ان میں سے ایک شمّہ نظر عنایت میرے حال پر بھی ہو جائے۔ حضرت کا کمال اخلاق یہ تھا کہ اس کی دل شکنی کے خیال سے کوئی جواب نہیں دیا البتّہ اس شخص کے محفل سے چلے جانے پر حاضرین سے فرمایا: "اس وقت میرے دل میں آئی کہ اس شخص سے کہوں کہ پہلے وہ قابلیت بھی تو پیدا کر لو۔" [1]

آپ اکثر امیر خسرو سے فرماتے تھے کہ میری زندگی کی دعا مانگا کرو کیوں کہ تمھاری زندگی میری بقا پر موقوف ہے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ تمھیں میرے پہلو میں دفن کیا جانا چاہیے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ جب مجھے جنّت کی طرف لے جائیں گے تو تمھیں بھی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

ایک بار شیخ نے خواب میں دیکھا کہ منڈھ پُل کے نیچے اور شیخ نجیب الدین متوکّلؒ کے دروازے کے سامنے ایک نہر جاری ہے، بہت صاف اور شفّاف۔ میں ایک

---

[1] سیر الاولیا: ص ۳۱۲۔

اونچی سی دکان پر بیٹھا ہوں، بہت اچھا پُر کیف سماں ہے اور اس وقت دل میں ایک امّید واری پیدا ہوئی، اچانک تم مجھے یاد آئے۔ میں نے تمھارے لیے خدا سے ایک ایسی نعمت طلب کی جو ہمیں مطلوب ہے۔ پھر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ دعا مستجاب ہوگئی۔ اِن شاءاللہ تمھارے اندر وہ حال پیدا ہوگا۔[1]

ایک دن حضرت نے فرمایا کہ آج رات کو مجھے یہ القا ہوا کہ خسرو درویشوں کا نام نہیں ہُوا کرتا۔ آج سے خسرو کو "محمد کاسہ لیس" کہا جائے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ یہ خطاب غیب سے عطا ہوا ہے اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کی خبر دی ہے۔ اس خطاب کی بدولت بندہ بہت سی نعمتوں کا امّیدوار ہے۔[2]

ایک دن حضرت شیخ، امیر خسرو سے فرمانے لگے: "میں نے کل جمعہ کی شب میں ایک خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ صدرالدین عارف فرزند شیخ بہاءالدین زکریا مُلتانیؒ تشریف لائے ہیں۔ میں ان سے بہت ادب و احترام سے پیش آیا ہوں۔ خود انھوں نے بھی اتنی تواضع اور احترام کا اظہار کیا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دُور سے تم چلے آتے ہو۔ ہمارے پاس آکر تم نے معرفت کا بیان شروع کر دیا ہے۔ اسی اثنا میں صالح موذّن نے فجر کی اذان دی اور میری آنکھ کُھل گئی۔" یہ خواب سُنا کر آپ نے امیر خسرو سے کہا: "بتاؤ یہ کیا مرتبہ ہے؟"

امیر خسرو نے عاجزی اور نیازمندی سے عرض کیا: "میں آستان مبارک کا ایک خاکروب ہوں، میں اس مرتبے کا کیا اندازہ کر سکتا ہوں۔ سب کچھ آپ ہی کا عطا کیا ہُوا ہے۔"

یہ جواب سُن کر حضرت شیخ بآواز بلند رونے لگے اور ان کے ساتھ ہی امیر خسرو کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ جب گریہ تھما تو حضرت نے خاص اپنی کلاہ عطا فرمائی اور اپنا لباس امیر خسرو کو اپنے ہاتھ سے پہنایا۔ پھر یہ وصیّت فرمائی کہ "مشائخ کے ملفوظات کا

---

[1] سیر الاولیا: ص ۳۱۳۔ [2] ایضاً۔

اکثر مطالعہ کیا کرو۔" [1]

حضرت شیخ نے نظم میں بھی امیر خسرو کی مدح لکھی ہے۔ آپ کی ایک رباعی سیرالاولیا میں نقل کی ہے:

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست  ملکیّتِ مُلکِ سخن آن خسرو راست
آن خسروِ ماست، ناصرِ خسرو نیست  زیراکہ خدائے ناصرِ خسرو ماست

سماع کی محفلوں میں بھی امیر خسرو کے دم سے بڑی شورش اور گرمی رہتی تھی۔ اگر شیخ کو کیفیت ہو جاتی تو کبھی خسرو خود بھی گانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک دن غیاث پور میں سیّد محمد کرمانی کے مکان پر امیر خسرو نے کچھ دوستوں کی دعوت کی۔ حضرت شیخ کے علاوہ شہر کے دوسرے مشائخ بھی مدعو تھے۔ بہلول قوّال نے امیر حسن دہلوی کی یہ غزل شروع کی:

زہے تُرکے کہ از خمہاے ابرو  کمان پیدا کند پنہان ز تدبیر
بگوشِ مدعی کے جاے گیرد  مزا میرے کہ ہست اندر مزامیر

سماع ختم ہُوا تو امیر خسرو نے اپنی غزل شروع کر دی مگر مطلع ہی پڑھ کر رہ گئے، آگے نہیں پڑھا گیا۔ اپنی غزل چھوڑ کر سعدی کا کلام سنانے لگے:

مُعلّمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت
جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت

اس وقت ساری محفل پر خاص کیفیت طاری تھی۔ بعد میں کسی نے امیر خسرو سے پوچھا کہ آپ سے آج اپنی غزل کیوں نہ پڑھی گئی؟ کہنے لگے: کیا کروں، جب پڑھنے لگتا تھا تو معانی کا ایسا ہجوم ہوتا تھا جسے میں روک نہیں سکتا تھا۔ [2]

۷۲۴ھ میں امیر خسرو تیسری بار اَودھ اور بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے۔ غیاث الدین تغلق نے وہاں کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ

---

[1] سیرالاولیا: ص ۳۱۴۔ [2] ایضاً۔

چڑھائی کی تھی اور دہلی میں اُلغ خاں کو چھوڑ گیا تھا۔ آخر لکھنوتی کے گورنر ناصرالدین نے ترہٹ میں حاضر ہو کر اظہارِ اطاعت کیا۔ وہاں کے انتظامات ٹھیک کر کے غیاث الدین تغلق لشکر سے جدا ہو کر بھاگم بھاگ دہلی کی طرف آیا مگر شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی افغان پور کے چوبیں محل میں دب کر مر گیا۔ یہ ربیع الاوّل ۷۲۵ھ کا واقعہ ہے۔

امیر خسروؔ نے سفر پر جاتے وقت شیخ کو بیماری اور شدید ضعف کے عالم میں دیکھا تھا۔ وہ ان کی خیروعافیت کی اطلاع برابر منگاتے رہے ہوں گے۔ اچانک انھیں شیخ کے وصال کی خبر ملی تو نہایت سراسیمہ ہوئے اور دھاوے پر دھاوے مارتے ہوئے دہلی پہنچے۔ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے، گریبان چاک تھا، بال گرد آلود اور پریشان۔ درگاہ شریف میں آکر قبر سے لپٹ کر خوب روئے، بہت دیر کے بعد کچھ سنبھلے اور کہنے لگے:

"بھلا میں اس بادشاہِ وقت کا کیا ماتم کر سکتا ہوں، میں تو اپنے آپ کو رو رہا ہوں کہ اب سلطان المشائخ کے بعد میں بھی زیادہ دِنوں زندہ نہیں رہوں گا۔"

اسی زمانے میں انھوں نے ایک طویل اور پُر درد مرثیہ ترکیب بند کی صورت میں لکھا جو دیوان نہایۃ الکمال کے بعض قلمی نسخوں میں شامل ہے۔[۱] شاعری اور ساحری سب بھول سب گئے۔ وہ زندہ دِلی سرد پڑ گئی، بزم آرائیاں، نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں اور ساری محفل میں جان ڈال دینے والے خسروؔ اب یاس و حرماں کا پیکر نظر آتے تھے۔ شیخ کی قبر کے مجاور بن کر بیٹھ گئے اور دُنیا بھر سے دِل سرد ہو گیا تھا۔ آخر چھ ماہ بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ ہجری مطابق ۲۵ ستمبر ۱۳۲۵ عیسوی بدھ کے دِن اِنھوں نے بھی انتقال فرمایا اور شیخ کے پائین چبوترے پر دفن کیے گئے۔ جمالی دہلوی

---

[۱] نہایۃ الکمال کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ طویل مرثیہ شامل ہے اور اسے ڈاکٹر آفتاب اصغر نے اپنے مقالہ "امیر خسرو کی مرثیہ نگاری اور مرثیۂ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا" میں مکمل درج کر دیا ہے۔ دیکھو: مجلۂ تحقیق (جلد ۱، شمارہ ۳،۴) (کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور) ۱۹۷۹ء۔

نے ان کا انتقال شیخ سے تین ماہ بعد بتایا ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رجب ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے۔

فرشتہ نے اپنا ماخذ ظاہر کیے بغیر تاریخِ وفات جمعہ ۲۹ ذی قعدہ ۷۲۵ھ لکھی ہے۔ اس حساب سے وہ اپنے شیخ کے بعد تقریباً سات ماہ بقید حیات رہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ سیرالاولیا کی روایت چھ ماہ بعد کی ہے[2] اور یہی سب سے زیادہ لائق اعتماد ہے۔

---

[1] سیرالعارفین اردو ترجمہ ص ۱۲۴:

اس میں ہے کہ امیر خسرو سلطان کی اجازت کے بغیر بنگالہ سے روانہ ہو گئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق امیر خسرو سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا اور حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال سے پہلے وہ افغان پور کے محل میں دب کر مر گیا تھا۔

[2] سیرالاولیا: ص ۳۱۵۔

# حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ

ہندستان میں تصوّف اور صوفیا کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ یہاں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ، شطّاریہ کئی سلسلے پھلے پھولے ہیں اور ان سب کی مختلف شاخوں نے صوفیا کی تعلیمات کے اثرات اور فیضان کو قصبات و دیہات تک پہنچادیا ہے۔ بعض سلسلوں کی تاریخیں اور اولیا کے تذکرے یا ان کے ملفوظات بڑے اہتمام سے لکھے گئے لیکن بہت سی شخصیات وہ ہیں جن کا اثر تو بہت دُور تک پہنچا ہے اور دیر سے قائم ہے لیکن ان کے حالات منظرِ عام پر نہیں آسکے، اس لیے وہ زیادہ مشہور یا متعارف نہیں ہیں۔

ایسی ہی ایک بلند پایہ شخصیت حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی قدّس اللہ سرّہٗ کی ہے۔ وہ مغربی یوپی کی مردم خیز سرزمین امروہہ میں ۱۴ر رجب ۱۰۸۴ھ یعنی ۲۵ر اکتوبر ۱۶۷۳ء کو بُدھ کے دن پیدا ہوئے۔ یہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کا سولھواں سال تھا۔ آپ نسباً صدّیقی ہیں۔ آپ کے جدّ امجد قاضی نظام الدین قریشی عہدِ سلطنت میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ ان کی اولاد سے امروہہ کے شمال مغرب میں پورا ایک محلّہ بسا ہُوا ہے جو قریشیان کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد مفتی محمد طاہر کو ۹۷۰ھ میں جلال الدّین اکبر نے پرگنہ دھام پور میں کچھ معافی عطا کی تھی، اس لیے دو تین پشتوں تک یہ خاندان بوا پور نتھن میں اور شیر کوٹ ضلع بجنور میں بھی مقیم رہا۔

حضرت شاہ عبدالہادی کے جدّ امجد شیخ عبدالسّمیع امروہہ میں آکر آباد

ہوئے تھے۔ ان کے فرزند شیخ محمد حافظ ہوئے۔ یہ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے والد بزرگوار ہیں۔ ان کے پاس زراعت کے لیے زمین تھی، کچھ معافیاں بھی تھیں، اس لیے آرام سے بسر ہوتی تھی۔ جب حضرت شاہ عبدالہادیؒ نے ہوش سنبھالا تو رواج کے مطابق تعلیم کا آغاز ہوا۔ کبھی ایک معمولی لمحے میں بظاہر کوئی نہایت معمولی واقعہ ایسا ہوتا ہے جس کے نتائج اور اثرات نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں۔ آپ ایک دن مکتب میں تنہا بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ ایک مجذوب صفت درویش اُدھر آنکلے اور انھوں نے کھانے کی کوئی چیز اپنے مُنھ سے نکال کر اصرار کر کے انھیں کھلادی۔ اسی وقت سے طبیعت میں جذب کے آثار پیدا ہو گئے، تعلیم کی طرف رغبت نہیں رہی، دُنیا اور اہلِ دنیا سے بھی وحشت پیدا ہو گئی اور آپ بوا پور کے جنگل میں جا کر رہنے لگے۔ والدین نے کوشش کر کے کھیتی باڑی کے کام میں لگایا تو جتنی پیداوار تھی وہ غریب کسانوں میں تقسیم کر کے آگئے۔ آپ کو خانہ داری کی زندگی میں اُلجھانے کے لیے شادی کر دی گئی۔ ایک صاحبزادے شیخ ظہوراللہ پیدا ہوئے لیکن آپ کی صحرانوردی اور دشت پیمائی بدستور جاری رہی۔ مدّتوں امروہہ کے اطراف میں جنگلوں میں رہ کر عبادت کرتے رہے۔ ایک طویل زمانہ سنبھل کے قریب موضع براہی اور حاذق پور کے جنگل میں بسر کیا۔ برسوں تک صرف جنگلی پھل اور پتّے آپ کی غذا رہے۔ بریلی، پیلی بھیت روڈ پر ایک گاؤں کھائی کھیڑا ہے۔ آخر زمانے میں وہاں مقیم تھے کہ ۴ر رمضان ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۷۷۶ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ وہاں چند روز جسدِ مبارک کو بطور امانت رکھا گیا، پھر آپ کے صاحبزادے شیخ ظہوراللہ وہاں سے تابوت لے کر آئے اور یکم شوال کو امروہہ کے شمال میں ایک نہایت کشادہ اور خوب صورت تعمیر شدہ درگاہ میں دفن کیا گیا۔ یہیں اب ۱۱ر شعبان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ یہ آپ کے سجادہ نشین اوّل اور پوتے حضرت شاہ عبدالباریؒ کی تاریخ وصال ہے۔

جس زمانے میں آپ جنگلوں میں خلوت نشین تھے، ایک مجذوب درویش شاہ یتیم صحرائی سے ملاقات ہوئی اور ان سے بیعت کی۔ ان کا سلسلہ چار واسطوں سے حضرت نظام الدین بلخیؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شاہ یتیمؒ کے انتقال کے بعد آپ نے

حضرت شاہ محمد عضدالدین جعفری علیہ الرحمۃ سے سلوک طے کیا۔ ان کا سلسلہ بھی حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی رح کے واسطے سے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح جذب و سلوک دونوں مرحلوں میں آپ کو چشتی صابری سلسلے کے باکمالوں سے فیض حاصل ہوا۔

آپ کے پیرو مرشد حضرت شاہ عضدالدین متوکل امروہوی رح کا مختصر سا تعارف بھی ضروری ہے۔ آپ کا خاندان ہرگام ضلع سیتاپور اودھ کا تھا۔ یہاں سے آپ کے تایا حضرت شاہ محمدی فیاض رح نے حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی رح کی خدمت میں برسوں حاضر رہ کر منازل سلوک طے کی تھیں اور پھر آگرے کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ بھی آپ کی خانقاہ میں عقیدت سے حاضر ہوتا تھا۔ بعد کو بدخواہوں نے اورنگ زیب کو آپ سے بدگمان کردیا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ یا تو اپنے شیخ کی کتاب تسویہ کے بعض مضامین کو شرعی دلائل سے ثابت کرو، ورنہ اس کتاب کو نذر آتش کرکے ان کی بیعت سے توبہ کرو۔ حضرت شیخ محمدی رح نے جواب دیا کہ میں ابھی ان مضامین کو سمجھنے کے لائق نہیں ہوں، اور کتاب کو جلانا ہی ہے تو فقیر کے جھونپڑے سے زیادہ آگ تو شاہی مطبخ میں ہوگی۔ میں بیعت سے توبہ نہیں کروں گا۔ اورنگ زیب نے ان کو پہلے قلعہ گوالیار میں، پھر اورنگ آباد میں قید رکھا۔ حضرت شاہ محمدی رح کے بھائی شاہ حامد رح ہرگامی بھی ان کے مرید تھے مگر خلافت انھوں نے ان کے بیٹے یعنی اپنے بھتیجے شاہ عضدالدین رح کو عطا فرمائی تھی۔ وہ علوم شریعت کے علاوہ عربی فارسی کا بہت اچھا علم رکھتے تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ کی تصانیف کے علاوہ سنسکرت میں ویدانت وغیرہ کا اور ہندو فلسفے کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ سال تک بھیس بدل کر اودھیا میں رہے اور وہاں کے پنڈتوں سے یہ علم حاصل کیا تھا۔ انھوں نے ایک کتاب مقاصد العارفین تصنیف کی جو فارسی میں وحدت الوجود کے مباحث اور تصوف کے موضوعات پر ایک لاجواب کتاب ہے۔ سنسکرت میں ایک کتاب ستیہ سرور لکھی تھی مگر یہ اب ناپید ہے۔ آپ نے ۱۱۷۲ھ یعنی ۱۷۵۹ء میں انتقال فرمایا اور امروہہ میں مدفون ہیں۔

حضرت شاہ عبدالہادی چشتی علیہ الرحمۃ آپ ہی کے خلیفۂ اول تھے۔ روہیل کھنڈ

میں ان کے مرید بکثرت تھے۔ حاجی رفیع الدین خاں مرادآبادی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، آپ ہی سے بیعت تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ محمد مکمل مرادآبادی، نزہت علی شاہ بریلوی، سیّد نثار علی بخاری بریلوی اور متعدد دوسرے خلفا ہوئے۔ سیّد نثار علی بخاری فارسی کے مسلّم الثبوت انشا پرداز تھے جن کی تصنیف انشائے دل کشا مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ انھوں نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے حالات و ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب مفتاح الخزائن لکھی تھی۔

حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے ایک ہی فرزند تھے جن کے چھ بیٹے ہوئے اور حضرت نے اپنے دو پوتوں کو خلافت عطا فرمائی: ایک حضرت شاہ عبدالباری چشتیؒ (متوفی ۱۲۲۶ھ) اور دوسرے حضرت شاہ محمد دوستؒ جن کا مزار سنبھل کے قریب موضع براہی میں واقع ہے۔

حضرت شاہ عبدالباریؒ کو خلافت حضرت شاہ عضدالدین متوکلؒ کے صاحبزادے حضرت شاہ معزّالدین عرف میاں موجؒ سے بھی حاصل ہوئی اور طریقہ نقشبندیہ میں وہ حضرت میرزا جان جاناںؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ عبدالباریؒ کی خانقاہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ یہاں تربیت سلوک کے علاوہ علوم ظاہر و باطن کے پیاسوں کی سیرابی کا پورا پورا سامان تھا۔ ان کا فیض دور دور تک پہنچا۔ شاہ عبدالرحمٰن موحّد لکھنوی بھی اس خانقاہ میں آکر چھ ماہ تک مقیم رہے۔ بعض تو وہ تھے جنھوں نے پوری زندگی اسی آستانے کے لیے وقف کر دی تھی، ان میں سے ایک شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ تھے۔ ان کے مریدوں کی خاصی تعداد مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ اضلاع میں تھی۔ میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ انھیں سے بیعت تھے۔ شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد میں شامل ہو گئے تھے اور بالاکوٹ کے میدان میں ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں آپ نے شہادت پائی۔ میاں جی نور محمد کے خلفا میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّیؒ علیہ الرحمۃ کی ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی سامراج کے خلاف شاملی کے میدان میں جہاد کیا تھا اور برطانوی غلبہ ہونے کے بعد چھپتے چھپاتے کراچی کے راستے سے مکّہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہیں آپ کا وصال ہوا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّیؒ کے سیکڑوں خلفا اور ہزاروں مریدین تھے جن کا سلسلہ آج ہندستان کے

علاوہ تمام عرب ممالک میں بھی پھیلا ہوا ہے۔

یہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ سلسلے کا مختصر سا تعارف ہے۔ اس سلسلے کے ہزاروں لاکھوں مرید آج بھی دُنیا بھر میں موجود ہیں مگر خود حضرت کی خانقاہ کے آثار اب نہیں رہے۔ اگرچہ انھوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر ذاتی مطالعے سے علومِ شریعت اور فارسی و عربی زبان سے اچھی واقفیت پیدا کرلی تھی۔ علمِ نجوم و ہیئت، طب اور جیوتش سے بھی واقفیت تھی۔ آپ نے موضع اسمولی ضلع مرادآباد کے پنڈت کرپارام کی فرمائش پر فارسی میں ایک کتاب مقصودالطالبین بھی لکھی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستانی جیوتش پر آپ کی گہری نظر تھی۔

آپ کے مریدوں میں اس علاقے کے ہندوؤں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی اور عقیدت مند ہندوؤں کا حلقہ تو بہت ہی وسیع تھا۔ کرپارام اسمولی بھی آپ کے مرید بتائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی میں گیت اور دوہے بھی کہتے تھے چنانچہ مفتاح الخزائن میں آپ کے متعدّد دوہے نقل ہوئے ہیں۔

آپ اوراد و اعمال میں بھی ہندی کے الفاظ یا دوہے تجویز کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار سُوکھا پڑا، خلقِ خدا پریشان تھی، آپ سے دعا کی درخواست کی گئی۔ آپ نے چند دوہے لکھ کر چھوٹے بچّوں کو دے دیے اور فرمایا کہ خوب چیخ چیخ کر گاؤ۔ کہتے ہیں کہ اسی دن خوب زوردار پانی برسا۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ سے آپ کے گہرے دوستانہ تعلّقات تھے چنانچہ مرزا صاحب دو بار موضع براہی میں آپ سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور کئی بار امروہہ بھی جانا ہوا۔

شاہ عالم ثانی بھی آپ سے عقیدت رکھتا تھا اور دُعا کے لیے آپ سے درخواست کیا کرتا تھا۔ اس سے آپ کی خط و کتابت بھی ہوئی جس کا کچھ نمونہ مفتاح الخزائن میں محفوظ ہے۔ ایک خط میں آپ نے بادشاہ کو لکھا ہے کہ اگر میری نصیحتوں پر عمل کروگے تو معاملات سُلجھ جائیں گے اور سلطنت میں استحکام پیدا ہوگا اور حال و مآل درست ہو جائیں گے۔ اگر غفلت برتو گے

تو اس سے بھی زیادہ تباہی اور پریشانی آنے والی ہے۔ حافظ رحمت خاں کا خاندان پیلی بھیت، بسولی وغیرہ میں نواب دونڈے خاں، نواب فتح خاں وغیرہ رامپور میں افغان اُمرا اور سہارنپور، نجیب آباد وغیرہ میں نجیب الدولہ کے خاندان والے آپ سے عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ کے سلسلۂ تصوّف کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ مجذوب سالک تھے جو اس راہ میں سب سے اعلا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی نسبت چشتیہ کے تمام واسطے بہت اعلا اور عظیم الشان ہیں۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت شاہ عضد الدینؒ کی نانیہال میں شطّاری نسبت تھی اور شیخ محمد غوث گوالیاری نے ہندستانی یوگ اور فلسفے سے استفادہ کر کے ریاضات و مجاہدات کا جو نظام بنایا تھا، اس کا صالح عنصر بھی اس سلسلۂ طریقت نے اخذ کر لیا۔ پھر اس میں حضرت مرزا مظہرؒ کے واسطے سے نقشبندی سلوک کے اجزا بھی شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے علمِ شریعت ہی نہیں اعمال و اشغال بھی سلسلۂ ہادویہ میں پہنچے اور شریعت و طریقت کی ایسی جامعیت پیدا ہو گئی جو برّصغیر کے دوسرے سلاسل میں کم دیکھی جاتی ہے۔

غرض امروہہ بھی بدایوں کی طرح مدینۃ الاولیا ہے۔ ہر سلسلے کے باکمال اولیاء اللہ اس سرزمین میں موجود ہیں۔ خاندانِ چشتیہ کے بزرگوں میں حضرت شاہ عضد الدین متوکّلؒ کا آستانہ اور ان کے خلیفہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے آج بھی انوار و برکات اسی طرح عام ہیں اور خلقِ خدا ان آستانوں پر عقیدت سے حاضر ہوتی ہے۔

[ اردو سروس آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر ]

# مطالعۂ تصوّف کے ہندوستانی فارسی ماخذ

## (قبل از عہدِ مغول)

روحانی تجربہ جسے Mystic Experience بھی کہا جاتا ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں، کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، لیکن جب ہم مسلمانوں کے روحانی تجربات و واردات کے لیے لفظ "تصوّف" استعمال کریں تو اس لفظ کے امتیازات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ تصوّف Mysticism نہیں ہے، کیوں کہ یہ کسی مخفی (روحانی) تجربے سے زیادہ ایک اخلاقی رویّہ ہے، یا آپ اسے تعمیرِ سیرت کا ایک نظام کہہ سکتے ہیں۔ اسی لیے تصوّف کی بہت سی تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اَلتَّصَوُّفُ کُلُّہٗ اَدَبٌ۔ تہذیبِ اخلاق کا تعلق یا کسب و مجاہدہ سے ہے یا تاثیرِ صحبت سے، اور تصوّف کا نظامِ تربیت انھیں دو بنیادوں پر قائم ہے۔ صوفیا اسے "طریقت" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا مرتبہ شریعت سے بلند تر بتاتے ہیں۔ انھوں نے یہ درجہ بندی اس طرح کی ہے کہ پہلا مقام شریعت ہے، دوسرا طریقت اور تیسرا حقیقت۔ شریعت سے حقیقت تک جو سفر ہے وہ سلوک کہلاتا ہے۔ اس میں شریعت کی بالادستی کہیں ختم نہیں ہوتی، چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسی متعدّد مثالیں مل جاتی ہیں کہ جہاں علمائے ظاہر نے یہ محسوس کیا کہ شریعت کی بالادستی کو نظر انداز کیا گیا ہے، وہاں انھوں نے صوفیا کو حدّ و تعزیر سے بھی معاف نہیں رکھا

ہے۔ حسین بن منصور حلاج (ف ۳۱۰ھ)، عین القضاۃ ہمدانی (ف ۵۳۳ھ) مسعود بک[۱] یا سرمد کے معاملے میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ صوفیا نے بھی یہ جرأت نہیں کی کہ وہ قانونِ شریعت کی بالادستی کو چیلنج کریں یا اُن سے اپنی بے نیازی کا اظہار کریں۔ ابتدائی دور سے لے کر تقریباً آٹھویں صدی ہجری تک جو کتابیں عربی یا فارسی میں تصوّف کے فنّی اور نظری مباحث پر لکھی گئی ہیں، اُن میں زیادہ تر اعتذار کا رنگ ملتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش نظر آتی ہے کہ نہ صرف تصوّف میں قانونِ شریعت اور روحِ اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں ہے بلکہ خود تصوّف ہی "روحِ اسلام" ہے۔ رہا یہ سوال کہ طریقت اور حقیقت کا مرتبہ شریعت سے بلند کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کی تشریح صوفیا یوں کرتے ہیں کہ جب کوئی مقامِ حقیقت سے گرے گا تو مقامِ طریقت میں آپڑے گا اور مقامِ طریقت سے ساقط ہوگا تو مقامِ شریعت میں رہے گا، لیکن شریعت سے گر گیا تو اُس کا تصوّف کیا اسلام سے ہی کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے ہمیں تصوّف پر گفتگو کرتے ہوئے اسلامی تصوف کے صرف وہ علمی اور عملی معیار سامنے رکھنے چاہئیں جو محقّقین صوفیا نے قائم کر دیے ہیں۔ اس دنیا میں عام طور پر کیا ہو رہا ہے اور ہماری نظروں کے سامنے کیسے نمونے آتے رہتے ہیں، اسے مطالعۂ تصوّف کا علمی معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو یا نظریہ، وہ کتابوں میں کچھ ہوتا ہے اور عمل میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ قول اور عمل کے اسی تضاد سے انسان آج تک چھٹکارا نہیں پاسکا ہے، اور تصوّف دراصل ظاہر و باطن کے اسی تضاد کو ختم کرنے کا نام تھا جسے ہم صرف Mysticism یا باطنیت کہہ کر گذر جاتے ہیں۔ عوام پر قیاس کر کے اگر حکم لگایا جائے تو تصوّف کیا معنی خود اسلام ہی کی جو شکل سامنے آئے گی وہ کچھ دل پذیر اور پُر تاثیر نہیں ہوسکتی۔

مشائخ صوفیا کا اصرار یہ ہے کہ تصوّف "اسلام کی روح" ہے۔ یہی وہ منتہیٰ ہے جہاں قوانینِ شریعت ہمیں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہی عبادات کا مغز ہے، یہی معاملات کا مقصود اور مجاہدات کا

---

[۱] مولف گلزارِ ابرار (اُردو ۴۹۲) نے مسعود بک کو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے اجازت یافتہ بتایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ شیخ شہاب الدین امام کے فرزند شیخ رکن الدین سے بیعت رکھتے تھے۔ لطائف اشرفی (۳۶۶/۱) میں ہے کہ انھیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے خلافت ملی تھی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ (اخبار الاخیار ۱۹۴۰ء) ان کی تصنیف مرآۃ العارفین صرف ایک بار چھپی ہے۔ اب ان کا دیوان بھی مل گیا ہے۔

ثمرہ ہے۔ یہی وہ "نور" ہے جس کی طرف قرآن و حدیث کے ذریعے ہماری رہنمائی کی گئی ہے۔ تصوّف نہ ہم سے کچھ لیتا ہے نہ ہمیں کچھ دیتا ہے، یہ صرف ایک طرزِ زندگی اور ایک زاویۂ نگاہ ہے اور بے حاصلی کے سوا کچھ اس کا حاصل نہیں ہے، جسے فارسی شاعر یوں کہتا ہے:

اوّلِ ما آخرِ ہر منتہی　　　آخرِ ما جیبِ تمنّا تہی

اور داغ دہلوی نے یوں کہا ہے:

دلِ بے مدّعا دیا تو نے　　　لاکھ دینے کا ایک دینا ہے

اس بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ مطالعۂ تصوّفِ اسلامی کا سب سے بڑا ماخذ خود قرآنِ کریم ہے۔ قرآن میں صوفیا کی مخصوص اصطلاحیں کہیں استعمال نہیں ہوئی ہیں، لیکن سلوک و طریقت کے جتنے اہم اور بنیادی اصول صوفیا نے بتائے ہیں اُن سب کی سند وہ قرآن سے دیتے ہیں۔ اگرچہ علمائے ظاہر یا وہ لوگ جو تصوّف کے مخالف ہیں صوفیا کی تفسیر قرآن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اسے "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں جسے متعصّب طبقہ ہمیشہ شکوک و شبہات کی نظروں سے دیکھتا رہا ہے، لیکن صوفیا نے آیاتِ قرآنی سے اصولِ تصوّف کا جس طرح استخراج کیا ہے اُسے آنکھ بند کرکے ردّ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی (ف ۶۳۲ھ) نے لکھا ہے[1] کہ ارادت کا مقصد "طلبِ وجہِ ربّ" ہے کیوں کہ "وجہِ ربّ" ہی باقی رہ جانے والا ہے اور سب کچھ فانی ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔[2] اور وجہ رب کی طلب رکھنے والوں کی تربیت کرنا قرآن سے ثابت ہے: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔[3]

اسی طرح خانقاہ میں رہ کر کسی شیخ سے تعلیمِ سلوک حاصل کرنے کی سند قرآنی آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ سے دی گئی ہے۔ سلوک میں مجاہدات تجویز کیے جاتے ہیں۔ ان مجاہدوں میں کچھ غلو بھی کیا گیا ہے اور سنٹرل ایشیا میں اس پر بدھ مت

---

[1] وصایا شیخ شہاب الدین سہروردی (مرتبہ: مولانا نسیم احمد فریدی)، لکھنو ۱۹۷۶ء، ص ۱۹

[2] سورۂ رحمٰن، آیت ۱۲۷ [3] سورۂ کہف، آیت ۲۸

کا اثر بھی ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت اسلام میں نہیں ہے۔ مگر ترکِ دُنیا کا مفہوم بھی ناسمجھ لوگوں نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ صوفیا نے جس ترکِ دنیا کی تعلیم دی ہے وہ ایک مثبت رویّہ ہے، کوئی منفی طریقہ نہیں ہے۔ حضرت نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی رح (ف ۷۵۷ھ) نے فرمایا کہ طلبِ حق کے لیے مجاہدہ اس آیت کی رُو سے شرط ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1] "جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کریں گے ہم انھیں اپنے راستے دکھادیں گے" یہ منطق کے مسلمات میں سے ہے کہ شرط اور جزا لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدایت بے مجاہدہ نہیں مل سکتی۔ حضرت چراغ دہلی رح[2] نے اس نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی کہ یہاں سُبُلَنَا بصیغۂ جمع آیا ہے یعنی ہمارے راستے۔ سَبِيْلَنَا (ہمارا راستہ) نہیں کہا گیا ہے۔ اس سے صوفیا کے مشرب کی وسعت کا جواز پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح صوفیا کا نظریۂ عشق آیت يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ[3] سے ثابت کیا جاتا ہے۔

قرآن میں تصوّف کے موضوع پر کیا کچھ ملتا ہے، اس بارے میں اصولِ تصوّف کی کتابوں میں بہت سا مواد بکھرا ہوا ہے۔ ہمارے دَور میں ڈاکٹر میر ولی الدین کی کتاب "قرآن اور تصوّف" میں بھی کچھ احاطہ کیا گیا ہے۔ یہی کتاب انگریزی میں Qur'anic Sufism کے نام سے موجود ہے۔[4]

تصوّف کا دوسرا بنیادی ماخذ احادیثِ رسول ہیں۔ احادیث کے مجموعے اپنے پایۂ استناد کے اعتبار سے مختلف مدارج کے ہیں لیکن جن چھ کتابوں کو "صحاح ستّہ" کہا جاتا ہے اُن میں بھی اخلاق و معاملات کے مختلف عنوانوں کے تحت ایسی بہت سی احادیث موجود ہیں جن سے سلوک و طریقت کے اصول و قوانین کی سندیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اسلام کی ابتدائی تین چار صدیوں میں تصوّف کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں اُن کی بُنیاد انھیں دو ماخذوں پر رہی ہے یعنی کتاب اور سنّت۔

یہاں اس تمہید کی ضرورت اس لیے تھی کہ جب ہم اسلامی تصوّف کا علمی اور تحقیقی

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹ [2] خیر المجالس، ص ۱۲۸ [3] سورۂ مائدہ، آیت ۵۴

[4] شائع کردہ موتی لال بنارسی داس، دہلی ۱۹۷۷ء (بار دوم)

مطالعہ کریں گے تو اُس کے اوّلین مصادر یہی ہیں۔ ان کے سوا جن مآخذ سے استفادہ کیا جائے گا اُن کی حیثیت ثانوی ہوگی اور اگر اُن ماخذوں میں کچھ ایسا مواد موجود ہے جو قرآن اور حدیث سے معارض ہے تو اس کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح تصوّف کے منابع کے بارے میں مستشرقین کے پرانے نظریات کہ وہ شامی رہبانیت سے ماخوذ ہے یا یونان کے فلسفۂ اشراق سے متاثر ہے یا اس پر زرتشتی فکر کے گہرے اثرات ہیں، یا وہ ہندوستانی ویدانت کی توسیع ہے، ان سب پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ علاقائی اثرات سے انکار کرنا ممکن نہیں لیکن اس حد تک خود مستشرقین بھی قائل ہو چکے ہیں کہ تصوف کا ابتدائی ڈھانچا عربی تھا۔

ان دو بنیادی ماخذوں کے بعد ہم اس سلسلے میں قدیم علما، کی اُن تصانیف کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک عربی یا فارسی میں لکھی گئی ہیں —— ان میں ابونصر سرّاج طوسی (ف ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع، ابوبکر کلاباذی (ف ۳۸۰ھ) کی التعرّف لمعرفۃ أھل التصوّف[۱]، ابوطالب مکی (ف ۳۸۶ھ) کی قوت القلوب، عبدالرحمٰن السّلمی (ف ۴۱۲ھ) کی طبقات الصوفیہ، ابونعیم الاصبہانی (ف ۴۳۰ھ) کی حلیۃ الاولیاء، ابوالقاسم القُشیری (ف ۴۶۵ھ) کی رسائل قشیریہ[۲]، امام غزالی[۳] (ف ۵۰۵ھ) کی کیمیائے سعادت،

---

[۱] "التعرف...." کا متن آربری نے ۱۹۳۳ء میں چھاپا تھا، دو سال بعد The Doctrine of the Sufis کے نام سے اسے انگریزی میں ترجمہ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی پریس لندن سے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ آربری نے دعوٰی یہ کیا کہ التعرف کا متن وہ پہلی بار شائع کر رہے ہیں مگر یہ کتاب مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں چھپ چکی تھی۔ ۱۹۷۸ء میں اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن کا کیا ہوا، لاہور سے شائع ہوا ہے۔

[۲] "الرسالۃ القشیریہ" ۴۳۷-۴۳۸ھ کے درمیان تالیف ہوا ہے اور "کشف المحجوب" کی تالیف کے وقت شیخ ہجویری کے پیش نظر رہا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ رچرڈ ہارٹمن (Richard Hartmann) نے کیا تھا۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی وزارت اوقاف اسلام آباد نے اس کا عربی متن حال ہی میں شائع کیا ہے۔

[۳] یہاں "المنقذ من الضلال" کا تذکرہ بھی ضروری ہے، یہ امام غزالی کی خود نوشت ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ منٹگری واٹ (M. Watt) نے The Faith & Practice of Ghazali کے نام سے کیا ہے جو ۱۹۵۳ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔

احیاے علوم الدین، المنقذ من الضلال، شیخ ضیاء الدین نجیب سہروردی (ف ۵۶۳ھ) کی آداب المریدین اوران کے بھتیجے شیخ شہاب الدین سہروردی (ف ۶۳۲ھ) کی عوارف المعارف، پھر دنیاے تصوّف میں عظیم فکری انقلاب برپا کرنے والی شیخ اکبر محی الدین[۱] ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) کی تصانیف فتوحاتِ مکّیہ اور فصوص الحکم جن میں عقیدۂ وحدت الوجود کی فلسفیانہ علمی اور کشفی تشریح کی گئی ہے۔ یہ سب وہ بنیادی ماخذ ہیں جن کے بغیر تصوّف کا علمی مطالعہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ہمیں اس تمہید کو تشنہ چھوڑ کر اپنی گفتگو کو چھٹی صدی ہجری سے شروع کرنا ہوگا۔ یہاں دو باتیں ابتدا ہی میں عرض کردوں۔ مطالعۂ تصوّف کے متعدّد پہلو ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

## (۱) تصوّف کا نظری مطالعہ

جس میں مثلاً یہ بحث ہے کہ تصوّف کیا ہے؟ اس میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے اثرات کہاں تک ہیں؛ فلسفہ اور سماجیات اور نفسیات سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اسی ذیل میں خود تصوّف کی اصطلاحیں بھی زیرِ بحث آجاتی ہیں۔ یہودی، عیسائی، رومی، بدھ، زرتشت اور ہندومت کے اثرات کا سراغ انھیں اصطلاحوں اور ان کی تعبیروں سے لگایا جاسکتا ہے۔

## (۲) تصوّف کا عملی پہلو:

اِس میں اعمال، عبادات، اوراد، اشغال، مجاہدات، ریاضیات وغیرہ زیرِ بحث آئیں گی۔ اس کا بھی ایک حصّہ وہ ہے جو صرف ذاتی تجربے سے تعلق رکھتا ہے اور اس

---

[۱] ہندستان میں شیخ اکبر کی تصانیف آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں پہنچ گئی تھیں۔ پھر ان کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ ان میں میر علی ہمدانی، شرف الدین دہلوی، گیسودراز، مخدوم علی مہائمی کی شرحیں عہدِ مغلیہ سے پہلے کی ہیں۔ ان شرحوں کی ایک اچھی فہرس حکیم عبدالحی راے بریلی کی عربی تالیف "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" میں موجود ہے۔

میں کتابیں ہماری کوئی مدد نہیں کریں گی۔ مثلاً کسی صوفی کو اگر کسی مقام کا "کشف" ہوتا ہے تو وہ ہمیں اس کی خبر دے سکتا ہے تجربہ نہیں کرا سکتا۔ اس کشف کی جو کیفیت اس نے بیان کی ہے اُس کی بازیافت ہمارے لیے صرف اپنے عمل اور مجاہدے سے ہی ممکن ہے، یقینی پھر بھی نہیں ہے۔

## (۳) تاریخ تصوّف

یہ اس مطالعے کا تیسرا پہلو ہے۔ اس کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ ایک "تذکرہ" جس میں صوفیا کے احوال اور اقوال جمع کر دیے جاتے ہیں۔ دوسرا "سیر الاولیا" جس میں ان کی سیرت اور طریقِ تعلیم و تربیت نیز سوانح وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ تیسرا "طبقات الصوفیہ" جس میں طبقات فقہا، محدّثین کے انداز پر صوفیا کے تراجم لکھے گئے ہیں، اسے بھی تذکرہ و سیرت ہی کا ایک حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ چوتھے شعبے میں "ملفوظات" آتے ہیں۔ یہ مشائخ صوفیا کے وہ اقوال و ارشادات ہیں، جنھیں اُن کا کوئی مُرید یا مُسترشد قلم بند کر لیتا ہے۔

بنیادی مآخذ کی اِس درجہ بندی کے بعد ہم مطالعۂ تصوّف کے اُن ہندستانی مصادر کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں گے جو مُغلیہ دَور سے پہلے لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بنیادی نکتہ اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ تاریخِ ادب تصوّف، تاریخِ تصوّف نہیں ہے۔ چناں چہ فارسی، ہندی، پنجابی یا اُردو شعرا کا کلام، دوہے، مثنویاں، یا تصوّف کے رنگ میں رنگے ہوئے اقوال، تمثیلیں وغیرہ مطالعۂ تصوّف کے بنیادی مصادر (Basic Sources) کے ذیل میں نہیں آسکتے۔ مثلاً امیر خسرو کا کلام، جائسی کی تصانیف، یا کبیرؔ کے دوہے تصوّف کے بنیادی مصادر نہیں کہے جا سکتے۔ البتہ فنّی و اصطلاحی مطالعے کے لیے جو Source Material ہمیں دستیاب ہے اُس کی روشنی میں ان کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اسے تصوّف کا اطلاقی ادب Literature of Applied Sufism کہا جائے گا۔

ہندستان میں مطالعۂ تصوّف کا جو کچھ مواد مِلتا ہے اس کا جائزہ لینے سے پہلے ایک مسئلہ اور

واضح ہوجانا چاہیے۔ یہاں ابتدا سے مذہبی زبان عربی، تصنیف و تالیف کی زبان فارسی، عوامی رابطے کی زبان ہندوی اور مقامی تہذیب کی زبان علاقائی رہی ہے، اس لیے تصوّف سے جو کچھ مواد ہمیں دستیاب ہوگا وہ اگر مذہبی اور علمی سطح پر ہے تو عربی یا فارسی میں ہوگا، اس میں عوامی جذبات و افکار کا اظہار ہے تو ہندوی یا علاقائی زبان میں ہوگا۔ شمالی ہندستان میں پنجابی، ہندوی اور اس کی بعض بولیاں مثلاً اودھی، بیسواڑی وغیرہ میں تصوّف کا اطلاقی ادب موجود ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم سب سے پہلے ہندستانی فارسی ماخذ Indo-Persian Sources کی ان چند کتابوں کا ذکر کریں گے جو تصوّف کے نظری مطالعے Theoretical Study of Sufism سے متعلق ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور ذیلی تمہید ہندستان میں تصوّف اور صوفیا کی آمد سے متعلق باقی رہتی ہے۔ ابھی تک یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علی الہجویری پہلے صوفی ہیں جو ہندستان میں تشریف لائے لیکن اس میں بحث کی گنجائش ہے۔ "فوائد الفواد" کی[۱] ایک روایت سے ظاہر ہے کہ اُن کے لاہور تشریف لانے سے پہلے وہاں ایک اور بزرگ شیخ حسین زنجانی موجود تھے۔ لیکن ہمیں سر دست صرف دو باتیں ملحوظ رکھنا ہوں گی: ایک تو یہ کہ مسلمان فاتحوں کے شمالی ہند میں نفوذ کرنے سے پہلے یہاں بدایوں، قنوّج، مُلتان جیسے قدیم شہروں میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں ظاہر ہوچکی تھیں اور مقامی آبادی سے اُن کے فکری و ثقافتی رابطوں کی بنیاد پڑ چکی تھی، دوسرے سِندھ اور پنجاب کے علاقے غزنیں کی حکومت میں شامل ہونے کے ساتھ ہی یہاں صوفیا کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا تھا۔ اُس زمانے کے حکمراں اور فاتحین حصولِ دعا و برکت کے لیے مشائخ کی خانقاہوں میں حاضر ہوتے تھے، مفتوحہ علاقوں میں زمین اور معافیاں دے کر انھیں بساتے تھے اور اکثر حالات میں فوج کے ساتھ انھیں بھی لے کر جاتے تھے، چناں چہ ایک چشتی بزرگ کا محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان آنا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ابتدا میں صوفی سلسلوں کی تنظیم نہیں تھی۔ اس لیے کسی درویش کی خانقاہ اُس کے ساتھ

---

[۱] فوائد الفواد: ص ۵۷ (لاہور ۱۹۶۶ء) اس سلسلے کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو اُردو ترجمہ "کشف المحجوب" (لاہور ۱۹۷۸ء) مقدمہ از حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔

ہی ختم ہو جاتی تھی۔ سلسلے کی باقاعدہ تنظیم اور خلفا و جانشین نامزد کرنے کا طریقہ تقریباً چھٹی صدی ہجری سے ملتا ہے۔ سلسلوں کی تنظیم کے بعد پہلے چشتی اور سہروردی سلسلے ہندستان آئے، پھر نقشبندی آئے۔ یہی تین بڑے سلسلے ہیں۔ دوسرے سلسلے یہاں دیر میں پہنچے اور زیادہ فروغ بھی نہ پاسکے۔ اس لیے ہم اُنھیں نہیں گنا رہے ہیں۔

چشتی اور سہروردی سلسلوں کے بارے میں تاریخی قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون یہاں پہلے پہنچا۔ سہروردی سلسلے کی پہلی خانقاہ مُلتان میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا (۵۶۶- ۶۶۱ھ) نے قائم کی۔ انھوں نے ۶۲۷ھ میں اپنے پیر و مُرشد شیخ شہاب الدین سہروردی (ف: یکم محرّم ۶۳۲ھ) سے اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ چشتی خانقاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (ف: ۶۳۴ھ) نے اجمیر میں قائم کی اور بظاہر اس کو اوّلیت کا شرف بھی حاصل ہے۔ چشتی صوفیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (ف: ۶۳۴ھ)، خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (ف: ۶۶۴ھ)، خواجہ نظام الدین اولیاؒ (ف: ۷۲۵ھ)، خواجہ علاء الدین علی احمد صابرؒ وغیرہ بزرگوں نے "فنِ تصوّف" پر کتابیں نہیں لکھیں بلکہ انھوں نے نظری مباحث سے زیادہ اس کے عملی پہلو پر زور دیا اور خانقاہی تربیت کو اصلِ اُصول سمجھا۔ اس کے برعکس سہروردی بزرگوں نے ابتدا ہی سے تصنیف و تالیف سے شغل رکھا۔ شیخ ضیاء الدین نجیب سہروردی (۴۹۰-۵۶۳ھ) کی کتاب "آداب المریدین" اور اُن کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۳۹-۶۳۲ھ) کی تالیف "عوارف المعارف" خود چشتی خانقاہوں میں بھی ایک نصابی کتاب کی طرح پڑھائی جاتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بھی اپنے پیر و مرشد سے "عوارف المعارف" کے چند ابواب کا باقاعدہ درس لیا تھا۔

تصوّف کے نظری پہلو پر ہمیں ہندستان میں لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب شیخ علی بن عثمان الہجویری کی "کشف المحجوب" ملتی ہے۔ یہ ہندستان، ایران، روس، پاکستان اور یورپ میں کم سے کم گیارہ بار چھپی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا تھا[1] اردو میں اس کے

---

[1] یہ "گب میموریل سیریز" میں ۱۹۱۱ء میں چھپا تھا اور اب تک اس کے چار اڈیشن نکل چکے ہیں۔

بلیس سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک بہت اچھا ترجمہ مولانا ابوالحسنات قادری کا کیا ہوا ۱۹۷۸ء میں لاہور سے چھپا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "کشف المحجوب" اسلامی تصوّف کی اُمّہات کُتب میں سے ہے، اس سے ہر زمانے میں علمائے تصوّف نے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ہمیں شیخ فریدالدین عطّار کی "تذکرۃ الاولیا"، مولانا جامی کی "نفحات الانس"، شیخ یحییٰ مُنیری کے "مکتوبات"، سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کے ملفوظات "لطائف اشرفی" اور حضرت گیسودراز کی تصانیف میں "کشف المحجوب" کے حوالے ملتے ہیں ـــــ اس کتاب کی تالیف میں شیخ ہجویری نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا ان میں ابوعبدالرحمٰن السّلمی کی "طبقات الصّوفیہ" اور "تاریخ اہل صفّہ" کے علاوہ "رسائل قشیری"، "کتاب ا     " اور "کتاب اللّمع" وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ ہجویری صاحبِ سلسلہ بزرگ نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو پہلے صاحبِ سلسلہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں اور سہروردی بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا مُلتانی ہیں مگر ان دونوں بزرگوں کی کوئی تصنیف ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ شیخ زکریا کے اعمال و اوراد کا ایک مجموعہ "کتاب الاوراد[1]" حال ہی میں پاکستان سے چھپ گیا ہے مگر یہ نظری تصوّف کی نہیں اعمال و اشغال کی کتاب ہے۔

سہروردی مشائخ میں قاضی حمیدالدین سہروردی ناگوری (ف: ۱۱ر رمضان ۶۴۳ھ[2]) پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے تصوّف کے موضوع پر متعدد رسائل لکھے، اُن میں "عشیقہ" یا "عشقیہ" چھپا بھی ہے۔ اس کے علاوہ "لوامع" اور "طوالع الشموس" ان کی دو کتابیں ہیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت بابا فرید گنج شکر کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ علوم معقول و منقول کے جامع تھے، ان کا فارسی اور عربی، ہندی اور پنجابی میں شعر کہنا ثابت ہے۔ بابا فرید کا جو پنجابی کلام "گرنتھ صاحب" میں شامل ہے وہ مسلمانوں کے قدیم مآخذ میں نہیں ملتا، لیکن یہ سینہ بہ سینہ حضرت بابا نانک کو پہنچا تھا اور اُسی کو گرو ارجن دیو نے "گرنتھ صاحب" میں

---

[1] الاوراد: بتصحیح محمد میاں صدّیقی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۷۸ء۔

[2] لطائف اشرفی (قلمی): ورق ۱۹۵ ب میں ۱۱ر رمضان ۶۴۱ھ اور مرآۃ الاسرار (قلمی)، جلد دوم ورق ۱۶ ب میں ۵ر رمضان ۶۴۳ھ درج ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ قاضی ناگوری کا انتقال قطب صاحب سے دس سال بعد ہوا تھا۔

شامل کیا ہے۔ اس پنجابی کلام کے بارے میں اس وقت بہت تفصیل سے گفتگو نہیں ہو سکتی لیکن مختصراً میرا خیال یہ ہے کہ یہ حضرت بابا فریدؒ کی تصنیف ہو سکتا ہے، اس کی ایک شہادت تو یہ ہے کہ اس کا انتساب کسی دوسری شخصیت سے نہیں ملتا، دوسری داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں مسلّماتِ صوفیا اور اصولِ تصوّف کے خلاف کچھ نہیں ہے، نہ کوئی ایسا خیال ہے جسے حضرت بابا فریدؒ سے منسوب کرنے میں تامّل ہو۔ رہا یہ کہ مسلمانوں کے مصادر میں یہ کلام کیوں نہیں ملتا، تو ضروری نہیں کہ مصادرِ تصوّف میں ہر چیز مل ہی جائے، دوسرے سب مصادر بھی کہاں ملتے ہیں، تیسرے بعض قدیم کتابوں مثلاً "شمائل الاتقیا"، "سیر الاولیا" اور "جواہر فریدی" وغیرہ میں جُزوی طور پر ہندی اور پنجابی کلام آیا بھی ہے۔ یہ پنجابی کلام پنجاب کے عوام کی اخلاقی اور رُوحانی تربیت کے لیے تھا اور حقائق تصوّف کو اُن کی سطحِ ادراک کے مطابق سمجھانا مقصود تھا، اس لیے یہ عوام تک ہی محدود رہا۔ بابا فرید ہندی اور پنجابی دونوں زبانوں میں گفتگو کرتے تھے اور ان میں شعر بھی کہتے تھے، اس کا سب سے قدیم حوالہ "شمائل الاتقیا" میں ہے۔ "سیر الاولیا" میں اُن کے ہندوی فقرے بھی نقل ہوئے ہیں[1]، وہ جملہ: "پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے" اکثر نقل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شیخ علی احمد صابر کو رُخصت کرتے ہوئے فرمایا تھا: "صابر بھوگ کروگے۔" اُن کی پنجابی کا ایک فقرہ "عیسی منجی نہ بھے"[2] سیر الاولیا میں موجود ہے۔ ہندی میں ان کے دوہے کی ایک پنکتی "شمائل الاتقیا" میں آئی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے بزرگ شیخ برہان الدین غریب کی فرمایش پر اور اُن کی نگرانی میں لکھی گئی ہے۔ جنھوں نے حضرت بابا فرید کا زمانہ پایا تھا اور ان کے بہت سے مریدوں کو دیکھا تھا۔ وہ پنکتی یہ ہے:

"جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سووے داس"

سیر الاولیا میں ایک ہندی دوہا یوں لکھا ہے[3]:

کنت نہو ہتین کار ری ناکاں ہت مناے
بس کنڈلے مدھن گر ہو ریس لہد لہاہ

---

[1] سیر الاولیا (دہلی ۱۸۸۴ء) : ص ۳۶۷ [2] ایضاً: ص ۱۸۳ [3] ایضاً۔

تیسری اور بہت ہی اہم شہادت یہ ہے کہ حضرت بابا فرید پنجابی زبان میں ذکر کرتے تھے۔ کسی دوسرے صوفی کے بارے میں ایسی روایت نہیں ملتی جس سے مقامی زبان میں اُس کا ذکر و شغل کرنا ثابت ہوتا ہو، اسی لیے حضرت گیسو دراز (ف: ۸۲۵ھ) نے اپنے "یازدہ رسائل" میں اسے "ذکر خاصۂ حضرت شیخ فرید گنج شکر" لکھا ہے۔ یہ پنج ضربی ہے:

۱. ایہہ ول توں
۲. اوہ ول توں
۳. اِتھے توں
۴. اُتھے توں
۵. توں ہی توں۔

یہی ذکر چہار ضربی اور سہ ضربی ارکان کے ساتھ بعد کے زمانے کے چشتی ملفوظات میں آتا ہے۔ مثلاً شیخ محمد چشتی اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی تصانیف میں آیا ہے۔

"جواہر فریدی"۔ جو علی اصغر فریدی بن شیخ مودود بن شیخ محمد چشتی بہدالوی نے عہدِ جہانگیری میں تالیف کی تھی، اُس میں حضرت بابا فرید کا یہ پنجابی دوہا موجود ہے:

فریدا دھڑ سولی، سر پنجرے تلیا تو کنڈ کاگ
ربّ اجیوں بناھڑے سو دھن ساڈے بھاگ[۱]

"گرنتھ صاحب" میں اس دوہے کی یہ شکل ملتی ہے:

فریدا تن سُکّا پنجر تھیا تلیاں کھونڈے کاگ
اجے سواب نہ باہوڑیہو دیکھ بندے کے بھاگ

مجھ سے پروفیسر گوربچن سنگھ طالب نے کہا تھا کہ "جواہر فریدی" کی روایت پنجابی کے مُلتانی لہجے سے زیادہ قریب ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا نے بھی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی مگر انھوں نے اجودھن

---

[۱] جواہر فریدی (قلمی)۔

میں اپنے پیر و مرشد کی زبانِ مبارک سے جو کلمات سُنے تھے انھیں ایک بیاض میں لکھ لیا تھا اور یہ بیاض شوّال ۸۰۷ھ تک اُن کے پاس موجود تھی۔[۱] اسی طرح انھوں نے ایک مجذوب کی باتیں بھی اپنی بیاض میں لکھی تھیں۔[۲] حضرت بدرالدین اسحٰق دہلوی سے جو مجموعہ "اسرارالاولیا" باباصاحب کے ملفوظات کا منسوب ہے، اُس کا مستند ہونا متحقّق نہیں۔ حضرت بابا فرید کے ایک ملفوظ "اسرار المتحیرین" کا حوالہ "شمائل الاتقیا" کے نسخوں میں بھی ملتا ہے مگر یہ کتاب ناپید ہو چکی ہے۔ دوسرا ایک مختصر رسالہ "گفتار گنج شکر" کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ملتا ہے (نمبر ۴۴۴ تصوّف فارسی) لیکن اس کا پایۂ استناد ابھی ثابت ہونا باقی ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں ایک رسالہ "خلاصۃ العارفین" ۱۲۳۴ھ کا مکتوبہ ہے جس میں حضرت بہاء الدین زکریا مُلتانی کے ملفوظات بروایت حضرت جلال الدین بخاریؒ درج ہیں۔ انھوں نے چالیس سال تک حضرت زکریا مُلتانی کی خدمت کی تھی اور یہ حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کے والدِ بزرگوار ہیں۔

تصوّف کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر سب سے زیادہ تصانیف حضرت سیّد محمد حسینی گیسودراز (ف ۸۲۵ھ) کی ہیں۔ انھوں نے عربی میں "عوارف المعارف" کی ایک ضخیم شرح بھی لکھی تھی جس کا مخطوطہ ٹونک میں موجود ہے۔ اسی طرح "شرح آداب المریدین" پہلے گلبرگہ، پھر لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتابوں میں "جواہر العشّاق"[۳]، "یازدہ رسائل"، "حظائر القدس" وغیرہ ہیں۔ حضرت گیسودراز کی تصانیف اُن کی عمر کے برابر یعنی ایک سو ایک بیان کی جاتی ہیں جن میں سے اب تک ۳۷ دریافت ہو کر چھپ چکی ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا (ف: ۷۲۵ھ) کی شخصیت میں علم، عقل اور عشق کے امتزاج کا بہترین اظہار ہوا ہے، وہ سلسلۂ صوفیا کی ایک ایسی شاندار کڑی ہیں جن کی ذات میں تصوّف کے عملی اور علمی دونوں پہلوؤں کا نہایت تابناک ظہور ہے۔ ان کے ملفوظات کے متعدّد مجموعے مرتّب کیے گئے لیکن سب سے زیادہ قبولیت "فوائد الفواد" کو نصیب ہوئی، اس میں حضرت نظام الدین کی

---

[۱] فوائد الفواد (لاہور، ۱۹۶۶ء): ص ۵۰ [۲] ایضاً: ص ۲۴۳۔

[۳] ۶۵ مقولات پر مشتمل یہ کتاب ۱۳۷۲ھ میں کُتب خانہ روضتین گلبرگہ سے حافظ محمد عطا حسین نے چھاپی تھی اور اب ۱۹۷۸ء میں لاہور سے دوبارہ چھپی ہے۔

۱۸۸ مجلسوں میں ہونے والی گفتگو زیادہ تر انھیں کے الفاظ میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس کے مرتّب فارسی کے مشہور شاعر امیر حسن علا، سجزی دہلوی ہیں جنھوں نے ۲۹ صفر ۷۳۷ھ کو دولت آباد میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔ "فوائد الفواد" کو انھوں نے پانچ جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جلد کی پہلی مجلس ۳ شعبان ۷۰۷ھ کی ہے اور پانچویں جلد کی آخری مجلس ۲۰ رمضان ۷۲۲ھ کی یعنی حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال سے دو سال اور سات ماہ قبل تک یہ ملفوظات لکھے گئے ہیں۔ اس طرح جمع و ترتیب کی کُل مدّت پندرہ سال ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجالس کی یہ تعداد ۱۸۸ سے بہت زیادہ رہی ہوگی۔ امیر حسن دہلوی نے بعد کو ان میں سے انتخاب کیا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے مگر مجھے بعض قدیم کتابوں میں "فوائد الفواد" کے ایسے حوالے بھی ملے ہیں جو متداول نسخوں میں نہیں ملتے۔ اس کتاب کے وہ ابتدائی مسوّدات جن پر حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے قلم سے ترمیم و اصلاح کی تھی، امیر حسن دہلوی نے ایک قبر میں دفن کرا دیے تھے جس کے متّصل بعد میں خود ان کا مزار بنایا گیا۔ "فوائد الفواد" میں ۲۷ دوسری کتابوں کا حوالہ آیا ہے۔ تصوّف کے جن موضوعات پر ان مجلسوں میں گفتگو ہوئی ہے ان کا اندازہ اِن چند عنوانات سے کیا جا سکتا ہے:

نگاہداشت ادب پیر۔ سخن در تزکیہ۔ درجدّ و اجتہاد۔ در طاعتِ مشائخ۔ در ترک و تجرید در اصلِ سلوک، تحقیقِ ترکِ دنیا۔ در آدابِ تصوّف۔ اشاراتِ مشائخ و اصطلاحاتِ ایشاں در اثرِ صحبت۔ مرتبۂ اصحاب صحو در قبولِ نفس۔ سخن در ولایت۔ سخن در سلوک۔ سخن در خطرہ و عزیمت و فعل۔ سخن در بخشش پیر و قابلیتِ مرید۔ سخن در معاملاتِ فقرا۔ سخن در ترکِ مخالطتِ خلق۔ سخن در صبر و رضا۔ در باب قبول کردن فتوح۔ در مکارم اخلاقِ درویشان۔ وغیرہ۔

"فوائد الفواد" کے ۵-۶ قلمی نسخے میرے علم میں ہیں، ان میں سے کوئی بھی عہدِ محمد شاہ سے آگے کا نہیں ہے۔ یہ کتاب دو تین بار چھپی ہے اور سب سے اچھا اڈیشن وہ ہے جسے محمد لطیف مُلک نے ترتیب دیا ہے اور محکمۂ اوقاف پاکستان نے ۱۹۶۶ء میں چھاپا ہے۔ اس کا متن اغلاط سے پاک ہے اور متعدّد بار اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ میں اس میں ۱۵-۲۰ غلطیوں کی گرفت کر سکا ہوں۔

امیر حسن دہلوی کی ایک اور مختصر تصنیف عشق کے موضوع پر "مخ المعانی" کے نام سے ہے۔

اس کا اب تک ایک ہی قلمی نسخہ ملا ہے اور وہ علی گڑھ میں موجود ہے۔ یہ ۱۲۹۷ھ میں کوہ آبو راجپوتانہ میں نقل کیا گیا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ "دُرَرِ نظامی" ہے جسے علی بن محمود جاندار نے ترتیب دیا تھا۔ اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے اور آج تک نہیں چھپا ہے۔ اردو ترجمہ یٰسین علی نظامی نے کسی زمانے میں کیا تھا۔ وہ چھپ گیا ہے۔ "دُرَرِ نظامی" میں جو مواد ہے وہ بیشتر "فوائد الفواد" میں بھی ملتا ہے، صرف بعض اشارے نئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۷۵۰ھ کے بعد مرتّب ہوئی ہوگی۔ علی بن محمود جاندار نے اسے ۳۱ ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

توحید اور معرفت۔ اخلاص۔ توبہ۔ محبّت اور عشق۔ بیعت اور اصل خرقہ۔ مراقبہ اور مشغولی باطن۔ ترکِ دُنیا۔ زُہد اور قناعت۔ عزلت اور گوشہ نشینی۔ سماع۔ وغیرہ۔

علی بن محمود ہی نے ایک عربی کتاب "خلاصۃ اللطائف" بھی لکھی تھی۔ اس میں بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حالات و ملفوظات اور تصوّف کے مختلف موضوعات پر آپ کے اقوال و ارشادات تھے۔ یہ کتاب اب نہیں ملتی مگر اس کا ایک اقتباس امیر خورد کرمانی کی "سیر الاولیا" میں آ گیا ہے اور وہیں سے شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (ف ۱۰۵۲ھ) نے "اخبار الاخیار" میں نقل کیا ہے۔ اس ایک اقتباس سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں کتنا مفید اور معلومات آفریں مواد رہا ہوگا۔

ایک اور مجموعہ ملفوظات "انوار المجالس" خواجہ سیّد محمد امام کا مرتّب کیا ہوا تھا۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مُنہ بولے بیٹے اور حضرت سیّد بدر الدین اسحٰق داماد و خلیفہ حضرت بابا فریدؒ کے فرزند تھے۔ خانقاہ میں نماز کی امامت کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کے حوالے بھی "سیر الاولیا" میں آتے ہیں مگر یہ خود ناپید ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب عہدِ محمد شاہ تک موجود تھی کیوں کہ اس سے ماخوذ بعض عبارتیں ایک قلمی کتاب "اخبار الجمال" میں ملتی ہیں جو شاہ جمال کولوی اور ان کے خاندان کے حالات میں ہے اور عہدِ محمد شاہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کا ایک مخطوطہ علی گڑھ میں اور دوسرا امروہہ کے ایک ذاتی ذخیرے میں ہے۔ یہی حال دوسرے مجموعۂ ملفوظات "مجموع الفوائد" کا بھی ہے جسے

عبدالعزیز بن ابی بکر مصلّی بردار نے فراہم کیا تھا۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قرابت دار بھی تھے۔ "مجموع الفوائد" کے اقتباسات بھی "اخبار الجمال" میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی عہد محمد شاہی میں ضائع ہوئی ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سینیئر مریدوں میں حضرت خواجہ بُرہان الدین غریبؒ (ف ۷۳۸ھ) تھے۔ ان کا وطن ہانسی تھا۔ یہ حضرت کی خانقاہ میں رہتے تھے اور لنگر خانے کے نگراں تھے۔ آخری زمانے میں جب حضرت نظام الدین نے بعض ممتاز مریدوں کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا تو انھیں بھی خلافت عطا ہوئی تھی۔ عہدِ محمد شاہ تغلق میں جس وقت دارالخلافت دہلی سے دولت آباد کو منتقل ہوا، یا عام انتقال آبادی سے چندے قبل، حضرت برہان الدین غریب بھی وہاں ہجرت کر گئے تھے۔ انھیں بادشاہ نے دولت آباد میں خانقاہ تعمیر کرنے کے لیے زمین اور روپیہ بھی دیا تھا۔ حضرت برہان الدین غریبؒ اپنے ساتھ تصوّف کی منتخب کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی لے گئے تھے۔ ان کے مریدوں میں رکن الدین دبیر کاشانی، خواجہ عمّاد کاشانی، خواجہ حمّاد کاشانی، مجدّ الدین کاشانی اور زین الدین شیرازی دولت آبادی (ف ۷۷۱ھ) بڑے عالم فاضل اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والے بزرگ تھے۔ رکن الدین دبیر نے حضرت غریب کے ملفوظات پر مشتمل "نفائس الانفاس" مرتّب کی تھی۔ حضرت غریب نے فرمائش کی کہ وہ تصوّف کے بنیادی اصول و مسائل اور طریقت و سلوک کے آداب پر بھی ایک مستند اور جامع کتاب لکھ دیں جس سے تصوّف کا مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی ہو۔ رکن الدین دبیر نے حضرت غریب کی لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے ایک کتاب "شمائل الاتقیا" تالیف کی جس میں مختلف عنوانات کے تحت مستند کتابوں سے اقتباسات ترتیب دے کر تصوّف کے بہت سے موضوعات پر قدما کے مستند اقوال کی روشنی میں قیمتی مواد جمع کر دیا۔ اس کتاب کے آغاز میں انھوں نے اپنے مآخذ و مصادر کی ایک فہرست بھی دی ہے جس میں کتابوں کی تعداد سو سے کچھ زیادہ ہی ہے اور ان میں سے کئی کتابیں قطعاً ناپید ہو چکی ہیں۔ "شمائل الاتقیا" کی بدولت ہمیں ان کے نام اور صرف چند اقتباسات مل جاتے ہیں، چنانچہ اس میں "اسرار المتحیّرین"، "رسالہ غریب"، "رسالہ قوام العقائد"، "رموز الواہلین"، "رسالہ عین القضاۃ ہمدانی"، "سراج العارفین"، "رسالہ شمسیہ" اور "رسالہ زبدۃ الحقائق" کے حوالے کثرت سے موجود ہیں اور

یہ کتابیں اب نہیں ملتیں۔

بعد کے زمانے میں " شمائل الاتقیا" بہت مقبول رہی۔ اِسے خانقاہوں میں ایک نصابی کتاب کی طرح پڑھا جاتا تھا یہاں تک کہ اسے دکنی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ بے پڑھے عوام اس کی فارسی اور عربی عبارتوں سے پورا فائدہ حاصل نہ کر پاتے تھے، چناں چہ میراں محمد یعقوب نے دکنی بولی میں اس کا ترجمہ کر دیا۔ فارسی متن اور دکنی ترجمے کے متعدّد قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ فارسی متن ایک بار حیدرآباد سے چھپا بھی تھا۔ دکنی ترجمہ ۱۹۶۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے "جرنل قدیم اردو" شمارہ دوم میں چھپ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظری تصوّف کے مباحث پر ہندستان میں جو چند بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں "شمائل الاتقیا" ان میں اہم ترین بھی ہے اور قدیم ترین بھی۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ آج بھی اسے تصوّف کی درسی کتاب کے طور پر پڑھا جائے۔

برہان الدین غریب کے ان مریدوں میں خواجہ حمّاد کاشانی نے "منافع المسلمین" "اسرار الطریقۃ" اور "حصول الوصول" لکھیں۔ ان کے بھائی مجدّ الدین کاشانی نے "غرائب الکرامات"، "بقیۃ الغرائب" اور "دیوان عین الحیاۃ" لکھیں۔ تیسرے بھائی رکن الدین دبیر کی تصانیف میں "شمائل الاتقیا" کے علاوہ "رموز الوالہین" اور "نفائس الانفاس" بھی ہیں۔ یہ سب کتابیں بہت کمیاب تقریباً ناپید ہیں مگر میں نے مہاراشٹر میں ایک جگہ ان کے نسخے دیکھے ہیں۔ شیخ زین الدین دولت آبادی (ف ۷۷۱ھ) جن کے قدموں میں اورنگ زیب کو دفن کیا گیا تھا، ۷۳۶ھ میں حضرت غریب سے بیعت ہوئے تھے۔ ان کے ملفوظات "ہدایۃ القلوب" سیّد حسین شیرازی نے جمع کیے، دوسرا مجموعۂ اقوال "دلیل السالکین" ہے۔ ان کی کتابوں میں "جنّۃ القلوب من مقال المجبوب" اور "جنّۃ المجنّۃ" بھی ہیں۔ یہ سب بلند پایہ عالمانہ کتابیں ہیں اور ان میں عہدِ تغلق کی سماجی تاریخ پر بھی مفید اشارے ملتے ہیں۔ حضرت غریب کے ملفوظات کا ایک مجموعہ "احسن الاقوال" خواجہ حمّاد کاشانی نے جمع کیا تھا، یہ بھی نایاب تھا۔ پروفیسر محمد حبیب کے پاس اس کا ایک مخطوطہ تھا۔ اردو ترجمہ مولوی عبد المجید وکیل اورنگ آبادی نے بہت زمانہ ہوا شائع کرایا تھا۔ مجھے "احسن الاقوال" کا ایک اور قلمی نسخہ ملا تو میں نے اس کا تعارف "جرنل آف سکھ اسٹڈیز"

امرتسر میں چھپوایا تھا۔

نظری تصوّف ہی کے موضوع پر عہدِ فیروز شاہ تغلق میں مسعود بک نے کتاب "مرآۃ العارفین" لکھی یہ نظریۂ وحدت الوجود پر ہندستان میں لکھی جانے والی غالباً پہلی کتاب ہے ـــــ علاء الدّولہ سمنانی اور حضرت گیسو دراز نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریے پر کڑی تنقیدیں کی ہیں لیکن "مرآۃ العارفین" پر شیخ اکبر کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ مسعود بک کا دیوانِ فارسی بھی خانقاہوں میں بہت مقبول رہا ہے۔ اب یہ بھی دریافت ہوگیا ہے۔

ہندستان میں تاریخِ تصوّف کے موضوع پر سب سے قدیم اہم اور بنیادی کتاب سیّد محمد بن مبارک بن محمد علوی معروف بہ امیر خورد کرمانی (ف ۷۷۰ھ) کی "سیر الاولیا" ہے۔ تاریخِ تصوّف کے سلسلے میں اگر ہم کسی ایک مصنّف کے احسان مند ہیں تو وہ "سیر الاولیا" کا مولّف ہی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو نہ صرف حضرت نظام الدین اولیا کے سوانح اور ملفوظات کے بہت بڑے خزانے سے ہم محروم رہ جاتے بلکہ ہندستان میں تصوّف اور صوفیا کی تاریخ بھی اس طرح نہیں لکھی جاسکتی تھی۔

آج حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید، شیخ جمال ہانسوی، اور حضرت نظام الدین اولیا کے ممتاز خلفا کے بارے میں قدیم ترین ماخذ "سیر الاولیا" ہی ہے۔ اس میں تصوّف، تاریخِ تصوّف اور ہندستانی معاشرت کی تاریخ کے طالب علم کے لیے جتنا متنوّع، مستند اور مفصّل مواد موجود ہے، اتنا اس عہد کی دوسری کسی ایک کتاب میں نہیں ہے۔ "سیر الاولیا" کے قلمی نسخے بھی کم ملتے ہیں اور قدیم ترین نسخہ بھی عہدِ اکبری سے آگے کا نہیں ہے۔ یورپ کے ذخیروں میں اس کے پانچ نسخے ہیں جن میں قدیم ترین ۱۰۴۰ھ کا ہے۔ ہندستان کی لائبریریوں میں ۱۱-۱۲ سے زیادہ مخطوطات نہیں ہیں۔ ان نسخوں میں بعد کو درگاہی لوگوں اور پیر زادوں نے اپنے مقاصد کے تحت کچھ تحریفیں بھی کر رکھی ہیں لیکن حیرت یا افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس کتاب کی اتنی زبردست اہمیت کے باوجود اس کا کوئی اچھا تحقیقی ایڈیشن آج تک شائع نہ ہوسکا۔ یہ سب سے پہلے ۱۸۶۰ء میں دہلی میں چھپی تھی۔ پھر لالہ چرنجی لال نے مطبع محبِّ ہند

قائم کیا تو از راہِ عقیدت۔ یہی کتاب ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں دوسری بار چھاپی تھی۔ ایک سو سال گزرنے پر بھی کسی نے لالہ چرنجی لال ایڈیشن پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ ابھی ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد سے اسی کا ری پرنٹ چھاپ دیا گیا ہے۔ اسی طرح "سیرالاولیا" کا اردو ترجمہ ۱۹۲۳ء میں لاہور سے چھپا تھا۔ یہ کوئی مستند ترجمہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ گمراہ کُن ہے مگر اسی کو لاہور میں فوٹو آفسٹ سے دوبارہ چھاپ لیا گیا ہے۔

"سیرالاولیا" کے بعد دوسری اہم کتاب "خیرالمجالس" حضرت نصیرالدین محمود اودھی چراغِ دہلی (ف ۷۵۷ھ) کے آخری دو سال کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے کیلو کھڑی دہلی کے باشندے حمید قلندر نے ۱۳ر صفر ۷۵۵ ہجری سے جمع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کا فارسی متن جو بہت قدیم نسخوں پر مبنی نہیں ہے علی گڑھ سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے ۱۳۱۶ھ میں مولوی احمد علی سیماب ٹونکی کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا تھا اور یہی ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ سے دوبارہ چھپا ہے مگر فارسی متن اور اُردو ترجمے میں اتنے زبردست اختلافات ہیں کہ دونوں دو مختلف کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت چراغِ دہلی سے منسوب ایک کتاب بہ عنوان "صحیفہ ہا" عُثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے مگر میں اسے غور سے نہیں دیکھ سکا ہوں۔ شُبہ یہ ہے کہ یہ "صحائف سلوک" کا نسخہ ہوگا جو دراصل حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ میر سید محمد مکیؒ کے خطوط ہیں مگر غلطی سے خود حضرت چراغ دہلی کے نام سے چھپ گئے تھے۔

اب یہاں ملفوظات کے سلسلے کی صرف تین کتابوں کا تذکرہ اور کیا جا سکتا ہے:
پہلی کتاب "سرور الصّدور و نور البدور" ہے۔ یہ شیخ حمیدالدین سوالی ناگوری (وفات ۲۹ر ربیع الآخر ۶۷۳ھ) کے حالات، ملفوظات، مکتوبات وغیرہ کا مجموعہ ہے جسے اُن کے پوتے شیخ فریدالدین بن عبدالعزیز (ف ۷۴۳ھ) نے عہدِ محمد تُغلق میں جمع کیا تھا۔ "شک سپ تتی" کے فارسی ترجمہ "طوطی نامہ" اور تصوف کی بلند پایہ کتاب "سلک السّلوک" کے مصنّف شیخ ضیاء الدین نخشبی انھیں فریدالدین ناگوری کے مرید تھے۔
"سرورالصّدور" میں بھی تصوّف، تاریخِ تصوّف اور سیرِ صوفیہ کے بارے میں بڑا قیمتی

مواد موجود ہے۔ یہ ابھی تک نہیں چھپی ہے۔

اس کے بعض قلمی نسخے یہاں جھنجھنوں اور ناگور میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ علی گڑھ میں اور ایک نیشنل میوزیم کراچی میں بھی ہے۔ شیخ حمیدالدین سوالی ناگوری کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے خلافت و اجازت حاصل تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ فتحِ دہلی کے بعد مسلمانوں کے گھر میں جو پہلا بچّہ پیدا ہوا وہ میں ہُوں۔ اس لحاظ سے ان کی ولادت ۵۸۹ھ یا ۵۹۰ھ میں ہوئی۔ ان کی درگاہ آج بھی ناگور میں موجود ہے۔ شیخ ناگوری تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے اور "سرور الصّدور" سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تصوّف سے متعلق کسی سوال کا جواب لکھنے کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اِن سے لکھنے کو فرمایا کرتے تھے۔ ان کا کوئی ایسا رسالہ "سوال و جواب" حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے پاس تھا جس پر انھوں نے اپنے مُلاحظات بھی لکھ رہے تھے۔ غالباً اسی رسالے کے طویل اقتباسات "اخبار الاخیار" میں درج ہوئے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا نے شیخ ناگوری کے رُقعات بھی اپنے قلم سے لکھ کر جمع کر رکھے تھے۔

دوسری قابلِ ذکر کتاب "جوامع الکلم" حضرت سیّد محمد حُسینی گیسو دراز (ولادت ۴ رجب ۷۲۰ھ، وفات ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کے فرزندِ اکبر سیّد محمد اکبر حُسینی نے جمع کیے تھے۔ "جوامع الکلم" میں ۱۸ رجب ۸۰۲ھ سے ۲۲ ربیع الثّانی ۸۰۳ھ تک کی مجلسیں قلم بند ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا فارسی متن بھی شائع ہوگیا ہے اور اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ اسی زمانے میں یعنی ۸۰۳ھ میں انھوں نے "حظائر القدس" تصنیف کی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۰۶۸ھ میں کتابت ہوا تھا اور اورنگ زیب کے کُتب خانے میں رہ چکا ہے، اب آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں موجود ہے۔ (تصوّف فارسی نمبر ۴۰۹)

سیّد محمد حُسینی گیسو دراز کے حالات میں میر محمد علی سامانی کی کتاب "سیرِ محمّدی" (تالیف ۸۳۱ھ) بھی بُنیادی اہمیت کی تالیف ہے لیکن حضرت گیسو دراز کے ملفوظات "جوامع الکلم" سے پہلے شیخ علاء الدین گوالیری نے کتاب "انوار المجالس" میں جمع کیے تھے

اور جس سنہ کی مجلسوں پر "انوار المجالس" کا اختتام ہوا ہے، اس کے بعد ہی "جوامع الکلم" شروع ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر "انوار المجالس" ہمیں مل جائے تو ہم حضرت گیسو دراز کی اُن مجلسوں میں پہنچ سکتے ہیں جو تیمور کے حملے سے پہلے دہلی میں منعقد ہو رہی تھیں اور جن میں سیّد اشرف جہانگیر سمنانی بھی کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوتے تھے اور مسائلِ تصوّف کی تشریح طلب کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دکن کے علاقہ کوکن میں مخدوم علی مہائمی، گجرات میں شیخ احمد کھٹو، پنجاب میں جہانیان جہاں گشت، بہار میں شرف الدین یحییٰ منیری، بنگال میں شیخ علاء الحق اور مشرقی یو۔پی میں سیّد اشرف جہانگیر سمنانی تصوّف کی شمعیں روشن کیے ہوئے تھے۔

سیّد اشرف جہانگیر سمنانی بھی سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ ہیں، اُن کے ملفوظات کا مجموعہ "لطائفِ اشرفی" نظام حاجی غریب یمنی کا فراہم کردہ ہے جو تیس سال تک حضرت سمنانی کے ساتھ رہے۔ اس کتاب میں غالباً پہلی بار اصطلاحاتِ صوفیہ کی تشریح کی گئی ہے اور تصوّف کے نظری پہلوؤں پر بھی بہت سا قیمتی مواد موجود ہے۔ حضرت سمنانی دُنیا بھر میں واحد تذکرہ نگار ہیں جو حافظ شیرازی سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں ورنہ حافظ شیرازی کے دوسرے کسی معاصر کا ایسا بیان موجود نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ "لطائفِ اشرفی" کو نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے۔ یہ صرف ایک بار چھپی ہے اور اب اگر تحقیق و تدوین کے جدید تقاضوں کے ساتھ اسے ترتیب دیا جائے تو ۲-۳ جلدوں میں بآسانی سما سکتی ہے۔

مخدوم جہانیان جہاں گشت جنھیں سہروردی سلسلے میں شیخ رکن الدین مُلتانی (ف ۷۳۵ھ) سے اور چشتی سلسلے میں حضرت چراغ دہلی سے اجازت حاصل تھی، صاحبِ تصانیف کثیرہ بزرگ ہیں۔ ان کے ملفوظات "خزانۂ جلالی"، "سراج الہدایہ" اور "الدّر المنظوم" خاص طور سے ہندستان میں تصوّف کے فکری ارتقا کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ حضرت چراغ دہلی کے خلفا میں میر سیّد محمد بن جعفر مکّی کی "صحائف سلوک" اور "بحر المعانی" بھی بنیادی کُتب میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ "بحر المعانی" کا ایک مخطوطہ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد میں

ہے۔ اس میں مَلِک محمود عرف شیحنہ کے نام لکھے ہوئے خطوط ہیں جن میں پہلا خط ۸۲۹ھ کا ہے۔ ان خطوط میں مسائل و مصطلحاتِ تصوّف کی عالمانہ شرح کی گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے جو ۱۲۳۶ھ کا مکتوبہ ہے۔

حضرت چراغ دہلی کے ایک اور خلیفہ قاضی عبدالمقتدر کے ملفوظات ان کے پوتے شیخ ابوالفتح جونپوری نے جمع کیے تھے۔ قاضی عبدالمقتدر نے ۷۸۸ھ یا ۷۹۱ھ میں انتقال کیا اور حوض شمسی کے قریب خانقاہ عبدالصمد میں مدفون ہوئے۔ اسی زمانے میں گجرات کے شیخ احمد کھٹو کے ملفوظات "تحفۃ المجالس" محمود بن سعید ایرجی نے جمع کیے۔ سہروردی سلسلے کے بزرگوں میں حضرت شیخ یحییٰ منیری (ف ۶ شوّال ۶۸۲ھ) کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات میں تصوّف کے دقیق مسائل کو خوب حل کیا ہے۔ ان کے ایک مرید نے کتاب "مناقب الاصفیا" میں سہروردیہ بزرگوں کے حالات لکھے تھے۔ خود شیخ منیری کے ملفوظات زین بدر عربی نے "معدن المعانی" کے نام سے مرتّب کیے (آصفیہ تصوّف فارسی ۷۰)۔ ان ملفوظات میں بھی تصوّف اور تاریخِ تصوّف کا بہت قیمتی مواد ہے۔

تھوڑا سا عہدِ مُغلیہ میں گُھس کر ہم اپنا یہ جائزہ شاہ حامد بن فضل اللہ جمالی دہلوی (ف ۹۴۲ھ) کی "سیر العارفین" پر ختم کرتے ہیں جو ہمایوں کے عہد میں مرتّب ہوئی ہے۔ جمالی سہروردی سلسلے سے متعلق تھے اور تصوّف کا گہرا رچا ہُوا مذاق رکھتے تھے۔ افغانستان، وسط ایشیا، ایران، ترکی، عراق، حجاز اور شام تک سیاحت کر چکے تھے۔ "سیر العارفین" میں انھوں نے جا بجا اپنے مشاہدات بھی قلم بند کیے ہیں۔ ہندستان میں تصوّف کی تاریخ لکھتے ہوئے، ہم "سیر العارفین" کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

[ پندرھویں صدی ہجری کے استقبال میں منعقد ہونے والی مسلم علماء کی بین الاقوامی کانفرنس اسلام آباد میں پڑھا گیا۔ یہی مقالہ راجستھان یونیورسٹی جے پور کے سمینار "ہندستان میں تصوّف" میں بھی پیش کیا گیا۔ ] ۱۹۸۱ء

# تصوّف اسلامی اور جدید ذہن

" تصوّف اسلامی کیا ہے " اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُسے ہم دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں : ایک وہ تحریریں ہیں جو صاحبِ دل اور صاحبِ حال بزرگوں کے قلم سے نکلی ہیں جن میں صرف اُن کا مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں، مکاشفہ اور ذاتی روحانی تجربہ بھی شامل ہے ——— دوسری وہ بے روح عبارت آرائیاں ہیں جنھیں علمی تحقیق کا نام دیا جاتا ہے، جو عموماً اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ 'صوفی' صُوف سے مشتق ہے یا 'صفا' سے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آج کی گفتگو بھی اِسی زُمرے میں کہیں جگہ پائے گی۔ لیکن اس دوسری شق کی تحریروں کا ایک حصّہ وہ بھی ہے جو مُستشرقین کی بلند پروازی اور معاندین کی کینہ پردازی کا نتیجہ ہے، یا اُن غیر مسلم مصنّفوں کے افکار سے عبارت ہے جنھوں نے بزعمِ خویش تصوّف کا معروضی (Objective) مطالعہ کیا ہے۔ مگر وہ اس کی کُنہِ حقیقی تک پہنچ نہیں سکے ہیں۔ صوفیا کے سرائر تک تو ہم ظاہر بینوں کی رسائی بھی نہیں ہے البتہ آج کی گفتگو کا جواز یہ ہے کہ میں تصوّف کو ایک با معنی، با مقصد اور زندہ رویّہ سمجھتا ہوں اور آج کے مسائل کی روشنی میں اس پر ایسی گفتگو کرنی چاہتا ہوں جو روایتی انداز سے کسی قدر ہٹی ہوئی ہوگی۔

جب ہم تصوّف کی گفتگو کریں تو یہ سب باتیں محذوف سمجھی جائیں گی کہ

اس کی بنیاد تمام تر کتاب و سنّت پر ہے اور یہ اسلامی شریعت اور اسلامی طرزِ فکر سے قطعاً معارض نہیں ہے۔ تصوّف کا ایک نظریاتی پہلو ہے، دوسرا عملی۔ مجھے اس گفتگو میں صرف متصوّفانہ طرزِ فکر سے سروکار ہے یعنی میں آج کی دنیا کو ایک ایسے صوفی کی نگاہ سے دیکھنا چاہوں گا جو پوری طرح عالمِ صحو میں ہے اور اپنے ذہنی رویّے کو نئی سماجی تبدیلیوں کے لیے بروئے کار لانا چاہتا ہے۔

اسلامی فکر عالمِ بشریت میں ایک انقلابی فکر تھی (اور جب میں "تھی" کہہ رہا ہوں تو میرے ذہن میں یہ کلّیہ موجود ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا احاطہ کرنا ہو تو ضمیر غائب استعمال کی جائے گی، جیساکہ قرآن کا اسلوب بھی ہے) انقلابی فکر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ روایتی فکر سے متصادم ہوتی ہے، اسلام کو اپنے تصوّرِ اقدار کی فوقیّت اور افادیت پر اصرار ہے۔ آج دنیا کے سیاسی و اقتصادی ڈھانچے میں مسلمانوں کی پوزیشن کتنی بھی کمزور سمجھی جائے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام کی نظریاتی افادیت بھی ختم ہوگئی ہے یا کمزور پڑگئی ہے۔ اسلام جہاں جہاں بھی پہنچا ہے وہاں کے رائج الوقت نظریات اور طرزِ زندگی سے اس کا تصادم ہونا ایک فطری عمل تھا جس پر تعجّب نہیں ہونا چاہیے۔

مفاہمت کی بھی اپنی حدیں ہوتی ہیں۔ کیا آج سوشلزم، کمیونزم یا امپریلزم اپنے مخالف نظریات سے متصادم نہیں ہو رہے ہیں؟ ہمیں تمام دوسرے عالمی مذاہب و افکار میں تہذیبی اور مذہبی جارحیت کی کھلی ہوئی نشانیاں ملتی ہیں۔ حالاں کہ بہت سے مذاہب جغرافیائی یا نسلی طور پر محدود رہے ہیں اور اسلام نے معشر النّاس سے خطاب کیا ہے۔ پھر بھی اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریے کی سیادت پر کامل یقین رکھتے ہوئے بھی کسی تہذیبی جارحیت کی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نورِ ہدایت ہے جسے ظلمت و غوایت سے ممتاز کر دیا گیا ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ وہ اس پر تو سمجھوتہ کرسکتا ہے کہ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ لیکن اس پر مفاہمت نہیں ہوسکتی کہ مسلمانوں کے

لیے حقوق العباد اور حقوق اللہ کے معیار مقرر کرنے میں کوئی دوسرا نظریہ زیادہ مفید، جامع اور آئینِ فطرت سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام کے معاندوں کی ایک جماعت ہر دور میں اُس کی بیخ کنی کے درپے رہی ہے اور اس کا چہرہ مسخ کرتی رہی ہے۔ جس طرح فقہِ اسلامی، فلسفۂ اسلامی اور ارکان و شرائع اسلامی کو ہدف Target بنایا گیا ہے اسی طرح اسلام کے روحانی پہلو یعنی تصوّف کو بھی طرح طرح سے مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ تصوّف کو اسلام کے دوسرے سب پہلوؤں سے زیادہ غلط سمجھا گیا ہے یا اس کے بارے میں جان بوجھ کر بے بنیاد مفروضوں کی اشاعت کی گئی ہے۔

تصوّف اسلامی پر چند بنیادی اعتراضات کچھ اس نوعیت کے ہیں :

(۱) اسلام کا تصوّف سے کچھ علاقہ نہیں، متصوّفانہ فکر غیر اسلامی فکر ہے۔

(۲) یعنی صوفیا کے افکار عجمی فکر سے مستعار یا متاثر ہیں۔

(۳) تصوّف دروں بینی، ترک دنیا اور مردم بیزاری کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے ہمارے ذہنی اور جسمانی قوی کو مضمحل بلکہ ناکارہ بنا دیتا ہے۔

اگر یہ اعتراضات صرف غیر مسلم مستشرقین کی جانب سے آتے تو انھیں بھی ان کے روایتی بغض و عناد پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ان تیراندازوں کی صف میں خود ہمارے بعض ممتاز علما اور مفکّرین بھی شامل ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ یہ تلخ حقیقت ہے کہ خود اہلِ خانقاہ اپنی تیغِ جگر دار کھو کر خالی نیام لیے بیٹھے ہیں :

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
کہ با من انچہ کرد آن آشنا کرد

جس طرح شریعت اسلام کی فضیحت علمارِ سُوء نے کی ہے، اسی طرح روح اسلام یعنی تصوّف کو رُسوا کرنے کی ذمّے داری سے جاہ طلب صوفیاے سُوء اور عقبیٰ فروش اہلِ خانقاہ بَری نہیں کیے جا سکتے۔ علما تو اپنے علمِ ظاہر کی وجہ سے شریکِ حکومت بھی

رہے اور احتساب و قضا جیسے عہدوں پر متمکن ہونے کے باعث دنیا اور اہلِ دنیا سے ان کا رابطہ ہونا ایک لازمی بات تھی۔ مگر اہلِ خانقاہ خود کو تارکِ دنیا کہتے تھے۔ جب وہ بھی جیفۂ دنیا کے پیچھے بھاگنے لگیں تو اُن سے ہمارا بدظن ہو جانا ایک فطری بات ہوگی۔

ایک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک بہروپیا طرح طرح کے سوانگ بنا کر کسی بادشاہ کے دربار میں آتا تھا مگر بادشاہ ہر بار اُسے پہچان لیتا تھا۔ انعام کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ بہروپ بنائے اور پہچانا نہ جائے۔ ایک بار وہ طویل زمانے تک غائب رہا۔ رفتہ رفتہ دربار تک یہ خبر پہنچی کہ فلاں جنگل میں ایک بڑے خدا رسیدہ تارک دنیا، متقی اور بزرگ تشریف رکھتے ہیں۔ خلقِ خدا ان کی طرف رجوع ہونے لگی۔ وہ کسی کو دعا دیتے، کسی کو تعویذ —— اکثر خاموش رہتے اور نوافل و عبادات میں مصروف۔ آخر بادشاہ کو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا تو واقعی ایک بزرگ بڑی نورانی صورت والے نکلے۔ بادشاہ نے جبین نیاز جھکائی، ہمّت طلب کی اور چلتے وقت ایک تھیلی اشرفیوں کی نذر گذرانی۔ بزرگ نے اس نذر کو قبول نہیں کیا اور کہا کہ "بابا فقیر کو اس دولت سے کیا لینا ہے۔ اسے حاجت مندوں میں بانٹ دو۔"

اگلے دن اچانک وہی بہروپیا دربار میں نمودار ہوا، اور آداب بجا لایا پھر بخشش و انعام کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کس بات کا انعام چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ جہاں پناہ! وہ خدا رسیدہ بزرگ میں ہی تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم بے وقوف بھی ہو، انعام کی بھیک مانگنے آئے ہو۔ کل ہم تھیلی بھری اشرفیاں نذر دے رہے تھے، وہ کیوں نہ لیں؟ بہروپیا بولا کہ "جہاں پناہ! یہ بھی تو سوچیے کہ میں کس کا بھیس بنائے بیٹھا تھا؟"

ایک مسخرے۔ بہروپیا کو بھی اس کا احساس تھا کہ سچی نقل کسی درویش کی اُسی وقت ہوگی جب ترک دنیا، قناعت اور بے طمعی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اکثر حالات میں مشائخ صوفیہ کی جگہوں پر جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ شیخِ وقت تو کیا، کامیاب

بہروپیے بھی نہیں بن سکتے کیوں کہ اِس فن کے معمولی آداب سے بھی واقف نہیں۔ بقول عبدالواحد بلگرامی "مشائخ عظام کہاں ہیں عظام (یعنی ہڈّیاں) رہ گئی ہیں"۔

اہلِ تصوّف میں دنیا طلبی اور جاہ پرستی آگئی اور تصوّف کو کسبِ معاش کا وسیلہ بنالیا گیا۔ اسی لیے سجّادہ نشینی بھی موروثی بن گئی۔ اکثر اہلِ تصوّف اپنا سلسلۂ طریقت حضرت علیؓ سے ملاتے ہیں اور پچھلی دو تین صدیوں میں ان کا رُجحان شیعیت کی طرف بھی نمایاں رہا ہے۔ وہ امیر معاویہؓ کو تو اس لیے مطعون کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو نامزد کر کے اُس کی بیعت لے لی تھی مگر یہ نہیں سوچتے کہ اُن کے سلسلۂ عالیہ میں بھی یہی عمل بار بار دُہرایا جا رہا ہے۔ ہمارے مشائخ اپنے خلیفہ کو باطنی نعمت منتقل کرتے تھے جس کے استحقاق کے لیے اولاد ہونا ضروری نہیں ہے اور اس میں اوقاف یا جاگیریں نہیں ہوتی تھیں، مصلّٰی، تسبیح، خرقہ، عصا اور نعلین ہوا کرتے تھے۔

حضرت بابا فریدؒ کے پانچ بیٹے موجود تھے، بعض خلافت کے خواہاں بھی تھے، مگر حضرت نے اپنی خلافت سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو سرفراز فرمایا، جن سے کوئی دور کا رشتہ بھی نہ تھا مگر اُنھوں نے اپنی فراست ایمانی سے دیکھ لیا تھا کہ حضرت نظام الدینؒ کی شخصیت میں علم، عقل اور عشق تینوں صفات جمع ہو گئی ہیں اور جس میں یہ تینوں جوہر موجود ہوں اُس سے مشائخ کی خلافت خوب ہو سکتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں کوئی سیّاح آئے جو عراق، عرب اور وسط ایشیا کی سیر کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ اپنے مشاہداتِ سفر بیان کر رہے تھے۔ حضرت نے پوچھا: شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ کا کیا حال ہے؟ اُنھوں نے بتایا کہ خانقاہ موجود ہے اور شیخ کے پوتے اس میں رہتے ہیں، دولت کی فراوانی ہے۔ مگر ان پوتے میں شیخ والی کوئی خوبی نہیں ہے، دُنیا دار قسم کے آدمی ہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے حضرتؒ سے پوچھا کہ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مشائخ کی اولاد ان کے نقش قدم پر نہیں رہتی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ حضرت نظام الدین اولیاؒ

نے فرمایا کہ "یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ یہ دکھاتا ہے کہ رشد و ہدایت اُسی کی جانب سے ہے، شیخ محض بہانہ ہے۔ اگر رشد و ہدایت شیخ کے اختیار میں ہوتی تو یہ نعمت وہ سب سے زیادہ اپنی اولاد ہی کو دے سکتا تھا۔"

جب خانقاہوں کو روزی کمانے کا ٹھکانا بنالیا گیا تو علم بھی رخصت ہو گیا، آخر میں رشد و ہدایت نے بھی اجازت طلب کرلی۔ رفتہ رفتہ خانقاہ کی روایت ہی ختم ہو گئی حتیٰ کہ آج یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ خانقاہ کیسی ہوتی تھی اور وہاں کیا ہوتا تھا۔ اب خانقاہوں کی جگہ درگاہیں رہ گئیں جہاں کچھ مجاور نذر نیاز، تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے نام پر مصیبت کے مارے ہوئے دُکھی انسانوں سے اپنا رزق حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس زوال کی تکمیل اُن رسوم و بدعات نے کردی ہے جن کی نہ کوئی مذہبی اہمیت ہے، نہ معاشرتی افادیت۔

یہاں یہ بات یاد کرنے کی ہے کہ اسلام نے ہر اُس آمدنی کو ناجائز قرار دیا ہے جس میں شُبہ یا ابہام ہو، جس کا کوئی جواز نہ ہو، جس میں استحصال کا شائبہ پایا جاتا ہو اور جس کا استحقاق ثابت نہ کیا جاسکے۔ اسی لیے سود حرام ہوا ہے اور اسی سبب سے پیڑ پر لگے ہوئے پھل فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ فتوح، نذرانہ، نیاز، شکرانہ اور اس طرح کی آمدنی میں اتنا خفی فرق ہے کہ اُسے صرف ایک صاحبِ تقویٰ ہی محسوس کرسکتا ہے۔

میں خانقاہ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ متامّل ہوتا ہوں کیونکہ اس کا مسمّیٰ تو اب پایا ہی نہیں جاتا۔ درگاہوں کی حالت بلا استثنا تو نہیں البتہ اکثر وہی ہے جو مجملاً بیان کی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان درگاہوں کی اصلاح ہوسکتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا طریقِ کار کیا ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ درگاہوں کی سماجی افادیت اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب اُنھیں خانقاہوں میں تبدیل کردیا جائے۔ خانقاہ ایک ایسا لفظ ہے جس میں

مدرسہ بھی ہے، مسجد بھی، لنگر خانہ بھی، تسبیح خانہ بھی۔ یہ تربیت گاہ بھی ہے اور درماندہ و پس ماندہ انسانوں کے دُکھ درد کا مداوا بھی۔ درگاہ تو صرف مجاوروں سے بھی چل سکتی ہے اور چل رہی ہے لیکن خانقاہ میں فیض سنگ و خشت سے نہیں، شیخ کے وجود سے جاری ہوتا ہے —— یعنی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جب خانقاہ ہوگی تو شیخ بھی ہوگا۔ شیخ کا فیض صرف مذہبی اور روحانی ہی نہیں ہے، اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی بھی ہے —— میں اس نکتے کو ایک دو مثالوں سے واضح کرنا چاہوں گا:

ناگور (راجستھان) میں ایک تاجر تھا جو مالِ تجارت لے کر مُلتان کی سمت جایا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے رختِ سفر باندھا تو اس کی باندی نے کہا کہ آپ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوں تو اس بندی کا سلام بھی حضرت کی خدمت میں پہنچا دیں۔ وہ حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوا تو اُسے باندی کا سلام بھی یاد آیا اور اس نے شیخ سے عرض کیا کہ میری ایک کنیز ہے، اس نے حضرت کی خدمت میں سلام بھیجا تھا۔ بابا صاحب نے سلام کا جواب دیا اور ہاتھ اٹھا کر دُعا کی کہ اللہ اُسے آزاد کردے۔ اُسی وقت تاجر کو خیال آیا کہ حضرت نے اپنی زبانِ مبارک سے دعا دی ہے تو یہ مقبول بھی ہوگی۔ اگر میں باندی کو بیچ دوں گا تو اُسے آزاد کرنے کا ثواب کسی اور کو ملے گا۔ یہ ثواب میں ہی کیوں نہ حاصل کرلوں۔ اُسی وقت اُس نے عرض کیا کہ "میں حضرت کے صدقے میں اُسے اِسی وقت آزاد کرتا ہوں۔"

یہاں یہ غور کرلیجیے کہ کوئی سماجی مصلح یا نرا عالمِ دین ہی ہوتا تو زیادہ سے زیادہ اُس تاجر کو یہ مشورہ دے سکتا تھا کہ وہ باندی کو آزاد کردے۔ اور اس کے لیے سبب بتانا اور دلیل لانا بھی ضروری ہوتا یا وہ فکِّ رقاب کے فضائل بیان کر دیتا۔ پھر بھی اس کا اثر ہوتا یا نہ ہوتا۔ مگر ایک صوفی نے ہاتھ اُٹھا کر اللہ سے باندی کی آزادی طلب کی اور وہ اُسی وقت مل گئی۔ اس کی ماورائی تاویلیں بہت سی ہوسکتی ہیں لیکن اصل میں یہ تصوّف کا کرشمہ ہے جو براہِ راست کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ ایک بار اجودھن سے دہلی واپس آرہے تھے۔ راستے میں سنّام میں کسی سرائے میں ٹھہرے۔ وہاں دو بھٹیاریاں آپس میں لڑنے لگیں۔ ایک نے دوسری پر مختلف قسم کے الزام لگائے اور اس کے اخلاقی عیوب گنانے لگی۔ وہ دوسری بھٹیاری کہنے لگی کہ "جو کچھ تم کہہ رہی ہو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ یہ باتیں میری بیعت سے پہلے کی ہیں یا بعد کی؟" یہ جملہ سن کر حضرت نظام الدینؒ کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اسی لیے انھوں نے ہر شخص کے واسطے بیعت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ تجربے نے یہ بتایا کہ اس سے کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور ہو جاتی ہے، اس لیے بیعت لینے میں تُخل کرنا مناسب نہیں۔ ایک اور موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ نعمتِ باطنی آسانی سے پائی ہے، اس لیے آسانی سے دے بھی دیتا ہوں۔

مغربی علما نے کلچر کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے: ایک کو وہ مادّی کلچر کہتے ہیں، دوسرا روحانی کلچر ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے طرز فکر میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ وہاں روحانی کلچر، مادی کلچر کے تابع ہو جاتا ہے اور مادی تغیّرات سے متاثر ہوتا ہے لیکن اسلام چاہتا ہے کہ ہمارا مادی کلچر یعنی ہماری معیشت یا ہمارا سماجی ڈھانچا روحانی کلچر کا تابع دار بن کر رہے۔ اس کے بغیر اعلا اقدار کا تحفّظ ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے مشائخ خانقاہوں اور زاویوں میں بیٹھ کر بھی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ عزلت و رہبانیت کی زندگی گذاریں۔ یعنی وہ صرف اپنی نجات کے طالب نہیں ہوتے بلکہ پورے معاشرے کی فلاح و نجات چاہتے ہیں۔ اور یہی تصوّف کا مقصد ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ابتدائی زمانے میں بادشاہ اور امرا نے جمنا ندی کے کنارے اپنے محلات بنا لیے تھے۔ امرا کی ان ڈیوڑھیوں میں ہر طرح کی بداخلاقی، لہو و لعب اور لایعنی باتیں عام تھیں۔ بقول شخصے:

شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

حضرت نے یہ دیکھا تو پہلے یہ کیا کہ شہر کے کنارے کسی باغ میں جا کر تلاوت اور نوافل میں مشغول رہتے۔ پھر سوچنے لگے کہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، یہاں کھلّم کھلّا فسق و فجور دیکھا نہیں جاتا۔ ایک دن اسی دُھن میں پریشان بیٹھے تھے کہ ایک مجذوب نوجوان ملا۔ اس نے آپ کو دیکھ کر یہ اشعار پڑھے:

آن روز کہ مہ شدی نمی دانستی کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

امروز کہ زلفت دل خلقے بربود در گوشہ نشستنت نمی دارد سُود

پھر اس نوجوان نے کہا کہ "اوّل تو (بحیثیت شیخ) مشہور نہیں ہونا چاہیے، جب شہرت ہو گئی تو پھر ایسے بنو کہ قیامت کے دن رسول علیہ السّلام کے سامنے شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ یہ کوئی قوت اور حوصلہ نہیں ہے کہ خلق سے کنارہ کشی کر لی اور حق سے مشغول ہو گئے۔ ہمّت اور حوصلہ تو یہ ہے کہ باوجود خلق حق سے مشغول رہیں"۔ (ف ۲۴۳) یہ باتیں حضرت نے گرہ میں باندھ لیں اور طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو میں شہر میں رہوں گا اور عوام و خواص کی اصلاحِ احوال کے لیے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔

بعد کے زمانے میں ایک بار حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے کسی کے ذریعے سے شیخ کی خدمت میں کہلا کر بھیجا کہ میرا جی چاہتا ہے کہیں صحرا میں نکل جاؤں اور تنہائی میں فراغت سے یادِ خدا کروں۔ حضرت نے ذرا سخت لہجے میں فرمایا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے جو تنہائی اور فراغت کے نام پر آبادی سے دور لے جانا چاہتا ہے تاکہ اس طرح خلوت کی شہرت ہو اور عوام رجوع کریں:

"او را بگو کہ درمیان خلق باید بود و جفا و قفائے مردمان باید کشید"۔

ان سے کہہ دو کہ تمھیں لوگوں کے درمیان رہنا چاہیے اور ان کی کڑوی کسیلی بھی سہنی چاہیے۔ حضرت نظام الدینؒ اولیا کی زندگی ہی میں ان کی تحریکِ اصلاح کے ثمرات خوب خوب ظاہر ہو گئے تھے۔ چناں چہ ضیاء الدین برنی نے اسے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔

پچھلی صدی میں اس کی مثال حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی علیہ الرحمۃ کی شخصیت سے ملتی ہے جنھوں نے حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے جذبۂ جہاد اور خاندانِ چشتیہ کے سوزِ

عشق اور فنائیت کو ترکیب دے کر اپنے طالبوں کی تربیت اس طرح فرمائی کہ اُنھوں نے ایک طرف دینی تعلیم کے فروغ کے لیے مدارس کا جال بچھا دیا تاکہ اپنی روایات کو مغربی تہذیب اور تعلیم کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچا سکیں۔ دوسری طرف عیسائی مشنریوں کا جم کر مقابلہ کیا اور جنگِ آزادیِ وطن میں ہر محاذ پر برطانوی سامراج سے بھی ٹکر لی۔ مولانا تھانوی نے تو خانقاہِ امدادیہ کو ایک نمونے کی خانقاہ بنا دیا تھا اور ایک ایک سانس کو رشد و ہدایت اور تبلیغ و اصلاح کے لیے وقف کر دیا تھا۔

اسی طرح حضرت مولانا محمد الیاس کی تحریکِ دعوت و تبلیغ نے ایسے دور دراز دیہاتوں میں پہنچ کر جاہل مسلمانوں کو سنبھالا دیا کہ اگر اُنھیں اللہ کا نام نہ بتایا جاتا تو اس صدی میں بڑے پیمانے پر اِرتداد کا فتنہ پھیل گیا ہوتا۔

ہمارے زمانے میں بھی چند ایسے نفوس قدسیہ ہوئے ہیں۔ رُشد و ہدایت یا اصلاح و تربیت کا کام بالکل بند نہیں ہے لیکن جس پیمانے پر اس کی تنظیم کی ضرورت ہے، اس اعتبار سے کسی قدر بے اطمینانی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ درگاہوں سے ہمارے علما کی بے تعلقی اور چشم پوشی کے سبب سے بھی عوام کی اصلاح مشکل ہو گئی ہے۔ اصلاح ہمیشہ اندر سے ہوتی ہے، باہر رہ کر نہیں ہو سکتی۔

اس وقت خود مغرب میں روحانی تربیت کی شدید پیاس ہے۔ الوہیّت کا دعوا کرنے والے بے رِیش و بُروت کمسن خداؤں کے پیروکار بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں جو (Chartered) ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ ان حالات میں تصوّفِ اسلامی کا صحیح علم اور عمل رکھنے والوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا پیغام ان ممالک میں لے کر جائیں۔ یہ اسلام کی خدمت بھی ہوگی، تبلیغِ حق بھی اور نئی سماجی تبدیلیوں کی طرف ایک مثبت قدم بھی۔

ہمارے صوفیاے کرام نے شریعت کی بالادستی کو ہمیشہ صدقِ دل سے تسلیم کیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا:

"ہر نورے کہ موافقِ احکامِ شرع نیست ظلمت است۔" (ف ۴۰۰)

سب جانتے ہیں کہ ارادت میں متابعت کاملہ شرط ہے، چون و چرا کی گنجایش نہیں۔ لیکن حضرت چراغ دہلیؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

"مسلک پیر حجّت نمی شود، دلیل از کتاب و سنّت می باید"

پیر کا عالم شرع ہونا اسی لیے ضروری ہے کہ وہ مرید کو نامشروع باتوں سے روک سکے۔ لیکن افراد ہی کو نہیں بلکہ اپنے معاشرے کو بھی ہر طرح کے شر و فساد سے بچانا اور اُسے صالح بنائے رکھنا بھی شیخ کی ذمّے داری ہے۔ اُسے اجتماعی زندگی کے کسی پہلو سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ صوفیا کے ملفوظات میں گراں فروشی اور احتکار کی مذمّت بھی ملتی ہے۔ انسان کی باہمی معاملت ہر طرح کے فریب، چالاکی اور عیّاری سے پاک ہونی چاہیے۔

ایک بار حضرت بدرالدین اسحٰقؒ نے اپنی چادر کسی کو فروخت کرنے کے لیے دی اور کہا کہ "اسے درویشانہ، فروخت کرنا۔" وہ شخص اس کا مطلب نہ سمجھا اور پوچھا کہ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "خریدار جو قیمت لگائے اُسی پر دے دینا، بھاؤ تاؤ نہ کرنا۔" اس میں حکمت یہ ہے کہ بھاؤ تاؤ کرنے میں طمعِ دنیا ظاہر ہوتی ہے، تاجر اور خریدار کے درمیان اعتماد کا درجہ کم ہو جاتا ہے۔

حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ ایک بار لاہور کے کچھ تاجر گجرات کی طرف گئے۔ اس وقت تک گجرات میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہوئی تھی۔ مقامی باشندوں نے اِن تاجروں سے کپڑا خریدنا چاہا۔ تاجروں نے ہر چیز کی قیمت بہت بڑھا کر بتائی اور اس سے بہت کم پر سودا چُک گیا۔ مثلاً دس روپے کی چیز تھی تو بیس روپے مانگے اور چلتے چلتے دس میں دے دی۔ گجرات والے اس طرز کی تجارت سے ناآشنا تھے۔ وہاں تو دُکاندار ایک ہی قیمت طلب کرتے تھے اور اسی پر بیچتے تھے۔ جب یہ معاملہ دیکھا تو کسی نے تاجروں سے پوچھا کہ تم کس شہر سے آئے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم لاہور کے ہیں۔ اس غیر مسلم نے کہا: کیا تمھارے شہر میں سودا اسی طرح کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ وہ غیر مسلم کہنے لگا: تو کیا ابھی تک وہ شہر آباد ہے؟ انھوں نے کہا کہ

ہاں۔ وہ غیر مسلم بولا کہ جس شہر میں سودا ایسا کیا جاتا ہو اُسے آباد رہنا تو نہیں چاہیے! حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ ابھی وہ تاجر اپنا مال بیچ کر لاہور پہنچے بھی نہیں تھے، راستے ہی میں تھے کہ منگولوں نے لاہور پر حملہ کیا اور اینٹ سے اینٹ بجادی۔

کوئی مورّخ منگولوں کے حملے کا رشتہ تاجروں کے سودے بازی کرنے سے نہیں جوڑے گا۔ اس کی نظر میں اسباب و علل دوسرے ہی ہوں گے، لیکن ایک صوفی کی نظر ہمارے اعمال کے اسرار و خفایا پر ہوتی ہے جہاں انسان اپنے روز مرّہ کے معاملات اور مطلب برآری میں عیّاری اور چالاکی کو ضروری سمجھتے ہوں، وہاں ایک انسان کو دوسرے انسان پر سچّا اعتماد ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اور باہمی اعتماد ہی معاشرے کی قوّت کی ضمانت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا معاشرہ یقیناً اندر سے کھوکھلا ہوگا' دیکھنے میں ہر شخص خوش حال ہوا کرے، لاکھوں روپے کما رہا ہو، آسایش کی زندگی گذار رہا ہو، لیکن دوسرے افراد سے اس کا اجتماعی رشتہ کمزور ہوگا، اس لیے کہ اس کی بنیاد یعنی اعتمادِ باہمی مفقود ہے۔ ہر شخص بندۂ زر ہے، صرف اپنے مطلب کو دیکھ رہا ہے۔ جب کوئی خارجی آفت نازل ہوگی تو ایسا معاشرہ مجتمع ہو کر اس کو دفع نہیں کر سکے گا اور شکست کھا جائے گا۔ اسی لیے مشائخ کہتے ہیں کہ طاعت خواہ کم ہو، صدق زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہ صدق ہی اللہ سے ہمارا رشتہ استوار کرتا ہے اور یہی ہمارے معاشرے کی فلاح کی ضمانت بن سکتا ہے اور شخصی زندگی میں استقامت بھی اسی سے آئے گی۔

ہماری نگاہیں خیر اور شر دونوں کی بالائی سطح پر رہ جاتی ہیں اور اسی سے حکم لگاتے ہیں۔ شر میں کشش اسی لیے ہے کہ اس کے فوری منافع یا لذّات پر نگاہ ٹھہرتی ہے اور بواطن میں چھپی ہوئی قباحتوں اور اس کے دور رس نتیجوں سے غافل رہ جاتے ہیں۔ اب اسے شیخ کی فراست ایمانی کہہ لیجیے یا کشف و کرامات کہ وہ انجام و عواقب کو دیکھتا ہے اور اس کی تربیت بھی اسی نہج پر ہوتی ہے کہ ہم عواقب امور کو سمجھنا بلکہ دیکھنا سیکھ سکیں:

در پسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست
مردِ آخر بین مبارک بندہ ایست

(۲)

آج کی دنیا کو اقتصادی اور مادّی اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:
ایک دنیا سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے ہر طرح ترقی یافتہ ہے جسے ہر مادّی آسایش میسّر ہے اور جو عالمی اقتصادیات کے سرچشموں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے ــــــ دوسری دنیا وہ ہے جس میں قدرتی وسائل کی کمی نہیں لیکن اس کے تکنیکی وسائل کم ہیں اور وہ بھی طبقۂ اولیٰ میں پہنچنے کے لیے ہاتھ پانو مار رہی ہے ــــــ تیسری ہماری دنیا ہے جس کا بڑا حصّہ دونوں طرح کے وسائل سے محروم ہے۔ اس کی ترقی بلکہ بقا کا انحصار بھی ترقی یافتہ ممالک کی امداد پر ہے۔

پہلی، دوسری، تیسری دنیا کی یہ تقسیم خالص اقتصادی اور مادّی قوت کے اعتبار سے ہے۔ ہم یہ تقسیم اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بھی کرسکتے ہیں، اس لیے کہ اب تینوں دنیاؤں کے معیارِ اخلاق بھی الگ الگ ہوگئے ہیں۔ خیر و شر کے پیمانے بھی ملکوں ملکوں کے علاحدہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمگیر انسانی اقدار کا تصوّر بھی مبہم ہوگیا ہے۔ آج دنیائے واحد ONE WORLD کی بات کی جاتی ہے، مذہبِ انسانیت HUMANISM اور لامذہبی طرزِ حکومت (سیکولرازم) کے گیت گائے جاتے ہیں، لیکن قومیت، علاقائی عصبیت، لسانی تحزّب اور نظریاتی تعصّب نے ہمارے افکار پر ہی نہیں نظامِ معیشت اور طرزِ معاشرت پر بھی ایسا قبضہ جما رکھا ہے کہ لاکھوں انسانوں کو خانماں آوارہ کرکے اور پانی کی طرح ان کا خون بہا کر بھی ہمارے دل نہیں پسیجتے ــــــ صحافی ہوں یا شاعر، ادیب ہوں یا عوامی مقرّر، ارکانِ اسمبلی ہوں یا افسرانِ حکومت، سب ان تباہیوں کو ایسی بے دردی اور شقاوت سے دیکھتے ہیں جیسے کھیل تماشے ہوں اور لطف یہ ہے کہ ان کا مذہب بھی صحیح سالم رہتا ہے۔ خدا سے تعلقات میں بھی فرق نہیں آتا۔ اپنی دانست میں وہ روحانی انوار سے بھی حصّہ پالیتے ہیں۔ ان کا اقدارِ اعلا پر ایمان جوں کا توں رہتا ہے اور دماغ کے اس فتور میں بھی ذرّہ بھر کمی

واقع نہیں ہوتی کہ وہ خلاصۂ کائنات ہیں۔ سچ مچ کی زندگی اُنھیں کو ملی ہے، باقی سب جھوٹ موٹ زندہ ہیں۔

قرآن کریم نے خیر و شر کی تقدیر کے لیے لفظ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ استعمال کیا ہے۔ نیکی اور بدی ایسی اقدار ہیں جو مجرّد ہوتے ہوئے بھی کیفیت اور کمیت سے خالی نہیں ہیں۔ انھیں آپ خورد بین سے بھی نہیں دیکھ سکتے اور یہ سارے عالم کو محیط بھی ہو سکتی ہیں۔ صوفیا نے انسان کو عالمِ صغیر کہا ہے۔ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ سب کچھ انسان کے وجود میں رکھ دیا گیا ہے اور جتنی فضائے بسیط ہمارے خارج میں ہے ایسی ہی بے پناہ اور بے کراں کائنات ہمارے اندر بھی ہے۔ افراد میں جس طرح اشرار و اخیار ہوتے ہیں، اُسی طرح ایک قوم یا مُلک یا جماعت بھی نیک یا بد ہو سکتی ہے۔ جس طرح ایک عام انسان شرِ محض یا خیرِ محض نہیں ہوتا۔ اشرار میں بھی کچھ پہلو قابلِ تعریف ہوتے ہیں اور اخیار میں بھی کچھ ناپسندیدہ باتیں پائی جا سکتی ہیں، اسی طرح کسی بڑے انسانی معاشرے کو اگر ہم اشرار کا معاشرہ کہیں تو اس کا لازمًا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اس میں خیر کا کوئی پہلو سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔ افراد کے تصوّرات کی طرح قوموں اور ملکوں کے تصوّراتِ خیر و شر بھی مختلف ہیں۔ کہیں یہ اختلاف کشی ہماری نظریاتی بنیاد کی وجہ سے ہے۔ مثلاً ایک صوفی بڑی رقّت سے دعا مانگتا ہے:

"اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔

لیکن مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں کوئی یہ دعا نہیں مانگے گا۔ انھوں نے فقر و مسکنت کے تصوّر کو تیسری دنیا سے وابستہ کر رکھا ہے۔ وہ اپنے مُردوں کے کپڑے تیسری دنیا میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں جو یہاں بازاروں میں فروخت کر دیے جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کیوں مانگی ہے اور ہمیں اس دعا میں کیفیت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اس کا مختصر جواب وہی ہے کہ

ہمارا مادّی کلچر روحانی کلچر کا تابع ہے اور تعلیماتِ اسلام کی روح انسانی ہمدردی، دردمندی اور مسکین دوستی سے عبارت ہے۔ جہاں روحانی کلچر مادّی کلچر کا تابعدار بن گیا ہے، وہاں کسی کے دل میں یہ کھٹکا نہیں ہوتا کہ ترقی یافتہ دنیا کا سارا طمطراق اور زرق برق مادّی زندگی دراصل تیسری دنیا کے معاشی استحصال پر مبنی ہے۔

مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِد.

دوسروں کے دکھ کو اپنا سُکھ بنالینا تو سب جانتے ہیں مگر انسانیت کی معراج یہ کہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ بنالیا جائے۔ اس کے نمونے ہمیں نظری سطح پر شریعت اسلامی کی تعلیم معاملات میں اور عملی سطح پر سیرۃ طیبّہ میں اور صوفیاے کرام کی زندگی میں بکثرت ملتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا ؒ نے مولانا کیتھلی کا ذکر کیا کہ ایک بار وہ میرے پاس آئے۔ مبشّر میرا خادم نوعمر تھا۔ اس نے شاید کوئی بے ادبی کی۔ میں نے اس کے ایک بید مار دیا۔ مولانا کیتھلی نے ایسی درد بھری چیخ ماری جیسے چوٹ اُنھیں لگی ہے، رونے لگے اور کہا کہ یہ میری شامت تھی جو اُسے یہ تکلیف پہنچی۔ حضرت نے فرمایا کہ اُن کی رقّت اور شفقت سے میرا بھی دل ہِل گیا۔ (ف ۱۱۲)

دوسروں کے دکھ کا اثر اپنے دل پر کس طرح اور کیوں ہوتا ہے، فکرِ جدید نے بہت زور مارا تو (Telepathy) کا نظریہ ہاتھ آگیا مگر اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اور مجلس میں حضرت نظام الدین اولیا ؒ نے وہ بات فرمائی جو ایک صوفی ہی کہہ سکتا تھا۔ فرمایا کہ جب روح قوی ہو جاتی ہے اور کمالِ (صفا) کو پہنچ جاتی ہے تو وہ قلب کو جذب کر لیتی ہے اور قلب جب قوی ہوتا ہے اور کمالِ صفا کو پہنچتا ہے تو وہ قالب کو بھی جذب کر لیتا ہے، اس اتحاد کی وجہ سے جو کچھ قلب پر گذرتی ہے اس کا اثر قالب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس پر امیر حسن دہلوی جامع ملفوظات نے کہا کہ اس حال میں تو کچھ معراج کے سے اوصاف ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں، اب اس ایک ملفوظ کی روشنی میں وہ دعا مانگیے کہ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ

امتنی مسکینًا و احشرنی فی زمرۃ المساکین۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ انسانیت کی معراج پر پہنچنے کی دعا مانگی جا رہی ہے۔

علمائے ظاہر اور صوفیا میں کیا فرق ہے؟ علما اہلِ عقل ہیں اور صوفیا اہلِ عشق۔ انبیا میں یہ دونوں جوہر ہیں۔ حضرت بابا فریدؒ کسی کو دُعا دیتے تو فرماتے تھے:

"خدائے عزّ و جل ترا دردے دہاد"۔

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ وہ شخص (مراد خود متکلم) حیران ہوتا تھا کہ یہ کیا دعا ہے۔

"این ساعت معلوم می شود کہ آن چہ دعا بود"۔ (ف ۲۲۷)

یعنی اب سمجھ میں آیا ہے کہ وہ کیا دعا تھی ــــــ شیخ عطارؒ فرماتے ہیں:

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرّہ دردے دل عطّار را

یہ درد کا رشتہ وہ ہے جو ساری انسانیت کو ایک شیرازے میں باندھ سکتا ہے۔ ورنہ تاریخ میں صبرہ اور شتیلہ اور نیلی جیسے مظالم کی داستانیں بار بار دُہرائی گئی ہیں اور شاید دُہرائی جاتی رہیں گی جو خود کو "اللہ کے خاص بندے" کہتے ہیں اور جو ہمیشہ خود کو مظلوم کہتے آئے ہیں۔ وہ بھی ایسی بہیمانہ سفاکیوں پر ذرّہ بھر ندامت محسوس نہیں کرتے۔

اسی طرح وہ جو ایک چیونٹی کی جان لینا پاپ سمجھتے ہیں، اور ایک جانور کو بچانے کے لیے انسانوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی کو تباہ کر سکتے ہیں، یا وہ جو روز آنکھیں بند کر کے پہاڑی وعظ دہراتے ہیں کہ جو تمھارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ وہ ایک چشم زدن میں ہیروشیما اور ناگاساکی کو ۲۵ لاکھ بے گناہوں کا شمشان گھاٹ بنا دیتے ہیں اور ایک دن کے مفتوحہ شہر Open City میں کئی کئی لاکھ ناجائز اولادیں چھوڑ آتے ہیں جو ہپّی بن کر دُنیا بھر میں منکرات و محذرات کی تبلیغ کرتی پھرتی ہیں۔ خلاصہ وہی ہے کہ ساری بُرائیوں کی جڑ شقاوت اور (Callousness) ہے جس کی دوا تصوّف کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔

یہ سارے مظالم اور فساد فی الارض، یہ فسق و فجور، یہ طغیان و عصیان سب اپنی جگہ پر ـــــ خدا سے قربتِ خاصّہ اپنی جگہ ـــــ گویا دونوں میں کوئی تضاد ہے ہی نہیں۔ اس کا سبب وہی ہے کہ روحانی کلچر کو مادّی کلچر کا تابعدار بنالیا ہے۔ اور اخلاقیات کو پہلے جنسیات سے خارج کیا، پھر قانون سے، پھر معاشرت سے اور آخر میں اسے مذہب سے بھی دھکّا دے کر نکال دیا، اس لیے ان کی روحانیت اور اخلاقیات ان مظالم پر ملامت نہیں کرتی بلکہ الٹی تاویلیں تراش کر مطمئن کر دیتی ہے۔

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ نے فرمایا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت پر چند روز کا رونا دھونا ہوتا ہے، پھر آدمی نارمل ہو جاتا ہے۔ مگر تصوّف میں عمر بھر کا رونا ہے، اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بارے میں کسی مجلس میں یہ تذکرہ ہوا کہ انھیں عجب فراغ حاصل ہے۔ دنیا کا کوئی جنجال پیچھے لگا ہوا نہیں، چین کر رہے ہیں۔ کسی نے آکر حضرتؒ سے بیان کیا تو آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

> "آن قدر غم و اندوہ کہ مراست ہیچ کس را دریں جہان نیست زیرا کہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہ خویش می گویند ہمہ در دل و جان من می نشیند۔ عجب دلے باشد کہ غم برادر مسلمان بشنود و دروے اثر نکند۔"

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ایک مرید محمد شاہ غوری تھے۔ بڑی عقیدت اور اخلاص سے خانقاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک بار شیخ کی خدمت میں آئے تو کچھ پریشان اور حواس باختہ سے تھے۔ شیخ نے پوچھا: کیا حال ہے؟ کہا کہ میرا ایک بھائی بیمار ہے اور اس وقت سکرات کے عالم میں اُسے چھوڑ کر آیا ہوں، ممکن ہے کہ میری واپسی تک وہ جاں بحق ہو جائے یا ہو گیا ہو۔ میں اسی وجہ سے درہم برہم ہو رہا ہوں کہ وہ گھر کو سنبھالتا تھا اور میں فراغ دل سے خانقاہ میں ذکر و شغل کرتا تھا۔ اب شاید یہ بھی ممکن نہ ہو۔ حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا کہ "محمد شاہ! جو کیفیت اِس وقت

تمھاری ہے۔ میں ساری عمر اسی کیفیت میں رہا ہوں، البتہ کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ جاؤ تمھارا بھائی اچھا ہو جائے گا۔" محمد شاہ نے گھر آکر دیکھا تو بھائی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ (ف ۳۹۵)

دردمندی کی اس کیفیت کی ساری عمر حفاظت کرنا اور خود کو بھی سنبھالے رکھنا کیا علمِ جدید کی اصطلاح میں صرف اذیت کوشی ہے؟ عقل اگر سلیم ہے تو وہ بھی دوسروں کی تکلیف پر کڑھتی ہے اور دوسروں کے ابتلا سے آزردہ ہوتی ہے، جیسے المتنبی نے کہا ہے:

"ذُوالعَقل یشقیٰ فی النّعیم بعقله وأخُوالجَهالةِ فی الشّقاوۃِ ینْعم."

صوفیا کے پاس تو عقل ہی نہیں، دو جوہر اور بھی ہیں جنھیں علم اور عشق کہا جاتا ہے، اور آئینے کی طرح شفاف قلب ہے جس نے قالب کو بھی اپنا تابع بنا لیا ہے۔ شمعوں کی طرح ضیا بار لطائف ہیں اور فضا کی طرح بسیط و پُرانوار روح ہے، پھر وہ مادی اعتبار سے نعیم میں بھی نہیں رہ رہے ہیں۔ اُن کا شعور، اُن کی آگہی، ان کا ادراک و احساس، ان کی دردمندی اور دِل سوزی کس مرتبے کی ہوگی، اس کا ہم کیا اندازہ کرسکتے ہیں؟

خلاصہ یہ کہ جس مادی کلچر کی بنیاد استحصال پر رکھی گئی ہو اُس میں شقاوت جزوِ اعظم ہے۔ اس لیے کہ شقاوت کے بغیر زر اندوزی نہیں ہوسکتی۔ میرے خاندان میں ایک بزرگ تھے، بغایت فیّاض اور کشادہ دست۔ جو کچھ آتا کھا پی کر، ضرورت مندوں کو دے دلا کر ہاتھ جھاڑ لیتے تھے۔ ان کے احباب میں سے کسی نے سمجھایا کہ دکھ سُکھ انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے، وقتِ ضرورت کے لیے کچھ پس انداز بھی کرنا چاہیے تاکہ کسی سے سوال کرنے کی نوبت نہ آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ "میں بھی یہ جانتا ہوں، اور چند بار کچھ پس انداز کرنے کی کوشش بھی کی لیکن تجربہ یہ ہوا کہ دولت بغیر مُہر شقاوت لگائے رُکتی نہیں اور یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔"

ایک بار میں نے راہ چلتے ایک مکالمہ سنا۔ ایک غریب کمھار نے سود کا کاروبار کرنے والے ایک مہاجن سے کچھ روپیہ قرض لے رکھا ہوگا جس کا سُود بہت

ہو گیا تھا، وہ اُسے کچھ کم کرانا چاہتا تھا۔ رو کر، گڑگڑا کر مہاجن سے کہہ رہا تھا کہ مجھ پر دیا کرو، میں بہت غریب آدمی ہوں، سود کچھ کم کر دو۔ مہاجن اس کی زار نالی سے ذرہ بھر متاثر نہیں تھا اور شہر کے دو تین دولت مندوں کے نام لے کر کہہ رہا تھا کہ "میرا کاروبار اُن سیٹھوں سے تھوڑا ہی چل رہا ہے۔ غریبوں ہی سے چل رہا ہے۔"

اللہ اکبر! لعنت ہے ایسی دولت پر، ایسی جائیداد پر، ایسی مادی آسایش اور طمطراق پر ــــ جو انسان کو حیوانات بلکہ جمادات سے بھی نیچے گرا دیں۔ یہ تو ایک فرد کی مثال ہے، آپ چاہیں تو اِسے پھیلا کر قوموں اور ملکوں پر منطبق کر لیجیے۔ کیا ترقی یافتہ ممالک کی دولت کا راز پس ماندہ ملکوں کا استحصال نہیں ہے؟ اور کیا اس استحصال کے پیچھے شدید قسم کی شقاوت چھپی ہوئی نہیں ہے؟ جن ملکوں میں لاکھوں عوام بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہیں اُنھیں اپنی سازشوں کے چنگل میں پھانس کر ہمسایہ ممالک سے ان کی عداوتوں کو راسخ کیا جاتا ہے تاکہ اِن غریب ملکوں کی ساری دولت ہتھیاروں کی خریداری کے نام پر ترقی یافتہ ممالک کے پاس پہنچتی رہے، پھر وہاں سے ترقیاتی منصوبوں میں امداد کے نام پر کچھ بھیک ان کو دی جاتی رہے اور اگر کسی مرحلے پر ایسا محسوس ہو کہ یہ ملک واقعی اقتصادی غلامی سے آزاد ہوا چاہتا ہے تو اس کے ہمسایے کو جنگ پر آمادہ کر کے سارے ترقیاتی منصوبوں کو چند روز میں تہس نہس کر دیا جائے تاکہ دونوں پھر اسی بھیک مانگنے والی پوزیشن میں آ کر کھڑے ہو جائیں۔ یہ استحصال کی نہایت شدید اور بھیانک شکل نہیں تو پھر کیا ہے؟

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ خیر ہو یا شر، اس کی مقدار مثقال ذرّہ سے لے کر عالم گیر تک ہو سکتی ہے۔ اسے آپ ایک فرد میں بھی ڈھونڈھ سکتے ہیں اور ملکوں یا قوموں میں بھی۔ شقاوت انسان کی ایک شدید قسم کی متعدّی بیماری ہے جسے آپ افراد میں بھی تلاش کر سکتے ہیں اور قوموں میں بھی۔ اور جتنا اس پر غور کریں گے یہ روشن ہوتا جائے گا کہ اس بیماری کو دور کیے بغیر نہ فرد فرد بنتا ہے، نہ قوم قوم ہو سکتی

ہے، نہ ملک ملک ہو سکتا ہے۔ اور اسے دور کرنا صرف اُسی روحانی کلچر کے ذریعے ممکن ہے جو مادّی کلچر کا تابع نہ ہو اور ایسا روحانی کلچر صرف اسلام کے پاس ہے جس کی ایک شفاف شکل کا نام تصوّف ہے۔

تصوّف کے لیے ابتدائی عہد میں ایک اصطلاح احسان استعمال ہوئی ہے اور حدیث احسان آپ سب حضرات کو مستحضر ہوگی۔ قرآن کریم نے بھی اس لفظ کا بار بار استعمال کیا ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان۔

اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اور وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔

میں نے اس کے معانی میں تھوڑا سا غور کیا تو ایسا اندازہ ہوا کہ جسے ہم شقاوت یا استحصال یا طمع کہتے ہیں، احسان کے معانی سے اس کے واہمہ کا احتمال بھی خارج کر دیا گیا ہے۔ احسان وہ نیکی ہے جو کسی لالچ یا غرض سے یا کسی معاوضے کے لیے نہ ہو۔ اسے یک طرفہ نیکی کہہ لیجیے۔ گویا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا میں مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض والدین سے تمھیں تکلیف پہنچے یا اُن سے کوئی راحت نہ پہنچی ہو، یا انھوں نے تم سے اچھا سلوک نہ کیا ہو، تب بھی تم اُن سے اچھا ہی سلوک کرو۔ اور اللہ سے یہ کہہ کر دعا مانگو کہ جس طرح انھوں نے میرے بچپن میں مجھے شفقت اور دِل سوزی سے پالا پوسا تھا، ان پر ایسی ہی رحمت و رافت کیجیو۔ یعنی بچپن میں والدین کا پرورش کرنا بھی کسی لوبھ لالچ سے نہ تھا، ایک بے غرض نیکی تھی، ایک فطری محبت تھی۔ اگر پرورش اولاد کسی غرض سے ہو تو انسان کبھی اولاد سے دست بردار ہو سکتا ہے، کبھی غرض سے۔ معلوم ہوا کہ والدین نے بھی احسان ہی کیا تھا۔

اسی طرح اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ جو کسی توقّع یا لالچ یا عوض کے بغیر کسی کے ساتھ نیکی کریں، اللہ اُن کے اس عملِ نیک کو ضائع نہیں جانے دیتا ہے۔ یعنی اُنھوں نے جو یک طرفہ نیکی کی تھی وہ مضاعف ہو کر اُنھیں مل ہی جاتی ہے۔

تصوّف بھی انھیں معنوں میں احسان ہے۔ یہاں طاعت و عبادت میں خوفِ سزا یا طمعِ جزا نہیں ہے۔ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تب بھی یہ سمجھو کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس کا ثمرہ استقامت ہے جسے فوق الکرامۃ کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ "الکرامۃ ھی الاستقامۃ علی باب الغیب" اور یہ بابِ غیب کیا ہے وہی احسان ہے۔

(۳)

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں یہ مادّی صنعتوں کا زمانہ ہے۔ دولت ہمیشہ پیداوار سے وابستہ ہوتی ہے۔ آج پیداوار کے ذرائع میں سب سے اہم اور افضل بھاری صنعتیں (Heavy Industries) ہیں، جو ساری دنیا کے معاشی نظام کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ فی الحال اس نظام میں کوئی خوش گوار تبدیلی پیدا کرنا ہم تیسری دنیا والوں کے لیے تقریباً محال نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اقتصادی انقلاب ایک بہت پیچیدہ عمل ہے، یہ کبھی ایک رات میں نہیں آتا۔ صدیوں تک اس کے بیج بوئے جاتے ہیں، فرد فرد کا سوچنے کا انداز آہستہ آہستہ بدلتا ہے۔ ایک عظیم اور پائیدار نصب العین ہی اس انقلاب کی شیرازہ بندی کرسکتا ہے۔ وہ نصب العین اسلام کے نظامِ حیات اور تصوّرِ اقدار کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، مگر اس میں نئی حرکت اور توانائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ نئی طاغوتی قوّتوں سے لوہا لے سکے۔ اس کے لیے نظریے کی صداقت پر یقینِ کامل اس لیے ضروری ہے کہ یقین کے بغیر وہ صبر و ثبات اور تحمّل پیدا نہیں ہوسکتا جو حق کو قائم کرنے کے لیے درکار ہے۔ اگر ہمارے پاس یہ دولت ہے تو ہمارے افکار میں قوّت اور ہمہ گیری پیدا ہوگی اور وہ جلد یا بدیر عام لوگوں پر بھی اثر کریں گے۔ یقین یہ ہے کہ ہم جس نظامِ حیات کو بشریت کے لیے صالح مانتے ہوں، اس کی افادیت کے بارے میں خود ہمارے ذہن شکوک و شبہات سے صاف ہوں اور جس طرح کا سماجی انقلاب ہم لانا چاہتے ہیں، دنیا کے لیے اس کے صحت مند اور نفع بخش ہونے میں بھی کوئی شک نہ ہو۔

فاسد نظام کی طاقت ان لوگوں کو بہت بڑی معلوم ہوتی ہے جو اس کی بُرائیوں کا شکار ہوتے ہیں لیکن بالآخر ایک صالح اور صحت مند نظامِ فکر ہی زیادہ توانا ثابت ہوتا ہے۔ خواہ اس کی توانائی ہماری زندگی میں بروئے کار نہ آئے۔

اس لیے کہ انسان کی تمام قوتوں میں اس کی فکر ہی سب سے زیادہ طاقت ور ہے جو ہر دوسری طاقت پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ افکار انسان کی جان سے بھی زیادہ قیمتی شے ہیں، اسی لیے تو ہم کسی نظریے کے پیچھے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں :

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اور

قِفْ دُونَ رائِكَ فی الحیاۃِ مُجاهِدًا
إنّ الحیاۃَ عقیدۃٌ وَجِهادٗ

جہاد کے معنی ظروف و احوال کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔ یہ سیاسی طاقت کے استحکام کے لیے بھی ہو سکتا ہے افکار و نظریات کی سیادت قائم کرنے کے لیے بھی۔ بالسّیف بھی، باللّسان بھی، بالقلم بھی، بالنّفس بھی۔ جہاد بالنفس کا مقصد شر کی قوت کو مغلوب کرنا اور معاشرے کا ایک ایسا صالح فرد بننا ہے جس کا رشتہ خدا سے بھی استوار ہو اور مخلوق سے بھی صحت مند ہو۔ زمین کو شر و فساد سے پاک کرنے کے لیے پہلے خود اپنے باطن کا تصفیہ اور قلب کا تجلیہ ضروری ہے۔ یعنی تصوّف مجاہدات کے ذریعے جو کچھ حاصل کرتا ہے اگر اُسے ہم اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں تو یہ ہمارا قصور ہے تصوّف کا نہیں۔ اس ماحصل کو ہم پورے مجموع کی خیر و برکت کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور مشائخ نے ایسا ہی کیا ہے۔

ہمارے دور کے ایک مفکّر نے بار بار تصوّف کو چُنیا بیگم (افیون) کہہ کر یاد کیا ہے یعنی یہ قوائے عمل کو شل کر دیتا ہے اور انسان کو ایک ایسی اَن بوجھی لذّت میں گم کر دیتا ہے جو اُسے مردم بیزار اور مضمحل بنا دیتی ہے۔ میں اس سے اتّفاق نہیں کرتا۔ اگر مردم بیزاری (Misanthropy) اور ترکِ علاقہ (Detach ment

(Allienation) کا نازک فرق اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ اعتراض خود رفع ہو جاتا ہے۔ تصوّف میں خلوت مردم بیزاری نہیں ہے، عرفانِ نفس کا ذریعہ ہے۔

انسان نے اجتماعی کوششوں سے شر و فساد تو پھیلایا ہے لیکن اصلاح و تعمیر کے سارے انقلابی خیالات نے خلوتوں ہی میں جنم لیا ہے۔ تنہائی ہماری فکری قوتوں کو مجتمع کرتی ہے اور ہمیں باطنی طور پر دُنیا پر غالب آنا سکھاتی ہے۔ اگر ہم خلوت بیزار ہیں تو نئے اور انقلابی افکار ہم سے بیزار رہیں گے لیکن اس خلوت کا مطلب بیزاری نہیں ہے۔ صوفیا اسی کو خلوت در انجمن، اور بے ہمہ و باہمہ ہونا کہتے ہیں۔

آج دنیا جس عصبی تناؤ سے گذر رہی ہے اس کا واحد علاج خلوت در انجمن ہی ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس خلوت کے ذکر و شغل کو تحسین علاقہ بالخالق کے لیے استعمال کریں یا تحسین علاقہ بالمخلوق کے لیے یا دونوں مقاصد کے لیے۔

(۴)

## تصوّف اور سماجی انقلاب

سماجی انقلاب میں ہمارا رول کیا ہو سکتا ہے؟ بظاہر تو کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سماجی بُرائیوں کا منبع کہیں اور ہی ہے۔ نظامِ اقتصاد تو ہمارے ہاتھوں سے نکلا ہی تھا۔ ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت بھی سمٹ کر محدود ہو چکا ہے اور بظاہر اس میں نئی روح پھونکنے اور اُسے رائج کر کے بامقصد اور مفید بنانے کا کام اب چند افراد کے بس میں نہیں رہا ہے۔ ان دونوں محاذوں پر ہماری پسپائی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بُرائی کو دیکھ رہے ہیں بلکہ بُھگت رہے ہیں مگر فوری طور پر اپنے دستیاب ذرائع سے اس کی بیخ کنی نہیں کر سکتے۔

برٹرنڈ رسل کہتا ہے کہ ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ دنیا پر اشرار کی حکومت ہے اور اس کو ایک دن میں بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ہماری امیدیں صرف کسی غیبی نجات دہندہ سے وابستہ نہیں ہونی چاہئیں بلکہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے

افکار، بہت سے لوگوں کے معتقدات بن جائیں۔ استقامت اور ثباتِ عقیدہ کے لیے صبر و تحمّل اور قناعت و توکّل ضروری ہیں۔ عقیدہ اگر ہاتھ سے گیا تو ہم اس سیلابِ بلا میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ قرآن کریم نے سورۂ والعصر میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس مختصر سی سورہ کی تشریح ہزاروں صفحات میں ہو سکتی ہے اور یہ ہر دور میں سماجی انقلاب کے لیے ایک ایسا دائمی ضابطہ ہے جس سے انسانیت کو روشنی ملتی رہے گی۔

جو مصلحین یا مفکّرین دنیا پر اپنے خیالات کی سیادت چاہتے ہیں انھیں پہلے مرحلے میں مروّجہ نظامِ اقدار سے خود کو بے تعلّق بھی کرنا پڑتا ہے، اگرچہ وہ اس نظام کی بُرائیوں کو بُھگتتے بھی ہیں تبھی ان کی گہرائی میں چُھپی ہوئی وہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں جو دوسروں کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکیں اور ایک نیا نظام قائم کرنے کے لیے راستہ ہموار کر سکیں۔

ترکِ اختلاط مع الانام یہی خلوت در انجمن ہے۔ اسے نفرت یا بیزاری کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کو عمل میں لانا اور خفی امتیازات کو قائم رکھنا سخت دشوار ہے۔ انفرادی یا اجتماعی فلاح کے راستے بھی مجاہدے کی شروط سے مشروط کر دیے گئے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

یہاں سُبُلَنَا بطرزِ جمع آیا ہے۔ اس کی معنوی بلاغت سے سرسری نہیں گذرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بدلتے ہوئے سماج میں ہر وہ راستہ جو روحِ اسلام اور شریعتِ حقّہ کے خلاف نہیں ہے، سُبلنا اس کو محیط ہے۔

ہماری دنیا میں سانس لینے والے نوجوان اگر اس نظامِ فاسد کا شکار ہو گئے جو اعصابی ہیجان، فکری و عملی تضادات اور یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ کی دنیا ہے، اگر وہ اس سیاسی، معاشی، اخلاقی اور جنسی نظامِ اقدار سے مطمئن اور اپنے فوری مقاصد اس سے حاصل کرنے پر رضامند ہیں اور غایتِ اقصیٰ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں تو یہ جان رکھیں کہ ایک پُشت کی غفلت کم سے کم تین پشتوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اگر وہ

فوری حاصل ہونے والے فوائد سے دست بردار ہو جائیں اور فاسد نظام سے ترکِ تعلق اختیار کر کے مجاہدہ کرتے رہیں تو خواہ اُس کے ثمرات ہمیں نہ ملیں، ہمارے بعد آنے والوں کو ضرور ملیں گے۔ نئے حالات کے ہیجان سے نپٹنے کے لیے میں تصوّف کی ضرورت اسی لیے سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیں طہارتِ باطنی کے ساتھ تامّل و فکر کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ایک فاسد نظام میں رہ کر بھی ہم ذہنی طور پر اس سے بے تعلّق ہو سکتے ہیں۔ یہی بیسویں صدی کے ترک کا تصوّر ہے۔ اس طرح انجمنوں کے ہنگاموں میں بھی ہماری وہ خلوت زیر و زبر نہ ہوگی جو ایک صالح معاشرے پر ہمارے ایمان کو مستقیم رکھ سکے اور صالح افکار کی روشنی کو آہستہ آہستہ فرد سے فرد تک پہنچا سکے۔

میرے نزدیک تصوّف کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ بال بڑھا لیے جائیں، کپڑے رنگ لیے جائیں، کچھ اوراد و وظائف کو معمول بنا لیا جائے اور حلقۂ ارادت مندوں کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی ترکیبیں سوچی جائیں۔ تصوّف ایک اخلاقی رویّہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک خاص عینک سے اپنی دنیا کو دیکھنے اور اپنی شخصیت کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔ یہ ان حدود کا نام بھی ہے جو ہم اپنے اور مفاسدِ کائنات کے درمیان قائم کر سکتے ہیں۔

کوئی معاشرتی انقلابی کوشش اس وقت تک بامعنی نہیں ہوتی جب تک وہ بہتر متبادل نظام تجویز نہ کرے۔ یہ متبادل نظام خود بھی محدود ہو سکتا ہے یا دوسروں کے لیے اتنا ہی ناقابلِ قبول یا تکلیف دہ ہو سکتا ہے جتنا مادہ پرستوں کا دیا ہوا فاسد نظام ہمارے لیے ہے۔ آج کے معاشرتی نظام مذہب، اخلاق، روحانیات، قانون، اور عالم گیر انسانی اقدار سے منقطع ہو کر سیاست اور اقتصادیات سے مربوط ہو گئے ہیں۔ تصوّف اسلام سے مختلف نہیں ہے لیکن اُس کی بنیادیں اسلام کے اُن تصوّرات سے پختہ کی گئی ہیں جو عالم گیر انسانی اقدار سے عبارت ہی نہیں اُن پر کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے اسلام کا وہی فلاحی معاشرہ، ایک ہندستان جیسی سیکولر سوسائٹی

کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے جس کی تعمیر کے لیے تصوّف کے پلیٹ فارم سے ندا دی جائے۔

مسلمان اس وقت تیسری دنیا کی سب سے بڑی افرادی طاقت ہیں اور ہندستان جیسے ممالک میں وہ ایک مخلوط معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ وہ خود اپنے معاشرے میں اور سائنس کی ایجادات سے مالا مال دنیا کے سامنے خود کو کس طرح پیش کریں؟ ہمارا کہنا یہ ہے کہ:

"انظروا الی ماقیل ولا تنظروا الی من قال"

مادّہ پرست، سائنس زدہ مشینوں کے درمیان خود مشین بن جانے والے انسان یہ دیکھیں کہ ساری بشریت کے لیے ان کے پاس کیا ہے اور ہمارے پاس کیا ہے؟ اور اس کی افادیت کا فیصلہ حال سے نہیں ہوگا مآل سے ہوگا۔ پھر یہ دیکھو کہ اپنے ماضی میں ہم نے مستقبل کو کیا دیا تھا اور تم آج ہمارے مستقبل کو کیا دے کر جا رہے ہو۔ یہ ساری چہل پہل، یہ چمک دمک، یہ عیش و تنعّم کے سامان دیکھ کر دُنیا رِیجھ رہی ہے لیکن اس پر کسی کی نظر نہیں جاتی کہ اسی مادّی تہذیب نے خود مغربی اداروں کے اندازے کے مطابق ۵۰ ہزار ایٹمی ہتھیار بنا کر ساری دنیا میں پھیلا دیے ہیں جس میں بعض اتنے طاقت ور ہیں کہ چشم زدن میں اس کرّۂ زمین کو نظامِ شمسی کے دائرے سے نکال کر پھینک سکتے ہیں۔ کیا یہ فساد فی الارض نہیں ہے؟ کیا یہ انسانیت کی، خدا کی، اخلاق کی، کائنات کی، کسی کی بھی کوئی خدمت ہے؟ لیکن خدا کی شان کہ پھر بھی وہ ترقی یافتہ ہیں، ہم پس ماندہ ہیں:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بقول اکبر الٰہ آبادی:

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

آج کی نوخیز نسلوں کو آگے چل کر جس دنیا سے عملی سابقہ پڑے گا اُس میں مہلک ہتھیاروں

کی تعداد اور بڑھ چکی ہوگی، عصبی تناؤ بھی زیادہ ہو جائے گا، استحصال اور استضعاف کے بھی نت نئے طریقے ایجاد ہوں گے، اور وہ یہ بھی دیکھیں گے کہ مادّہ پرست دُنیا میں مذہب کی قوت انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے میں بے بس ہوگی، اس لیے کہ اُنھوں نے مذہب کو بھی مادّے کا تابع کرلیا ہے۔ لیکن یہ بھی نہ بھولیے کہ دنیا کو شر اور فساد سے اُس وقت بھرا گیا ہے جب وہ امّت وسط جو (Witness) بنائی گئی تھی اپنے منصب سے غافل ہوگئی۔ شریعت کا ابدی قانون برحق، لیکن وہ یہ کیوں بھول گئی کہ قانون کے ساتھ قوت تنقید بھی اتنی ہی ضروری ہے، ورنہ قانون صرف ایک کاغذی پیرہن میں نقش فریادی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری جن اخلاقی کمزوریوں اور سہل انگاریوں نے اس کا موقع دیا ہے، اُنھیں کا قلع قمع کرکے اس شر کو مزید انتشار سے روکا جاسکتا ہے۔

سئمتُ وَ امسیتُ رَھنَ الفِراش — مِنْ جُرمِ قَومی وَ من مَغرَم
وَمِنْ سَفَهِ الرّائِ بَعْدَ النُّهیٰ — وَعَیبِ الرَّشادِ وَ لَمْ یُفھَم
فَلَوْاَنَّ قَومی اَطاعُوا الحَلِیمَ — لَمْ یَتَعَدَّوا ، وَ لَمْ یُظلَم
وَلٰکِنَّ قَومی اَطَاعُوا الغُواۃَ — حَتّٰی تعکّسَ اَھلُ الدَّم
فَاَودَی السَّفیهُ بِرَاْیِ الحَلِیمِ — وَانتَشَرَ الاَمرُ، وَلَمْ یُبرَم

یہ مفسد مادّہ پرست طاقتیں اپنی تعمیر کے لیے تیسری دنیا کی صلاحیتوں کا خام مال کا اور افرادی قوتوں کا خوب استحصال کر رہی ہیں مگر تیسری دنیا کو کیا دے رہی ہیں، مہلک ہتھیار، مسموم اخلاق اور انفس و آفاق کی حقیقتوں سے غافل کرنے والے لہو و لعب کے سامان۔

ان مادّی وسائل کے نرغے میں روحانی بلندی حاصل کرنے کے لیے ریاضت کرنا ایک صالح مقصدیت کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ مقصدیت ہی قوائے انسانی کی شیرازہ بندی کرسکتی ہے۔ آج کی دنیا اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے اتنی کوشاں نہیں ہے جتنا وہ دوسروں کو غلام بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ غلامی کی بھی صورت ایسی

بدل دی گئی ہے کہ اس میں اور آزادی میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ان حالات میں جو چیز تحفّظ کے لائق ہے وہ اپنی اندرونی آزادی ہے۔ روح کی آزادی، دل اور دماغ کی آزادی ـــــ افکار و نظریات کی سلامتی اور قلبِ سلیم کی حفاظت ـــــ اس کے لیے ہمارے اطراف میں پھیلے ہوئے موانع اور مفاسد اتنے ہیں کہ جب تک ہم اپنے اندر ایک صوفی پیدا نہ کرلیں، ان موتیوں کی آبرو نہیں بچا سکتے۔

بیرونی انتشار، بحران اور آزمایشوں میں ہمارے اندر کی دنیا کا سالم رہنا بہت ضروری ہے۔ انسان اگر اندر سے بکھر جاتا ہے تو مشکل ہی سے کوئی نظریہ اُسے سہارا دے سکتا ہے، اس لیے کہ کسی نظریے کو اس کے دل و دماغ میں پاؤں جمانے کے لیے جگہ ہی نہیں ملتی۔

سائنس مظاہرِ کائنات کی تحقیق کر رہی ہے اور مادّی وسائل کی تمام پوشیدہ قوتوں کو دریافت کر کے اُن سے کام لینا چاہتی ہے۔ فلسفہ کائنات اور انسان کا رشتہ دریافت کرتا ہے، مذہب انسان اور انسان، انسان اور کائنات، انسان اور خالقِ کائنات یا حقیقتِ مطلقہ کے باہمی تعلق کی دریافت کرتا ہے۔ لیکن تصوّف نے اپنی تلاش کا دائرہ نفسِ انسانی کی ماہیت سے حقیقتِ مطلقہ کی کُنہ تک اور مظاہرِ طبیعی سے ماورائے کائنات تک وسیع کر دیا ہے۔ اس کی بنیادی کوشش تہذیبِ نفس اور تطہیرِ اخلاق کی ہے جس کے بغیر اپنا عرفان بھی ممکن نہیں:

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

کا شاید یہ مفہوم بھی ہے۔ ہمارے قدما نے مباحث تصوّف کو جبر و قدر، کثرت و وحدت، حدوث و قدوم جیسے مسائل تک محدود رکھا۔ حالاں کہ تصوّف کو ہمارے اجتماعی اور عمرانی مسائل سے بھی اتنی ہی دل چسپی ہو سکتی ہے جتنی ماورائی اور مجرد مباحث سے رہی ہے اور اس طرح ہم انسان اور کائنات کے رشتوں کی نئی تعبیریں کر سکتے ہیں۔

فلسفہ یا سائنس تصوّف کی ضد نہیں ہیں البتہ یہ تصوّف کو عاجز سمجھنے میں غلطی پر رہے ہیں۔ اقبال نے اپنے لکچرز میں صحیح لکھا ہے کہ علمائے نفسیات اور فلاسفہ

اپنی علمی تحقیقات اور تجزیہ و تحلیل کی بدولت جن اسرار تک پہنچے ہیں وہ تسلیم، مگر ابن عربی، غزالی یا مجدّد الف ثانی نے اپنے مکاشفات کے ذریعے جن عالموں کا کھوج کیا ہے ان کی ہَوا بھی ان علمائے مغرب کو نہیں لگی۔ فلسفی غور و فکر سے اور سائنسداں تحقیق و تجسّس سے جن سرائر تک پہنچتا ہے ایک پاک باطن صوفی کا کشف (جس کی بنیاد جلائے روحانی اور مجاہدۂ نفس پر ہے) اُسے اُن مقامات تک پہنچا دیتا ہے جہاں تک علم ظاہری کی آج بھی رسائی نہیں ہے۔

انسانی علوم میں سب سے کم عمر علم النّفس (سائیکالوجی) ہے جو انسانی رویّہ (Human Behaviour) سے بحث کرتا ہے اور رویّہ زندہ انسانوں کا زندوں ہی سے ہوتا ہے۔ زندگی جسم و روح سے عبارت ہے، اس لیے علم النفس کے ذیل میں جسم سے زیادہ روح آتی ہے۔ جس طرح عربی میں نفس روح اور دماغ دونوں کے لیے ہے اسی طرح لفظ (Spirit) بھی دونوں کو محیط ہے۔ عہدِ جدید میں تصوّف کی نئی اور بامقصد تعبیر کے لیے ہمیں علم النفس اور تصوّف کا مقارنہ بہت گہرے اور دلچسپ نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ تصوّف ایک ذہنی رویّہ بھی ہے اور اس اعتبار سے وہ علم النفس کا ایک بہت ہی اہم شعبہ بن جاتا ہے۔ اسے علم النفس سے مربوط کر کے ہم تصوّف میں اپنے قدما کی تحقیق و تلاش کو اور آگے تک لے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے تصوّف کو فلسفے سے جوڑا تھا مگر فلسفہ اپنے پائے چوبیں لے کر بہت دور تک تصوّف کے ساتھ نہیں چل سکا۔ نفسیات کا موضوع حقیقتِ نفس ہے۔ طریقے مختلف ہوں، نتائج جداگانہ ہوں مگر موضوع واحد ہے۔ آج کے سائنس داں کھوجتے کھوجتے اس حقیقت کی طرف آ رہے ہیں کہ ساری کائنات میں ایک ہی حقیقت کارفرما ہے۔ کیا عجب ہے کہ نفسیاتی تحلیل و تلقین کے قواعد ہمیں لطائف و مکاشفات کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتا دیں جنھیں ابھی تک سرحدِ ادراک سے پرے سمجھا جاتا ہے۔

جدید علم النفس Ego انا احساس برتری اور احساس کمتری کا بہت گہرائی تک تجزیہ کیا گیا ہے۔ Ego کا موازنہ خودی سے اور احساس کمتری کا فنائیت سے

کیا جائے تو اس کے بھی بہت دل چسپ نتائج برآمد ہوں گے۔ تصوّف میں فنائے نفس اور تحقیرِ نفس کی جو اہمیت ہے اس سے آپ خوب واقف ہیں۔ ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ایڈلر کہتا ہے کہ احساسِ کمتری ہی انسانی کامیابی اور رفعت کی بنیاد ہے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ اس احساس سے جو خلا (Vaccum) پیدا ہوتا ہے انسان اسے بھرنے کی جد و جہد ہی میں بڑا آدمی بنتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں: احساسِ کمتری جب حد سے بڑھ جائے تو غرور و تکبّر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تصوّف میں فنائے نفس کے بعد بقا باللہ کی منزل ہے اور یہاں بھی سالک کی خودی انا الحق کہتی ہوئی بیدار ہوتی ہے۔

نفسیات کہتی ہے کہ انسان کو خود اپنی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کے بغیر وجود کی بلندیوں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مراقبہ نفس سے مراد مطالعۂ نفس نہیں تو کیا ہے؟ نفسیات کی رُو سے ہر خفی سے خفی حرکت کے پیچھے کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، وہ مقصد ہی حرکت کا سبب بنتا ہے۔

"لا تتحرك ذرّة الّا باذن الله"

میں اذنِ فطرت سے مقصدیت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

جدید نفسیات کہتی ہے کہ ہم فطرت سے جتنا دور ہوں گے زندگی اتنی ہی پیچیدہ اور مشکل ہوتی جائے گی۔ فطرت زخارف سے بے نیاز ہے:

قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے؟

تصوّف میں ترک سے مطلب ترکِ زخارف ہے تاکہ ہم فطرت سے قریب رہیں، قلبِ سلیم قلبِ فطرت شناس ہوتا ہے جو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر سکتا ہے۔ قرآن نے مال و بنون کو بھی زخارف میں شمار کیا ہے۔ جب ہم اپنی بنائی ہوئی معاشرت سے نکلیں گے اور فطرت کے مواجہ میں آئیں گے تو وہاں اِن زخارف کی کوئی قدر و قیمت متعیّن نہیں ہو گی: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔

قلب سلیم کی حفاظت مراقبہ اور توجہ سے کی جاتی ہے —— جدید نفسیات (Treatment) اور ماحول اور صحبت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے حتیٰ کہ ایک نفسیاتی طریقہ تلقین کا بھی ہے جسے (Suggestion) کہا جاتا ہے۔ بچہ جب بطنِ مادر میں ہوتا ہے اس وقت ماں جس ماحول میں رہتی ہے، جو چیزیں دیکھتی ہے، جو باتیں سنتی ہے وہ سب جنین کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر زمانۂ حمل میں ماں کو خاص نہج پر تلقین کی جائے، مثلاً اُسے آرٹ کے اچھے نمونے دکھائے جائیں، یا موسیقی زیادہ سنوائی جائے تو بچہ بھی باشعور ہوکر آرٹ اور موسیقی کی طرف مائل ہوگا۔ اگر بہت سے لوگ مختلف اوقات میں بار بار کسی حسین شخص سے یہ کہتے رہیں کہ وہ بدصورت ہے، تو نہ صرف وہ اپنے تئیں بدصورت سمجھنے لگے گا بلکہ رفتہ رفتہ ہو بھی جائے گا۔ والعکس فالعکس۔ آج جدید سائنس تلقین اور توجہ کو اپنا بڑا کارنامہ سمجھ رہی ہے اور (Labs) میں اس کے تجربے کیے جا رہے ہیں جن کے مثبت نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ ہمارے صوفیا کی خانقاہوں میں مراقبہ اور توجہ کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود تصوّف ہے۔ اور اس "توجہ" نے شخصی کردار میں کیسے انقلاب پیدا کیے ہیں، اس کی مثالوں سے سیر و سوانح کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اسی طرح تاثیرِ صحبت سے نہ اسلام غافل رہا ہے نہ تصوّف۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "کُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ" اور صوفیا کہتے ہیں: "المرء مع من احبّ" —— اتّباعِ سنّت پر تاکید کرنے کا راز بھی یہی ہے۔ صحبت اتنا موثر عامل ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا: اگر کسی شخص کے بارے میں جاننا ہو کہ وہ کیسا آدمی ہے تو اس کے ہم صحبتوں کو دیکھو۔ جیسا انسان ہوگا ویسے ہی رفیق تلاش کرے گا۔ خانقاہ اور جماعت خانوں کا مقصد بھی صحبتِ ہم جنس کے مواقع فراہم کرنا تھا۔

امیر حسن دہلوی کا قصہ آپ نے سنا ہوگا: یہ اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک پر گئے ہوئے تھے اور وہاں مے نوشی کر رہے تھے، اس حالت میں حضرت نظام الدین اولیا سے ملاقات ہوگئی۔ یہ بہت شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے:

سالہا باشد کہ ما ہم صحبتیم
گر اثر باشد زصحبت ہا کجاست

حضرت نے فرمایا: ”در صحبت اثر ہاست۔“ بس ایک ہی جملہ کام کر گیا۔ پھر تو امیر حسن کی دنیا ہی دگرگوں ہو گئی۔ بارہ سال تک حضرت کے ملفوظات لکھتے رہے جو فوائد الفواد کے نام سے ادب ملفوظ میں ایک بے بہا خزانے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ملفوظات کے مسوّدے پر حضرت نے ترمیم و اصلاح فرمائی تھی وہ مسوّدے اتنے عزیز تھے کہ امیر حسن نے اُنھیں بھی اپنے برابر ایک قبر میں دفن کرالیا ہے۔

(۵)

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں عالمی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھنی ہے اور مادّہ پرست ہیجان انگیز تہذیب کے مفاسد سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھنے کے لیے تربیتِ نفس اور تہذیبِ اخلاق پر توجہ دینا ہے تاکہ بشریت کی فلاح کے ابدی قانون شریعتِ اسلامی کو مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک سکولر سوسائٹی کے لیے بھی قابلِ قبول بنا سکیں۔ اس کے لیے فکری سطح پر ایک سماجی تبدیلی کی ضرورت ہوگی اور اس تبدیلی کے لانے اور گوارا بنانے میں سب سے اہم رول تصوّفِ اسلامی ادا کرسکتا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے بھی اور عملی شکل میں بھی۔ اس لیے ہمیں دوسرے علمی اور تہذیبی اداروں کی طرح خانقاہوں کو بھی منظّم کرنا ہوگا۔

[توسیعی خطبہ جو ۱۹۸۲ء میں طلبائے دارالعلوم
ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سامنے پڑھا گیا۔]

# تصوّف اسلامی نظریہ اور تطبیق

شمس العلماء، مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے سالانہ عرس کے موقع پر حسب دستور یہ سمینار منعقد ہو رہا ہے اور میں دہلی سے کالے کوسوں پر کالی کٹ میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ صوفیاء شاید اسی کو "ہجرت در وطن" کہتے ہیں۔ مگر ہجر و وصل، قرب و بُعد یہ سب اضافتیں ہمارے عالمِ ادراک کی سرحدیں ہیں اور تصوّف ہمیں جس عالم کی سیر کراتا ہے وہاں ان اضافتوں کا ساقط ہو جانا ہی "عرفان" ہے۔ میر کہتا ہے:

وصل و ہجراں یہ جو دو راہیں ہیں، شہرِ عشق میں
دلِ غریب ان میں، خدا جانے، کہاں مارا گیا

"دل" یہاں خودی کی علامت ہے، اور خودی کی نفی کا مقام حاصل ہونے کے لیے، ہجر و وصل دونوں برابر ہیں۔ میر ہی کہتا ہے۔

قرب و بُعد اس جا برابر ہیں، محبّت چاہیے

اس سمینار میں شرکت اور اس کی صدارت کے لیے پروفیسر انا ماری شمل نے گزشتہ سال ہی وعدہ فرمایا تھا۔ اور مجھے بے حد خوشی ہے کہ انھوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے اس سال شرکت کا وقت نکالا۔ ان کی تشریف آوری سے بلاشبہ یہ سمینار "بین الاقوامی" ہو گیا ہے۔ کیونکہ پروفیسر شمل خود بین الاقوامی شخصیت کی مالک ہیں۔ انھوں نے تصوّفِ اسلامی کی معنویت پر جس عالمانہ بصیرت اور صوفیانہ وجدان کے ساتھ کام کیا ہے۔ عہد حاضر میں اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی،

اور خواتین میں تو بالکل نہیں ملے گی۔ پروفیسر شمل نے تصوف کے صرف نظری Theoretical پہلو ہی کا مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی تطبیق یا Application کو بھی ذاتی تجربہ کی سطح پر پرکھنا چاہا ہے، اسی لیے وہ عموماً غلط نتائج تک پہنچنے سے محفوظ رہتی ہیں۔ تصوف میں ان کے کام کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اس مجلس مقالات کے لیے یہ موضوع تجویز کیا تھا کہ "اسلامی تصوف کا نظریہ اور عمل" دونوں پہلوؤں سے مطالعہ کیا جائے۔

چونکہ یہ جلسہ حضرت خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمۃ کے عرس پر منعقد ہو رہا ہے، اس لحاظ سے یہ بھی ضروری تھا کہ تصوّف کے نظری اور عملی پہلوؤں پر خواجہ صاحب مرحوم کے نظریات کا جائزہ بھی لیا جائے۔ طے یہ ہوا تھا کہ خواجہ صاحب کے نظریاتی تصوف پر' ان کی تحریروں کی روشنی میں' ایک جائزہ میرا لکھا ہوا خاص اس جلسے کے لیے ہوگا۔ اور "عملی تصوف" پر حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی ایک مقالہ تحریر فرمائیں گے۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرے ساتھ یہاں یہ دشواری ہے کہ کالی کٹ میں تصوّف دوا میں ڈالنے کو بھی دستیاب نہیں ہے۔ تصوّف میں "قربِ نوافل" اصل کار ہے' جس سے بِیْ یَسْمَعُ و بِیْ یَبْصُرُ کا مقام حاصل ہوتا ہے' مگر یہاں آکر "بُعدِ نوافل" کا تجربہ ہوا، نماز کے بعد نوافل کا رواج سرے سے نہیں ہے۔ نہ تصوف پر کوئی کتاب ہے' نہ اہل کتاب ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کی تصانیف تو کیا دستیاب ہوں پورے علاقے میں ان کی زبان کا ہی گذر نہیں ہے۔ اس لیے میں صرف "تاثرات" کو مشّاقی کے بل بوتے پر بیان کرسکتا ہوں۔ اگرچہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ خواجہ صاحبؒ کی نصف صدی پر پھیلی ہوئی تحریریں کی مدد سے ایک واضح تصویر پیش کرتا کہ وہ اسلامی تصوّف کو نظریات کی سطح پر کس طرح دیکھتے تھے۔ اور یہ تصویر ان کی تحریروں سے رنگ حاصل کیے بغیر نہیں ابھاری جاسکتی۔ خیر اسے "فرداشب" کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

لیکن اگر حسب قرار داد میرے محترم حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی مدّظلّہٗ نے "عملی تصوف" کی سطح پر حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے فکر و عمل کا جائزہ لیا ہے تو اس کے بین السطور میں اصول و نظریات کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں رہتا۔ اگر انھوں نے نہیں لکھا ہے تب بھی ان کے موضوع کو "بلاقیدِ لفظ و بیان" اور "پاے سخن" کو درمیان لائے بغیر سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم خود کیسے صوفی تھے اور کیسے صوفی پیدا کرنا چاہتے تھے اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ خود حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کی دلنواز شخصیت

میں موجود ہے۔ اس لیے اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے اسٹیج پر خاموشی سے آکر بیٹھ جائیں تو ان کے مقالے کا موضوع ایک ہی نگاہ میں آپ دیکھ لیں گے۔ مگر مجھے لفاظی کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ "گفتار کے غازی" اور "کردار کے غازی" کا فرق ہے اور یہی فرق علم ظاہر و باطن کا ہے اور یہی فاصلہ مدرسہ اور خانقاہ کے بیچ میں ہے۔

مناسب ہوگا کہ پہلے یہاں اختصار کے ساتھ تصوف اسلامی کی غایت اور فکری بنیادوں پر کچھ اصولی باتیں بیان کر دی جائیں۔

تصوف کا ہدف ارادۂ انسانی ہے۔ ارادہ کا تعلق علمار قدیم کے بقول "دل" سے اور علمار جدید کے مطابق دماغ سے ہے۔ لیکن وہ قوّت جسے راہ پر لگانا اور اس سے کام لینا ہے وہ قوّت ارادی ہی ہے اور صوفیا سمجھتے ہیں کہ "حقیقت" جو ہزاروں لاکھوں حجابات میں مستور ہے، اس تک پہنچنے کی ہمت اور ان حجابات کو اٹھانے کا حوصلہ انسان کا "ارادہ" ہی کر سکتا ہے۔ یہ قوّت ایسی زبردست اور ناقابل تسخیر ہے کہ امام الاولیا حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا: عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ (میں نے اپنے ارادوں کی شکست سے خدا کو پہچانا۔) یعنی انسان کے ارادے کی قوت کو جو شکست دے سکے وہی Supreme Being ہو سکتا ہے۔

اس قوت کا تعلق مرید سے ہے اس لیے ارادہ کو مرید کا فعل کہا جاتا ہے۔ مرشد کسی میں یہ قوّت پیدا نہیں کر سکتا، پہلے سے موجود ہو تو اسے صحیح راہ پر لگا سکتا ہے۔ اسے ضائع ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اس قوت کے استعمال کی چند بنیادی شرطیں ہیں:

پہلی شرط "تطہیر قلب" ہے۔ خواہشات جتنی مختلف اور متفرق ہوں گی، اتنا ہی انتشار اور پراگندگی پیدا کریں گی۔ انتشارِ ذہنی کے عالم میں تو گناہ کی لذت بھی نہیں مل سکتی، طاعت کا ذوق تو کیا ملے گا:

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے، نہ لذّت گناہ میں

لہٰذا صفائے قلب اور کشفِ روح کے حصول کے لیے خواہشات کی کدورتوں کا دور کرنا ضروری ہوا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف دروں بینی ان معنوں میں سکھاتا ہے کہ باہر کی حقیقی دنیا سے انسان کا رشتہ منقطع ہو جائے۔ وہ زندگی کی جائز نعمتوں اور لذتوں سے بھی خود کو محروم کر لے۔ عام انسانوں سے الگ تھلگ

ہوجائے اور اپنے نفس کو اذیت دے کر لذت اٹھاتا رہے، وہ دراصل الٹا مطالعہ کرتے ہیں، یعنی جو نمونے دیکھتے ہیں ان سے Theory کو سمجھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اصول اور افکار کو ان کی مجرّد حالت میں سمجھ کر ان کی تطبیق مثالوں پر کریں تو بہت سی مثالوں کا غلط ہونا خود ان پر واضح ہوجائے گا۔

پہلا مغالطہ یہی ہے کہ ہم صوفی کا Image ہی اپنے ذہن میں غلط لیے پھرتے ہیں۔ اور کبھی یہ تصور نہیں کرسکتے کہ ایک صوفی ہر اعتبار سے عام انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ الّا یہ کہ اس کے قلب کی دنیا عام انسانوں سے مختلف ہوگی۔ اس کی شادی او رغم کے پیمانے جدا ہوں گے۔ سود و زیاں کے معیار دوسرے ہوں گے۔

صوفیا کہتے ہیں کہ حصولِ یقین کے لیے خواہشات دنیا پر غالب آنا ضروری ہے، اس کے بغیر تطہیر قلب نہیں ہوسکتی، اور قلب کی پاکیزگی کے بغیر نورِ عرفان تجلی نہیں کرسکتا۔ اس میں کلیدی لفظ "غالب" آنا ہی ہے۔ عام انسان خواہشات دنیا سے "مغلوب" ہوتے ہیں، صوفی ان پر "غالب" ہوتا ہے اور یہ غلبہ اسے ارادہ سے حاصل ہوتا ہے —— وکٹر ہیوگو Victor Hugo کہتا ہے:

"انسان کا قلب کبھی غلطی نہیں کرتا، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ زائل ہوجانے والے سپنوں کی طرح ہے۔ جو اپنے دل کو حقیقی محبت کے انوار سے بھر لے گا اسے اندازہ ہوگا کہ اس کا مامن و مسکن اس دنیا سے ماورا، کہیں ہے۔ اور اس کے قلب کو اس زندگی سے مختلف ایک زندگی ملتی ہے۔"

یہ تو ایک مغربی مفکر کا روحانی تجربہ ہے۔ ابن قیمّ الجوزی کہتے ہیں کہ قلب میں دو قوتیں ہیں: ایک علم و تمیز کی قوّت، دوسری ارادۃ اور محبت کی قوت۔ جو ان دونوں قوتوں کا صحیح استعمال کرسکے وہ قوت تمیز سے حق کا ادراک کرتا ہے اور قوت ارادۃ و محبت سے اس کی طلب کرتا ہے، باطل اس کی نظر میں ہیچ ہوجاتا ہے۔

کائنات میں ہمارے چاروں طرف جو ڈراما ہو رہا ہے یہ جنگ خیر و شر ہی تو ہے۔ دوامی جنگ جتنی کہ "ثنویت" کے مذاہب۔ جیسے زردشتی مذہب۔ اس نتیجے تک پہنچ کر رہ گئے کہ یہاں ۲ خدا ہیں۔ یزدان اور اہرمن اور دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ بہرحال حق اور باطل ۲ مظاہر موجود ہیں اور یہ بالکل واضح بھی نہیں ہیں، کبھی حق باطل سا معلوم ہوتا ہے، مگر فی الواقع وہ حق ہوتا ہے اور کبھی باطل ہمارے سامنے حق کا لبادہ پہن کر آجاتا ہے، باطل میں زینت اور کشش کا پہلو بھی زیادہ ہے، اس لیے نفس کا میلان اس کی طرف ہوتا ہے۔

اصل اصول یہ ہے کہ حق و باطل میں تمیز پیدا ہو۔ یہ تمیز قوتِ علمیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ

تمیز ہو جائے تو حق میں کتنے ہی جوکھم ہوں، اس کی طلب کرے اور باطل میں کیسی ہی کشش کیوں نہ ہو اس سے دامن بچائے۔ یہاں محبت کی ضرورت ہوگی اور طلب کے لیے ارادہ درکار ہوگا۔

یہ جنگ خیر و شر، یہ معرکۂ حق و باطل آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ بقول اقبال :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

آج کا مسئلہ صرف "توحید" اور "شرک" یا پتھر کے خدا اور غیر مجسّم خدا کے درمیان فرق و امتیاز کا نہیں ہے بلکہ دو معنویتوں کے درمیان بنیادی فرق کا مسئلہ ہے۔ ہم زندگی کو کس طرح برتنا چاہتے ہیں اور وہ کیسے برتی جارہی ہے۔ ہم کس فلسفے کی سیادت میں یقین رکھتے ہیں۔ اور کون سے نظریات ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ انسان کے لیے ہمارا امثالی معاشرہ کیا ہے جہاں وہ اپنے مرجع اصلی سے قریب تر ہو کر جی سکے اور اس معاشرے میں کیا کیا باطل ہے، جس معاشرہ نے انسان کے لیے ساری کائنات کے پٹ کھول دیے ہیں مگر اس کے دل کا دروازہ بند کر دیا ہے

تصوّف کوئی "مذہب" نہیں ہے۔ نہ صوفیا کوئی "فرقہ" ہیں۔ دائرۂ تصوّف میں آنے کے لیے ہمیں کچھ لینا دینا بھی نہیں ہے۔ یہ ایک زاویہ نگاہ ہے۔ ایک Attitude ہے۔ اور اس کے عناصر ترکیبی میں علم، تمیز، محبت، ارادت اور طلب شامل ہیں۔ یہ طلب بھی "خیر محض" کی ہے حور و قصور کی نہیں۔ جسے قرآنی اصطلاح میں "طلبِ وجہِ رب" کہا گیا ہے۔ یہ تو اختصار کے ساتھ تصوفِ اسلامی کی فلسفیانہ اساس ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب نہ صوفیا باقی ہیں، نہ "خیر محض" کی یہ طلب ہے۔ ایسا کیوں ہے ؟

میں اس کا سبب یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے خانقاہوں کا Institution ختم کر دیا شاید اس لیے کہ وہاں "خرچ" ہوتا تھا۔ "درگاہوں" کا باقی رکھے ہوئے ہیں، اس لیے کہ یہاں "آمدنی" ہوتی ہے۔ لہٰذا جب "طلبِ خیر محض" کے تصور کی جڑ ہی کاٹ دی تو اس کا نمونہ کہاں سے دیکھیں گے ؟

خانقاہیں اور جماعت خانے کیوں ختم ہوئے ؟ اس کا جواب دینا آسان نہیں منطق کی ایک اصطلاح "دَور" لازم آنا بھی ہے جب علت اور معلول دونوں میں تَفاعُل Inter-action شروع ہو جاتا ہے یعنی جو علّت ہے وہی معلول بھی ہے اور جو معلول ہے وہی علت بھی ہے۔ خانقاہوں کا وجود بھی اسی "دَور"

کا شکار ہوگیا ہے۔ یعنی علم کے زوال سے خانقاہوں کا انحطاط ہوا، اور خانقاہوں کے انحطاط سے علم کا زوال ہوا علم تو مدرسوں میں واپس چلا گیا جہاں سے وہ آیا تھا۔ خانقاہوں میں جو مادّی منفعت کا پہلو تھا یعنی "فتوح" اور "نذرانے" وہ جماعت خانے کے درویشوں پر خرچ ہوتا تھا اور اس سے مسکینوں کو ان کا "حقِ معلوم" ملتا تھا۔ وہ منفعت ہم نے درگاہوں میں منتقل کر دی اور اسے اپنے لیے زیادہ اچھا سمجھا، حتیٰ کہ علم کی قربانی کی قیمت پر اسے گوارا کر لیا، اس لیے کہ خانقاہ میں وہ دولت فتوح کے نام پر آتی تو ہمارے ہاتھوں سے دوسروں پر خرچ ہو جاتی، اب وہی درگاہوں میں نیاز کے نام سے آئے، تو دوسروں کے ہاتھوں سے ہم پر خرچ ہو رہی ہے۔ رہا "علم" تو وہ ایسا کچھ ضروری نہیں ہے کیونکہ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اکثر "بے علم" لوگ زیادہ عافیت سے رہتے ہیں! اہل علم تو یہی فریاد کرتے رہتے ہیں کہ:

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی مارا خراب کردی و خود مُبتلا شدی

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ زندگی میں ناکامیوں کے مارے ہوئے Frustrated شکست خوردہ اور پست حوصلہ لوگ تصوف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ میر جعفر زٹلی نے بھی اپنے ال نامہ میں تصوف کی تعریف یہ لکھی ہے کہ "المفلس۔ کانِ تصوّف" لیکن تاریخی شواہد اس کے بالکل خلاف ہیں۔ تصوّف عہدِ خلافتِ راشدہ میں بھی موجود تھا جس کی مثال ابوذر غفاری اور سعید بن المسیّب کی شخصیت میں ملتی ہے، پھر عہد بنی اُمیّہ میں بھی ایسے صحابہ اور تابعین موجود تھے جو حکومت وقت کے مظالم کے خلاف اخلاقی سطح پر جنگ کر رہے تھے۔ اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ شان و شوکت اور عیش و تنعّم کا زمانہ خلافت عباسیہ کا ہے۔ اور اس دور میں کیسے کیسے کبار صوفیا پیدا ہوئے ہیں ان کے نام بھی گنانا مشکل ہے۔ ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء، اور عبد الرحمٰن السلمی کی طبقات الصوفیہ، ایسے بزرگوں کے حالات سے بھری پڑی ہیں۔ یہ زمانہ افلاس اور شکست خوردگی کا نہیں تھا۔ ہر طرح کی دنیوی کامیابی اور عیش و عشرت کی فراوانی کا زمانہ تھا۔ اور اسی زمانہ میں اسلامی تصوف اپنے برگ و بار لایا۔ بعد کے زمانے میں جو کچھ ہے سب اسی کی خوشہ چینی ہے۔ منگولوں کے حملے اور بغداد کی تباہی سے تصوف کا رشتہ جوڑنا کوئی بہت زیادہ منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ خراسان و بلخ اور وسطی ایشیا میں آکر تصوف میں کچھ آمیزش مشرقی مذاہب کے طرز فکر اور اعمال ریاضات کی ضرور ہوئی ہے اور یہاں سے تصوّف میں "درون بینی" زیادہ ہو گئی۔

اس مختصر سے پس منظر کے ساتھ مجھے یہ کہنا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تصوّف وہی

"طلبِ خیرِ محض" اور "طلبِ وجہِ رب" تھا، عہدِ بنی امیہ میں یہ ظلم کے خلاف ایک احتجاج تھا اور عہدِ بنی عباس میں یہ عیش و عشرت اور فسق و فجور سے بھری ہوئی زندگی کا ردِّعمل تھا۔ یہ دونوں نظریے عبّاسی شعراء میں ابوالعتاہیہ اور ابونواس کی شاعری میں واضح ہوکر سامنے آگئے ہیں۔ اگر تصوف افلاس اور شکست خوردگی کا ردِّعمل ہوتا تو اسے کب اور کہاں فروغ مل سکتا تھا، یہ اندازہ کرنا دشوار ہے۔

غرض یہ ہے کہ آج کی زندگی بھی ظلم سے اسی طرح بھری ہوئی ہے اور آج عیش و عشرت کے اسباب پچھلے ہر زمانے سے زیادہ، اور ہر جگہ، اور ہر شخص کو میسّر ہیں۔ حتیٰ کہ آج کا انسان "زُہد" کے مفہوم سے ہی ناآشنا ہوگیا ہے اور سوسائٹی میں ہر سطح پر ایک خاص انداز کی شقاوت اور قساوت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ انسانیت کو کہاں لے جائے گی اس کا بھی اندازہ لگانا کچھ دشوار نہ ہونا چاہیے۔ آج ایسے زبردست مہلک ہتھیار دنیا کے ہر خوبصورت علاقے کا نشانہ باندھے ہوئے بیٹھے ہیں کہ صرف ایک بٹن دبانے سے دنیا زیر و زبر ہوسکتی ہے۔ اسلحہ کی مسابقت بڑھتی جارہی ہے اور اب اسے بھی صرف دلوں کی دنیا کو بدلنے سے روکنا ممکن ہے۔ دلوں میں وہ انقلاب تصوّف پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے آج کی مغربی دنیا اور سائنسی تہذیب ہم سب سے زیادہ تصوّف کی محتاج ہے یعنی اسے "خیرِ محض" کی طلب کی طرف بلایا جائے اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہ صدا دی جائے۔

نئے زمانے میں خانقاہوں کا روپ بھی نیا ہوگا، صوفی بھی "ماڈرن" ہوں گے اور مجاہدے بھی میکانکی ہوسکتے ہیں۔ تجدّد اور تبدیلی ہر سطح پر ہر حال میں مبارک ہے اگر اصل کی روح مسخ نہ ہو اور مقصود کا حصول آسان تر ہوجائے۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ایک فعّال صوفی تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سخت مشقّت و ریاضت میں گذاری۔ دنیا کی دولت نے بھی ان کے قدم چومے مگر انھوں نے اس سے کبھی دل نہیں لگایا، جو کچھ آیا وہ اپنے نیک مقاصد کی تکمیل میں انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ وہ اپنے مریدوں کو پہلی تعلیم یہی دیتے تھے کہ وہ سخت محنت کریں اور زیادہ سے زیادہ کمائیں اور خوشحال رہنے کی کوشش کریں۔ اس سے انھیں "اکلِ حلال" کی عادت پڑے گی اور تنگ دستی انھیں تصوف سے بددل نہیں کرے گی۔ وہ فرماتے تھے کہ ہر پیر کا مرید کسی خصوصیت سے پہچانا جاتا ہے۔ جو میرا مرید ہوگا اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ فارغ البال و مرفۃ الحال ہوگا۔

خواجہ صاحبؒ اوّل و آخر صوفی تھے۔ یوں تو وہ بہت کچھ تھے لیکن اگر انھیں یہ اختیار دیا جاتا کہ وہ اپنے لیے

کسی ایک حالت کو پسند کرلیں اور باقی کو ترک کردیں تو وہ صوفی بن کر ہی رہنا اختیار کرتے اور سب کچھ تج دیتے۔ اس لیے کہ تصوف کی دنیا میں ان کے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ یہ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی ان کے خوابوں کی تعبیر ہی تو ہے۔ یہ وہ خواب ہیں جنھیں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے ساٹھ ستّر سال تک مادّی صورت دینے کی جدوجہد کی اور انھیں اس کام میں کامیابی بھی ہوئی۔ حلقہ نظام المشائخ کا قیام، رسالہ نظام المشائخ اور صوفی اور منادی کا اجرا، خانقاہوں کو زندہ کرنے کی کوشش، سلسلۂ نظامیہ کو حیات تازہ بخشنے کا ولولہ اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ باہر کی دنیا تک حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے روحانی پیغام کو عام اور شائع کرنے کی تڑپ نے زندگی بھر خواجہ صاحبؒ کو مصروف و منہمک رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے پناہ عزم و قوت رکھنے والا ایک شخص 'قاعدۂ آسمان' تک بدل دینا چاہتا ہے۔ نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں خواہ تجربہ کی سطح پر ہی سہی، وہ پرکھتا ہے۔ اور اپنے اطراف کی دنیا میں ہر شخص کی صلاحیت کو اس خیر محض کی طلب کے راستے میں لگا دینا چاہتا ہے۔ یہ سوسائٹی خواجہ صاحبؒ کے عزائم ہی کا آئینہ ہے جس نے درگاہوں میں ایک نیا شعور پیدا کر دیا ہے اور علمی مذاکروں سے آگے بڑھ کر یہ فائدہ ان شاء اللہ بنیادی اصلاح و تجدّد اور فکر و تامّل تک پہنچے گا۔ تخم ریزی کے بعد برگ و بار آنے میں بہت کچھ وقت اور صبر درکار ہوتا ہے۔ نتائج برآمد ہوں گے اور ان کا فائدہ بھی تمام عالم بشریت کو پہنچے گا۔ آج مغربی دنیا میں تصوف کے مطالعے کا نظری سطح پر رواج زیادہ ہوگیا ہے مگر ہماری خواہش ہے کہ باہر کی دنیا کو اس کے اعمال و اشغال سے بھی واقفیت حاصل ہو۔ اس کے لیے ایک جدید خانقاہ Centre for Sufi Studies قائم کرنے کا منصوبہ بہت زمانے سے سوسائٹی کے زیر غور ہے اور مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی مدظلہٗ اس سال اپنے سفر امریکہ سے بخیر و عافیت واپس تشریف لائیں گے تو اس منصوبہ کو بھی آپ عملی شکل میں دیکھ سکیں گے۔

مجھے اس عالم غربت میں یہ بھی اندازہ نہیں کہ آج کے جلسے میں مضامین و مقالات اور تقریروں کی مقدار کیا ہے اور مجھے کتنا وقت مل سکتا ہے، اس لیے اگر میں نے آپ کی توقع سے زیادہ سمع خراشی کی ہے تو معذرت خواہ ہوں۔

یہ تصوف اور صوفیا کے ذکر و فکر کی محفل ہے جہاں روحانی رابطہ مادی رشتوں پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ میں بھی جسمانی طور پر اس جلسہ سے غیر حاضر سہی لیکن روحانی طور پر الحمدللہ سو فیصدی موجود ہوں۔

[خواجہ حسن نظامی سیمینار کے لیے کالی کٹ کیرالا سے لکھ کر بھیجا گیا، ۱۹۸۰ء]

# حضرت گیسو درازؒ کا نظریۂ توحید

'توحید' اسلام کی بنیاد ہے، اور اس پر ہمارے علما اور فلاسفہ نے ایسی دیدہ ریزی سے موشگافیاں کی ہیں کہ اُن کا سرسری جائزہ لینا بہت دشوار ہے۔ اِس کا دامن ایک طرف عقیدے سے بندھا ہوا ہے جس کی بنیاد وحیِ الٰہی اور پیغامِ رسالت پر ہے، جہاں عقل کو صرف ایک خاص حد تک جانے کی اجازت ہے۔ دوسری طرف یہ فلسفے کا ایک نہایت دقیق موضوع ہے جس کے اپنے مقدمات و نتائج ہیں اور جہاں عقل اپنے "پائے چوبین" سے بار یاب تو ہوتی ہے مگر اُس کی دلیلیں خود ہی ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں اور بحث اگرچہ بہت طویل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے مگر نتیجہ کچھ بر آمد نہیں ہوتا، بقول اکبرؔ:

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا؟

اس کا تیسرا پہلو وجدانی ہے، جسے آپ کشفی یا روحانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کشف کا تعلق نہ فلسفے سے ہے، نہ منطق سے۔ لیکن صوفیا میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، امام الغزالیؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ جیسے کتنے ہی بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے بعض مباحث کی بنیاد اپنے مکشوفات پر رکھی ہے۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو ہم مکشوفات کو جھٹلائیں یا ان کی تصدیق کریں۔ پہلی صورت میں، ہم صرف فلسفے سے استشہاد کر سکتے ہیں جس سے عقیدے کو کچھ زیادہ سروکار نہیں، دوسری صورت میں بحث کی گنجایش ہی نہیں۔ وجدان سے دلیل لینا قرآن سے بھی ثابت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے

قصّے میں یعقوب علیہ السلام کا قول موجود ہے : اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنَ ○ (سورہ یوسف، آیت ۹۴) اور خضر و موسیٰ کے قصّے میں حضرت خضر کی ساری دلیلیں کشفی و وجدانی ہیں۔ لہٰذا کشف کو ماننا تو پڑے گا مگر میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ ہم مختلف حضرات کے مکشوفات پر محاکمہ کس طرح کریں گے اور یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ابنِ عربیؒ کو جو کشف ہوا وہ غلط تھا اور شیخ سرہندیؒ پر جو مکشوف ہوا وہ صحیح تھا۔ آخر میں یہ بحث فلسفے میں ہی محصور ہو جاتی ہے لیکن ہمارے علما نے اس کو فلسفے کی جال سے نکالنے کے لیے ایک اور کارگر ترکیب استعمال کی اور ان مباحث کے لیے باقاعدہ ایک فن وضع کر لیا جسے "علم الکلام" کہا گیا۔ اس میں اور فلسفے میں یہی فرق ہے کہ وہاں 'عقیدہ' بے دخل کر دیا جاتا ہے اور یہاں وہ نافذ العمل رہتا ہے۔

اس لیے نظریۂ توحید پر جو بحث ہوگی وہ علم الکلام کے دائرے میں آتی ہے۔ توحید کو امام ابو حنیفہؒ نے "الفقہ الاکبر" کہا ہے کیوں کہ یہ تمام اسلامی عقائد کی اصل الاُصول اور لُبِّ لباب ہے۔ کُنہِ توحید تک رسائی کے ۲ دو ممکنہ ذرائع ہیں: ایک علم و نظر کا وسیلہ، دوسرا مشاہدہ و عرفان کا ذریعہ ہے۔ مشاہدہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے: ایک وہ جو دلائلِ عقلیہ و نقلیہ پر مبنی ہو، دوسرا عینی درجہ کشف و وجدان کا ہے۔ اسلام کی طرح توحید کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ ظاہر پر ہم گفتگو کر سکتے ہیں اور حکم لگا سکتے ہیں لیکن اس کے باطن تک رسائی اہلِ دل اور اولیاء اللہ ہی کو ہوتی ہے۔ بعض پر توحید کی حقیقت اس طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ پھر وہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتے۔

| | |
|---|---|
| اسرارِ خدا را نہ تو دانی و نہ من | این حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من |
| ہست از پسِ پردہ گفتگوے من و تو | چوں پردہ بیفتد نہ تو مانی و نہ من |

توحید یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی ایک احدیت ہے جس کے اعتبار سے وہی موجودِ مطلق ہے، وہی واجب الوجود ہے، وہی موجودِ حقیقی ہے، کائنات کا وجود وہمی و اعتباری ہے۔ بقول میرؔ:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اس لحاظ سے موجودِ حقیقی کی ذات اور صفات کے سوا سب ذوات و صفات ہیچ ہیں۔ ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ○ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○''

خدا کی ذات اور صفات پر بحث کا دروازہ عیسائی علما اور فلسفیوں نے کھولا۔ اس کے زیرِ اثر ایک وہ گروہ پیدا ہوا جو مُشبِّہ اور مُجسِّمہ کہلاتا ہے، یعنی خدا کے جسم اور اس کی شکل و شبیہ کا قائل ہے، اس لیے کہ قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے خدا کی جسمانیت ثابت ہوسکتی ہے، مثلاً ''ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'' یا ''وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی'' یا ''یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ'' وغیرہ۔

دوسرا فرقہ وہ ہوا جو صفات کا مُنکر ہوگیا اور توحیدِ خالص کی بنیاد ''ذاتِ بحت'' کو قرار دینے لگا۔ یہ مُعطِلہ کہلاتے ہیں یعنی خدا کو صفات سے مُعطّل (خالی) کرنے والے۔ ان میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ اسی انکارِ صفات کی وجہ سے وہ رؤیتِ حق کے بھی مُنکر ہوگئے، کیوں کہ از روے منطق رؤیت کے واسطے جسم، جہت اور لون (رنگ) ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ قرآن میں ''وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاظِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○'' موجود ہے لیکن ان کا استدلال ''لَن تَرانی'' سے رہا۔ شیعہ فرقے نے بھی یہی عقیدہ اپنا لیا اور ان کا کہنا ہے کہ ان آنکھوں سے ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ تیسرا فرقہ جو راہِ اعتدال پر گامزن ہوا اسے اصطلاح میں صفاتیہ بھی کہتے ہیں اور یہ جمہورِ مسلمین کا مسلک رہا ہے۔ اس کے پہلے علمبردار ابوالحسن الاشعری تھے۔ بعد میں ہمارے علما نے توحید کے بارہ بنیادی اصول وضع کیے جن کے گرد سارے مسائل و مباحث گھومتے ہیں یعنی:

۱۔ یہ عقیدہ کہ اجسام حادث ہیں۔

۲۔ اس عالم کا ایک ہی خالق ہے اور وہ اللہ ہے۔

۳۔ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریکِ اُلوہیت نہیں۔

۴۔ اُس کا کسی طرح کوئی مثل و مشابہ بھی نہیں

۵۔ اُس کی رویت ممکن ہے / یا نہیں۔
۶۔ اُس کی صفات ذات سے خارج ہیں / یا نہیں۔
۷۔ انسان کے افعال کا خالق کون ہے؟ (عقیدہ جبر و اختیار)
۸۔ اللہ ظلم و شر کا وجود چاہتا ہے / یا نہیں۔
۹۔ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کا ایمان باقی رہتا ہے / یا نہیں
۱۰۔ نبوّت کے عمومی دلائل۔
۱۱۔ رسالۃ محمّدیہ کے خصوصی دلائل۔
۱۲۔ مسئلۂ امامت۔

یہ بنیادی مباحث ہیں جن پر سارے علم الکلام کی عمارت کھڑی ہے اور انھیں مباحث کے نتیجے میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے جن میں چھ فرقے زیادہ نمایاں ہیں:

۱۔ اہل السُنّۃ والجماعۃ ۲۔ مُشبِّہَہ ۳۔ مُعتزلہ ۴۔ مُرجِبۂ ۵۔ شیعہ ۶۔ خوارج

اہل السُنّۃ میں ابوبکر باقلّانی نے عقیدۂ توحید وغیرہ کے لیے عقلی مقدمات اور دلائل وضع کیے مگر انھوں نے اپنی دلیلوں کو منوانے پر اتنا اصرار کیا کہ فلسفہ عقیدے کا لازمی جزو بننے لگا۔ باقلّانی کا کہنا تھا کہ اگر دلیل کمزور یا باطل ہے تو مدلول بھی کمزور اور باطل مانا جائے گا۔ اس لیے عقیدے کی مضبوط دلیل فراہم کرنا بھی ضروری ہے اور اس پر اصرار کرنا بھی۔ لیکن اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ فلسفے کے چنگل میں گرفتار ہو گیا اور فلسفے کا تو یہ ہے کہ وہ پہلے دلیل ڈھونڈتا ہے، پھر اس کو پرکھتا ہے، پھر یقین کرتا ہے۔

امام غزالیؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے عقیدے کو قائم کیا اور پھر اس کے لیے فلسفیانہ دلیلیں تلاش کیں مگر اُسے استدلال کی قید سے آزاد بھی رکھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندستانی فلسفیانہ فکر میں توحید کا کیا تصوّر ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آسکے کہ وحدت الوجودی صوفیا، ویدانت سے متاثر ہیں۔ اپنشد کہتے ہیں کہ واجب الوجود ایک حقیقتِ مطلقہ و حقیقتِ اعلا ہے، اس کا کوئی شریک

نہیں، کوئی اس کے سوا "موجود" نہیں، تمام اشیا کا وجود اعتباری ہے ——
"ایکم بر ہم دویتونا ستے" لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ وَلَا موثر فی الوجودِ الّا اللّٰہ۔

اپنشدوں میں خدا کو واجب الوجود، کائنات کو ممکن الوجود اور صفاتِ خداوندی کو بالفعل ظاہر کہا گیا ہے۔ شیخ اکبر انھیں تصوّرات کو صُورِ علمیّہ و اعیانِ ثابتہ کا نام دیتے ہیں۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا کہنا ہے کہ وجود ایک نہیں ہے، دیکھنے میں ایک معلوم ہوتا ہے، یہی (وحدت شہود) ہے۔ ان کے قول کے مطابق خدا نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں تخلیق کیا ہے، جو ہمیں موجود نظر آتی ہے مگر درحقیقت موہوم ہے یعنی اس کی نمود تو ہے وجود نہیں۔ خدا اپنی ذات سے غیر متغیّر ہے۔ "الآن کما کان" کا یہی مفہوم ہے، مگر وہ اپنی صفات سے متحرّک ہے جیسا کہ "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" سے ظاہر ہے۔ ویدانت کی شرح شنکراچاریہ نے کی اور وحدت الوجود کا نظریہ شیخ اکبرؒ نے پیش کیا، مگر اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ شنکراچاریہ کی شرحیں شیخ کے ملاحظہ سے گذری ہوں، بظاہر دونوں کو غور و فکر نے ایک جیسے نتائج تک پہنچایا ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو میں شیخ اکبر کی متعدّد شرحیں لکھی گئیں اور ان کا ایسا متضاد ردِّ عمل ہوا کہ ان کے عقیدت مندوں نے اقوالِ شیخ کو قرآن و حدیث کے بعد سب سے زیادہ مستند قرار دیا اور منکروں نے ان کی تکفیر سے بھی دریغ نہیں کیا۔ دراصل یہ مباحث عوام میں لاکر بحث کرنے کے تھے ہی نہیں اور ان کا بڑا حصّہ کشفی امور پر منحصر تھا۔ شیخ اکبرؒ کے عقائد بھی بنیادی طور پر وہی ہیں جن کی تعلیم ہمیں قرآن سے ملتی ہے اور جن کی تفسیر احادیث میں آتی ہے لیکن جہاں انھوں نے اپنے مکشوفات کا بیان کیا ہے، ان کی تردید کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ یہ مکشوفات تو حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تحریروں میں بھی بکثرت بیان ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض پر علمائے امّت نے شبہات بھی وارد کیے ہیں۔

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے، وہ اپنی الوہیّت میں لاثانی ہے، مُنزّہ ہے، بذاتہ موجود ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اس لیے تمام کائنات

اُس سے موجود ہے اور حقیقی وجود کی صفت سے صرف وہی موصوف ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جھومر، ٹیکا، ہنسلی، پازیب، کنگن طرح طرح کے اور نت نئی شکلوں کے زیورات ہیں مگر ان کا اپنا وجود کچھ بھی نہیں، موہوم ہے۔ اصل وجود تو سونے کا ہے۔ جب سارے زیور کٹھالی میں ڈال کر گلا دیے جائیں گے تو سب کی شکلیں فنا ہو جائیں گی، صرف سونا باقی بچ رہے گا ـــــ "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۝ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۝" کا یہی مفہوم ہے۔ اس کا جسم نہیں، جہت بھی نہیں، نہ کوئی زمانہ اسے محدود کر سکتا ہے، نہ کسی مکان میں وہ سما سکتا ہے مگر زمان و مکاں، دنیا و آخرت سب اسی سے قائم ہیں۔ وہ اپنی صفات سے بھی قدیم ہے۔ وہ اشیا کو ان کے وجود سے پہلے بھی جانتا تھا۔ سب کچھ اس کے علم کے احاطے میں ہے اور اس کے ارادے کے متعلّق ہے اور اس کا ارادہ ازلی ہے۔ عالم بالذّات معدوم اور غیر موجود فی الخارج ہے مگر ذات خداوندی میں "موجود ذہنی" کے طور پر ثابت ہے۔

شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، تمام مخلوق کو اور تم کو اپنے نفس پر گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں توحیدِ الٰہی کا قائل ہوں اور اس پر عقیدہ رکھتا ہوں، اسی طرح میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ خلائق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ احکام رسالت مآبؐ لائے ہیں، میں ان سب پر ایمان لایا ہوں چاہے ان احکام کا مجھے علم ہو یا نہ ہو۔

شیخ اکبر کے ایمان اور عقائد کے بارے میں تو اتنا ہی جاننا سر دست کافی ہے لیکن چند باتیں ان کے فلسفے کے بارے میں یہاں بیان کر دینا ضروری ہے ـــــ وہ فرماتے ہیں کہ "وجود بالذّات" یعنی وجود حقیقی اللہ کا ہے، ماسوا کا وجود بالعرض ہے۔ اعیانِ ثابتہ اور حقائقِ کونیہ پر اسماء و صفاتِ الٰہی کی تجلّی ہوتی ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ علمِ الٰہی اور قدرتِ الٰہی کے ملنے سے ممکنات کا وجود ہوتا ہے، اس لیے اعیان و حقائق کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسے کیوں ہیں؟ نظامِ کائنات کی بنیاد جبر پر نہیں ہے استلزام پر ہے۔ شیخ اکبر فرماتے

ہیں کہ وجودِ علمی کو ثبوت اور وجودِ خارجی کو وجود کہتے ہیں لہٰذا اعیانِ ثابتہ جو معلومات حق ہیں غیر موجود فی الخارج اور معدوم ہیں۔

شیخ اکبر کا انتقال ۶۳۸ ہجری میں ہوا اور اس سے دو سال قبل ۶۳۶ھ میں فتوحات یکیہ مکمل ہوئی ہے لیکن آٹھویں صدی ہجری کے آغاز تک شیخ اکبر کی تصانیف ہندستانی صوفیا کے حلقوں میں عام نہیں ہوئی تھیں۔ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا جو مستند ذخیرہ ہمارے پاس ہے اس میں کہیں شیخ اکبر کا ذکر نہیں آتا، اگرچہ فرشتہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ وہ ہمیشہ فُصوص الحکم کو اپنے زیرِ مطالعہ رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے زمانے میں شیخ اکبر کے اکّا دکّا نسخے ہی پہنچے تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شیخ اکبرؒ کی تصانیف علمی حلقوں میں بحث و نظر کا موضوع بن چکی تھیں اور ان کی تاثیر اور نفوذ کا آغاز بھی ہوگیا تھا جس کا بڑا ثبوت ہمیں مسعود بکؒ کی زندگی اور ان کے کلامِ نظم و نثر میں ملتا ہے۔ ان کی تصنیف مرآۃ العارفین کا موضوع ہی وحدت الوجود ہے اور کتاب کے مباحث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیخ اکبرؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ حضرت مسعود بکؒ اسی سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے۔ صاحبِ گلزارِ ابرار نے ان کو حضرت چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ سے مرید بتایا ہے اور شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انھیں شیخ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مرید بتاتے ہیں جو شیخ شہاب الدین امام رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے تھے۔ موخرالذکر حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں امامت کرتے تھے اور وہیں ایک حجرے میں رہتے تھے۔ انتقال کے بعد بھی خانقاہ کے احاطے میں مدفون ہوئے تھے۔

آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شیخ اکبر کی تصانیف کی شرحیں لکھی جارہی تھیں جن میں شرحِ فصوص الحکم ممکن ہے سب سے پہلی ہو لیکن فتوحات اور فصوص کی مخالفت علمائے شرع کے حلقے میں بھی بہت شدّ و مد سے شروع ہوگئی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے تمام مشائخ بنیادی طور پر فقیہ تھے وہ باقاعدہ فقہ اور

اصولِ فقہ اور عقائد کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور علومِ دینیہ میں فقہ ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے اعمال و افعال احکامِ شرعیہ سے سرِ مو متجاوز نظر نہیں آتے، وہ طریقت کو شریعت کا تابع سمجھتے تھے۔ اسی لیے حضرت چراغ دہلیؒ نے ایک موقع پر صاف کہہ دیا:

"مسلکِ پیر حجّت نمی شود، دلیل از کتاب و سنّت می باید"۔

وحدت الوجود کے فلسفیانہ مباحث عام آدمی کے سمجھنے کے تو کبھی بھی نہ تھے، اس زمانے کے علما بھی مُعتزلہ کی مخالفت میں فلسفے سے بدگمان ہو گئے تھے اور وہ ان مباحث کو بنیادی اسلامی عقائد کا نقیض سمجھتے تھے، اس لیے وحدت الوجود کی بحثوں میں انھیں شرک کا احتمال نظر آتا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی جیسی کتابوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دُنیادار متصوفین نے عقائد کا فتنہ بھی پیدا کر دیا تھا شاید اسی لیے مسعود بکؒ کے قتل کا فتوا دیا گیا اور ان کا وہی انجام ہوا جو منصور حلاّج، عین القضاۃ ہمدانی اور بعد میں سرمد کا ہوا تھا۔

تیمور کے حملے سے پہلے کی دلّی میں جب حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ وہاں تشریف فرما تھے، ان موضوعات پر خوب بحثیں ہو رہی تھیں۔ جوامع الکلم سے پہلے کے حضرت گیسو دراز کے ملفوظات دہلی میں شیخ علاء الدین گوالیری رحمۃ اللہ علیہ نے انوار المجالس کے نام سے جمع کیے تھے، یہ بیش بہا کتاب اب نایاب ہے مگر اس کے منتفرق حصّے بعض دوسری کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی ان مجلسوں میں سیّد اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ حضرت علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور خلیفہ ہیں اور حضرت علاء الدولہ شیخ اکبرؒ کے سخت مخالف ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ حضرت گیسو دراز بھی شیخ اکبر کے بہت مخالف ہیں۔

اور ایک موقع پر تو عقیدۂ وحدت الوجود کو "شرک" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنی تصنیف اسمار الاسرار کی ۸۷ ویں سمر کو انھوں نے عقائد شیخ اکبر سے بحث کرنے

کے لیے مخصوص کیا ہے۔ وہ اپنے نظریۂ توحید کو ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں:

آنجا نہ اسم باشد نے رسم نے صفت — نے عرش نے ثریٰ نہ اشارت نہ ترجمان
جملہ یکے بود نبود از دوئی اثر — توحید بے مشارکت این جا شود عیان
این قطرۂ ز قلزم توحید بیش نیست — ناید یقین حقیقت توحید در میان

ان اشعار میں تو کوئی بات شیخ اکبر کے عقیدے سے مغایر نہیں ہے لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ اہل تصوف کو جو توحید کا ادراک ہوتا ہے وہ اگرچہ عالم باطن سے ہوتا ہے مگر شریعت کے موافق ہوتا ہے اور علمائے ظاہر اس میں نامشروع باتوں کی آمیزش کر دیتے ہیں ——— حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں:

"شیخ محی الدین اعرابی (کذا) و چند طائفہ متابعان او می گویند کہ درائے این وجودات وجود دیگر نیست .... استغفر اللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، این سخن در ایمان شرک است محی الدین عالم غیب گذاشتہ است و عالم شاہد راضی شدہ است، او قائل برین صور و اشکال است کہ تمثل و تشکل را مقصود داند، بر این حصر می کند، از ورام الورا، شعورے ندارد"۔

حضرت گیسو دراز نے یہ بھی فرمایا کہ اگر شیخ میرے زمانے میں ہوتے تو میں انھیں ان شواہد سے باز رکھتا اور ان سے زیادہ بلند مقام پر لے جاتا۔" ایمان بہ تجدید آوردے، مسلمان از سر شدے"۔ یہ صور و اشکال کی بحث خالص فلسفیانہ موضوع ہے، میں اس پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات بدیہی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نظریۂ وحدت شہود میں جو مباحث پیش کیے ہیں ان کی ابتدائی شکل حضرت گیسو دراز کے ان فرمودات میں مل جاتی ہے۔ یہ در اصل وہی "فلسفۂ خودی" ہے جسے اقبال نے رومی سے اخذ کیا اور اپنے طور پر اس کی تعبیر و تشریح کی۔ حضرت گیسو دراز کے نظریۂ توحید ہی کی نہیں سلوک و معرفت کی بنیاد بھی "عشق" پر ہے، اس لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب تک عاشق ہے دوئی باقی ہے، عاشق و معشوق کا وصال ایسا ہوگا جیسے ہم گوند لگا کر دو کاغذوں کو باہم

پیوست کر دیں جو دیکھنے میں ایک ہو جائیں گے مگر عقلی طور پر ان میں دوئی باقی رہے گی۔

وہ فرماتے ہیں کہ شیخ محی الدین صاحبِ فصوص لکھتے ہیں کہ منصور حلاّج کو تجلّیِ ذاتی ہوئی تھی، اگر تجلّیِ ذاتی ہوتی تو وہ ہرگز "انا الحق" نہ کہتا کیوں کہ جو تجلّیِ ذات میں محو ہو گیا اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں۔ تجلّیِ ذات میں کلام نہیں بلکہ تجلّیِ صفات میں کلام ہے، کیوں کہ تجلّیِ ذات مقامِ فردانیت ہے، جو اس مقام کو پالے گا وہ اپنی خودی کو چھوڑ دے گا اور دونوں ایک ہو جائیں گے اور اس سُکرِ وصال سے باہر نہیں آئیں گے۔ یہ اخصّ خواص کا حال ہے اور یہ تجلّیِ ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھی دوسروں کے لیے نہیں ہے۔

بہرحال یہ صرف چند مباحث کا ایک سرسری جائزہ ہے اور اس سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفہ وحدتِ شہود اور فلسفۂ خودی کی بنیاد، ہم حضرت گیسو دراز رح کی تحریروں میں تلاش کر سکتے ہیں۔

[۱۹۸۲ء۔ درگاہ حضرت گیسو دراز رح گلبرگہ میں پڑھا گیا]

# ہماری ثقافت اور صوفیا

صوفیاے کرام کے بارے میں عام تصوّر یہ ہے کہ وہ دُنیا اور اسبابِ دنیا کو ترک کر کے توکّل اور گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ نہ انھیں دُنیا والوں کے طمطراق سے کوئی سروکار رہتا ہے اور نہ زندگی کی چند روزہ لذّتیں انھیں رِجھاتی ہیں۔ ان کا مقصود صرف خدا کی طلب ہوتی ہے اور طلبِ صادق ایک وقت میں ایک ہی شے کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے خدا کی سچّی محبت پیدا ہوتی ہے تو دوسری تمام محبّتیں خود ہی دِل سے نکل جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں صوفیا کا کوئی اثر نہیں ملنا چاہیے کیوں کہ مظاہرِ زندگی کو وہی لوگ متاثر کر سکتے ہیں جو زندگی میں عملی حصّہ لیں، اس سے دِل چسپی رکھیں اور اسے اہمیت دیں۔ صوفیا کا تصوّرِ حیات و کائنات یہ ہے کہ زندگی فانی اور چند روزہ اور محض وہم و اعتبار ہے۔ گوشہ نشینی اور خلقِ خدا سے میل جول کم رکھنا ان کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو ہے۔

اس کے باوجود اگر ہم اپنے مُلک کی پچھلی سات آٹھ سو برس کی معاشرتی اور ثقافتی تاریخ کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ اس میں صوفیاے کرام کی تعلیمات کا کتنا اور کیسا اثر پایا جاتا ہے اور تمدّن و ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر ان کی چھاپ کہاں تک ملتی ہے تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ یہ اثرات بہت گہرے، بہت دیرپا اور دُور رس ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی فکر کو، ہماری عقلیت اور ثقافت کو ان صوفیا نے جتنا متاثر کیا ہے اتنا کسی دوسرے گروہ نے نہیں کیا۔ اس کے اسباب پر غور کرنے سے بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔ لیکن دو نکتے

بنیادی اہمیت کے ہیں: ایک تو یہ کہ ہندستانی فکر و فلسفے میں "روحانیت" کو ہمیشہ اعلا مقام حاصل رہا ہے اور قدیم زمانے سے ہندستانی فلاسفہ نے حیات و کائنات کی فلسفیانہ تعبیر و تشریح میں بہت جگر کاوی کی ہے۔ اس لیے یہاں کی سرزمین میں اسی تحریک کا پودا برگ و بار لا سکتا ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہو۔ صوفیاے کرام بھی اسی لیے یہاں اپنی تعلیمات کو مقبول بنا سکے کہ ہندستان کے باشندوں کا رُجحان روحانیت اور ماورائیت کی طرف پہلے سے موجود تھا اور وہ آج کی مادّی ترقّیوں کے زمانے میں بھی دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب جس نے صوفیاے کرام کی تحریک کو مقبول اور ہر دل عزیز بنایا اور جس کی وجہ سے ہماری معاشرت و ثقافت نے ان کا گہرا اثر قبول کیا، یہ تھا کہ ہندستان صدیوں تک جاگیرداری نظام کے بندھنوں میں جکڑا رہا، جس کے باعث یہاں اقتصادی نابرابری ہر دَور میں نمایاں طور پر باقی رہی۔ اس وقت کے ہندستانی سماج میں متوسّط طبقہ برائے نام تھا۔ پوری سوسائٹی دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی یعنی بہت امیر یا بہت غریب۔ امرا نے معاشرت کے تمام وسائل پر اپنا قبضہ کر رکھا تھا اور انھیں عام آدمی کے حالات و مسائل سے صرف اتنا ہی سروکار تھا جتنا وہ ان کے اپنے مفاد میں ہو سکتا تھا۔ ایک عام آدمی جو غریب یا محنت کش ہو، یا ایک ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ انسان اپنے دِل کا درد خدا سے تو کہہ سکتا تھا خداوند سے نہیں۔ جاگیرداری نظام میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایک غریب اور بے حیثیت انسان کسی نواب یا راجا یا بادشاہ کی محفل میں بیٹھ کر اسے اپنا دُکھڑا اس طرح سُنا سکے گا جس سے اس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

لیکن صوفیاے کرام جنھوں نے دِلوں کی دُنیا میں اپنی روحانی حکومت قائم کر رکھی تھی، وہ خود کو عوام اور مساکین کے طبقے ہی سے متعلّق سمجھتے تھے اور ان کے تمام مسائل سے براہ راست اور سچّی دِل چسپی لیتے تھے۔ ان کی خانقاہوں میں جو غریب، نادار، مصیبت زدہ اور مظلوم انسان آتے تھے انھیں ڈھارس بندھتی تھی اور ان کے زخموں کا مرہم ملتا تھا۔ اس لیے عوام پر صوفیاے کرام کا اثر ان امرا اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھا اور اسی لیے معاشرت اور ثقافت کے وہ

تمام پہلو جو عوامی اشتراک کا مظہر ہوتے ہیں، ان میں صوفیا کی تحریک کا اثر و نفوذ پایا جاتا ہے۔

ثقافت کے مظاہر بے شمار ہیں۔ اسے انگریزی میں کہہ لیجیے۔۔یعنی چلتی پھرتی عوامی زندگی۔ ان مظاہر میں کچھ قوتیں پوشیدہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور ان کے اثرات بھی کہیں کے کہیں جا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ادب اور زبان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ثقافت کی صحیح اور سچی، صاف اور بے داغ تصویر نظر آتی ہے۔

ہندستان میں ساتویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے آخر تک سات سو سال میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اس پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اکثریت ایسے لکھنے والوں کی ہے جو خود صوفی ہیں یا صوفیا کی تحریک سے وابستہ ہیں یا اس سے متاثر ہیں۔ اسی طرح اردو ادب میں نظم و نثر کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں وہ بھی صوفیاے کرام کی خانقاہوں میں ڈھالے گئے ہیں۔ قدیم کتب ملفوظات کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کا کینڈا انھی بزرگوں نے بنایا ہے اور اس زبان میں جو تاثیر اور گھلاوٹ ہے وہ صوفیا کی عوام دوستی ہی کا پرتو ہے۔ اسی طرح ہندی ساہتیہ میں "بھگتی تحریک" جس کے اثر سے کتنے ہی اعلا درجے کے شاعر اور مصنّف پیدا ہوئے اور انھوں نے ہندی شاعری میں لازوال ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ بھگتی بھی یہی تصوّف ہے۔ آج ہندی ادب کی تاریخ میں صوفی کاویہ کا ایک بھرپور باب ہے۔ ہندی اردو پر ہی کیا موقوف ہے۔ آپ دکنی زبان کے قدیم لٹریچر کا مطالعہ کیجیے تو دیکھیں گے کہ قدیم دکنی کے مصنّفوں میں ۹۰ فی صد صوفیا ہیں۔ اسی طرح بنگالی، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی زبانوں میں صوفیا نے بہترین ادبی ورثہ یادگار چھوڑا ہے۔ پنجابی ہی میں دیکھیے۔ گرنتھ صاحب میں حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے دوہے اور اشلوک موجود ہیں۔ حاجی نوشہ گنج بخش قادری دسویں صدی ہجری کے صوفی بزرگ ہیں۔ ان کا کلام گنج شریف حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ میر وارث شاہ یا بلّھے شاہ کا کلام یا حضرت غلام فرید کی کافیاں —— غرض پنجابی زبان سے آپ صوفیا کا کلام نکال لیجیے پھر دیکھیے کیا بچتا ہے؟

اس کے علاوہ بھی فارسی، اُردو، ہندی، پنجابی، بنگالی، دکنی، مراٹھی، گجراتی شاعری

ہیں کتنی ہی تلمیحات، رموز وکنایات، شعری علامتیں اور تمثیلیں وہ ہیں جو صوفیاے کرام ہی کی دَین ہیں۔ بعض شاعروں کے کلام میں تصوّف کو بُنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً خواجہ میر درؔد کے کلام میں تصوّف کا رنگ اور تناسب دیکھ لیجیے۔

ان صوفیاے کرام نے مقامی زبان وادب اور لوک روایتوں کی ہر دور میں سرپرستی کی ہے اور اسے فروغ دیا ہے۔ لوک ساہتیہ میں صوفیا کی خدمات کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ادب و شاعری کے بعد ثقافت کا دوسرا اہم مظہر موسیقی ہے۔ بہت سے صوفیاے کرام خصوصاً چشتی سلسلے کے بزرگوں کے بارے میں، ہمیں معلوم ہے کہ وہ موسیقی سے واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کو پوربی راگ بہت پسند تھا اور فرماتے تھے کہ:

"ما پیر شدیم و پوربی پیر نہ شد" یعنی ہم بوڑھے ہوگئے مگر پوربی سدا جواں ہے۔

بعض قدیم کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً دو سو قوّال حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمۃ کی خانقاہ سے پرورش پاتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہیتے مرید حضرت امیر خسروؒ کو آج بھی سارے موسیقار اپنا استادِ اوّل مانتے ہیں اور بہت سے سازوں اور راگوں کا ایجاد ان سے منسوب کرتے ہیں۔ موسیقی میں قول، قلبانہ، ترانہ اور خیال صوفیا کی خانقاہوں میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ "قول" کے موجد حضرت امیر خسرو بتائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ "جکری" بھی خالص صوفیاے کرام کی یادگار ہے۔ یہ "ذِکر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس میں کسی دوہے کی بندش اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کی تکرار میں ذکر کی کیفیت اور حظّ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ ایک بار تمام دن اس 'جکری' کا ورد کرتے رہے اور آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی:

"بُنیا بن. بھاجے کیسا سُکھ سے بھاسُوں"

یعنی عالمِ جذب وحیرت میں جس کی زبان بند ہوگئی وہ کیسا سُکھ سے ہو جاتا ہے۔

سماع یا قوّالی کے بارے میں تو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس کا وجود، ارتقا اور قبولیت سب کچھ صوفیاے کرام کی خانقاہوں کے طفیل میں ہے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

کا وصال محفلِ سماع ہی میں ہوا تھا۔ وہ حضرت احمد جام کا یہ شعر تین دن تک مسلسل سنتے رہے:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر ست

اور اسی عالم میں انتقال فرمایا۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں تاریخ اور تذکرہ و سیر کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

حضرت برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خواجہ حمّاد کاشانیؒ بھی ۷۶۱ ہجری کو ایک محفلِ سماع میں تمام رات اس شعر پر وجد کرتے رہے:

اے اجل آن قدرے صبر کُن امروز کہ من
لذّتے گیرم ازان زخم کہ بر جانم زد

اور اسی حالت میں انتقال فرما گئے۔ ان کا مزار گلبرگہ کے قریب سکر بھکر نامی قصبے میں ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی عوامی رسمیں اور تہوار خواہ صوفیا نے ایجاد نہ کیے ہوں لیکن ان کے سبب سے عوام نے پیدا کر لیے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں بسنت کا تہوار منایا جاتا ہے جس میں قوّال حضرت امیر خسرو کا ہندی اور فارسی کلام پڑھتے ہیں۔ اسی طرح "پھول والوں کی سیر" جو آخر عہدِ مغلیہ میں شروع ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مرزا جہانگیر کی والدہ نے قطب صاحب کے مزار پر منّت کی چادر اور پھولوں کا پنکھا پیش کیا تھا۔ ایسی رسمیں، تہذیبی مظاہرے ہندستان کے تقریباً ہر اُس شہر، قصبے بلکہ دیہات میں بھی نظر آئیں گے جہاں صوفیاے کرام کی تحریک کا اثر پہنچا ہوگا۔

اس کے علاوہ سب سے آخر میں عرس کا تذکرہ کروں گا۔ یہ بھی ہماری ثقافت میں صوفیا کی دین ہے۔ "عرس" عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی "شادی" کے ہیں۔ صوفیا کے دُنیا سے انتقال کرنے کی تاریخ کو رنج و ملال کا نہیں بلکہ شادی اور خوشی کا محل سمجھا جاتا ہے کہ انھیں اپنے مطلوب حقیقی یعنی خداے واحد کا وصال اس روز نصیب ہوا اور اس زندگی کے ظاہری حجابات درمیان سے اٹھ گئے۔ اس کا تجزیہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کیجیے تو خود موت کا کیسا شیریں اور خوش گوار تصوّر ہے۔

ہندستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں کسی نہ کسی بزرگ کا عرس ہوتا ہے۔ اس وقت یہ بات ذہن سے نکال دیجیے کہ ان مراسم میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کا ایک بہت با اثر اور قوی مظہر بن چکے ہیں۔ اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز علیہ الرحمۃ کے آستانۂ مبارک پر ہر سال عرس میں دس بارہ لاکھ انسانوں کا مجمع ہوتا ہے اور ہزاروں من کھانا فقرا و مساکین کو تقسیم ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ گلبرگہ میں واقع ہے۔ اسے جنوبی ہند میں وہی اہمیت حاصل ہے جو شمالی ہند میں اجمیر شریف کو حاصل ہے۔

رُڑکی کے پاس کلیر ایک چھوٹا سا گانو ہے مگر حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں ہندستان کے کونے کونے سے لاکھوں عقیدت مند کھنچے چلے آتے ہیں اور چند روز کے لیے وہ گاؤں ایک پورا شہر بن جاتا ہے۔

عرس کی رسمیں ہر جگہ مختلف ہوتی ہیں اور ان میں زیادہ تر روایت کی پابندی کی جاتی ہے لیکن دو چیزیں سب جگہ مشترک ہیں یعنی ذکر و عبادت، اور لنگر ——— قوّالی بعض خانقاہوں میں نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ صوفیاے کرام نے چوں کہ عوام سے اپنا رشتہ مضبوطی سے جوڑا تھا۔ وہ رشتہ آج تک استوار ہے اور ان کی درگاہوں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے عوامی ثقافت کے مظاہر کے طور پر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان مراسم نے بھی ہماری تہذیب میں رنگ بھرا ہے اور اسے زندگی کی چہل پہل عطا کی ہے۔ عوامی کلچر اور عوامی تہذیب کا اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ آپ کو مطالعہ کرنا ہو تو وہ آج بھی کسی بڑی درگاہ کے عرس میں جا کر ہی ہو سکتا ہے۔

[اُردو مجلس آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر ہوا]